آپریشن ناتمام

عقیل یوسف زئی

نگارشات پبلشرز
24- مزنگ روڈ، لاہور۔ فون 042-37322892 فیکس 042-37354205
e-mail:nigarshat@yahoo.com
www.nigarshatpublishers.com

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: آپریشن ناتمام
مصنف: عقیل یوسف زئی
ناشر: آصف جاوید
برائے: نگارشات پبلشرز، 24۔مزنگ روڈ، لاہور
PH:0092-42-37322892 FAX:37354205
مطبع: حاجی حنیف پرنٹر، لاہور
کمپوزنگ: عبدالستار 0333-4900629
سال اشاعت: 2010ء
قیمت: -/350 روپے

انتساب

وادیٔ سوات کے معصوم فرشتوں

ملالہ یوسف زئی، مشال خان اور ابدال خان

کے نام

جو طویل عرصہ تک اپنے گھر دیکھنے سے محروم رہ کر بھی

امن اور محبت کی وکالت کرتے رہے

Originally Scanned By:
PakSociety.com

Compiled & Re-arranged By:
Kitaboona.blogspot.com
Khan Shaheed Library:
facebook.com/groups/khanshaheedlibrary

فہرست

حرف آغاز 7

- ہے دوسروں کی آگ مرے گھر لگی ہوئی 9
- راہِ راست سے راہِ نجات کی طرف 15
- کچھ اس کتاب کے بارے 19
- آپریشن راہِ راست اور اس کی کامیابی کے اسباب 27
- راہِ راست کے بعد سوات کی صورتحال 37
- فضل اللہ پاک فوج سے مخاطب 45
- فورسز پر ماورائے قانون ہلاکتوں کے الزامات 51
- ترقی کے حوالے سے پاک افغان تقابلی جائزہ 56
- نئے صوبوں کا مطالبہ اور فاٹا کا مستقبل 65
- امریکی خفیہ اداروں کا پاکستان پر حملہ 71
- قبائلی علاقوں کا تاریخی پس منظر 79
- وزیرستان کا تاریخی، عسکری پس منظر 90
- فاٹا اصلاحات میں عجلت کا مظاہرہ 97
- قبائلی وزراء اور ممبران اسمبلی طالبان کے ہاتھوں یرغمال 103
- بیت اللہ محسود کی ہلاکت اور نئی قیادت 107
- خطرناک مقدمہ کمزور وکیل 113
- دہشت گردی اور اقتصادی بدحالی 120
- جی ایچ کیو پر حملہ سے صف بندی کی ابتداء 127
- پنجابی طالبان اور ان کی تنظیمیں 134

● القاعدہ اور افغانی طالبان کی پاکستان دشمنی 142
● طالبانائزیشن پر سیاسی پارٹیوں کا ابہام 149
● تین سال میں 185 خودکش حملے 157
● پس پردہ جہادی قوتیں 164
● اے مرے پشاور 174
● عالمی قوتوں کا مشکوک کردار 184
● القاعدہ اور طالبان 191
● گڈ اور بیڈ طالبان 201
● جب زندہ لوگ موت کی دُعا مانگنے لگے..... 209
● بے نظیر بھٹو کا قتل اور اس کے ذمہ دار 215
● فاٹا کی صورتحال اور آپریشن ناتمام کے بارے میں مختلف طبقہ ہائے فکر کی رائے 222
● محمود اچکزئی سے ایک مکالمہ 229
● دہشت گرد فاٹا میں روکے جاتے تو آج پاکستان کی سلامتی خطرے سے 236
دوچار نہ ہوتی: اسفند یار ولی
● دہشت گرد ہتھیار ڈال دیں یا 242
● مرنے کیلئے تیار ہو جائیں: اطہر عباس 242
● کیا پشتون واقعی انتہا پسند ہیں؟ 250
● کوئٹہ شوریٰ، حقیقت یا افسانہ 262
● 2010ء اور دہشت گردی کی جنگ 271
● آپریشن ناتمام 280
● اہم حوالہ جات 288

☆☆☆☆☆☆☆

حرفِ آغاز

زیرِ نظر کاوش میں سوات آپریشن کے بعد رونما ہونے والے واقعات، سانحات اور تبدیلیوں کو اُجاگر کرنے کے علاوہ متعدد ایشوز پر ایک الگ مگر حقیقت پسندانہ نظریے اور تجزیے کی بنیاد پر ٹھوس معلومات اور حقائق کے تناظر میں یہ جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر سال 9-2008ء پاکستانی تاریخ کے بدترین اور خوفناک سال ثابت ہوئے ہیں تو اس کے اسباب کیا تھے اور ماضی کی غلطیوں کی تلافی کس طرح ممکن ہے؟ اہم واقعات کی تفصیلات کے علاوہ اس امر پر توجہ دی گئی ہے کہ فیصلوں اور مشکلات کی وجوہات بیان کرنے کے بعد ملک اور خطے کو درپیش سنگین خطرات سے نمٹنے کے لیے ماہرین کی آراء پر مشتمل تجاویز کو بھی شاملِ اشاعت کیا جا سکے۔ ان سوالات کے جوابات ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے پاکستانی حکمرانوں، ریاستی اداروں اور مقتدر قوتوں کی پالیسیاں کس طرف جا رہی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آیا پاکستانی ادارے واقعتاً انتہا پسندی یا دہشت گردی کا خاتمہ چاہتے ہیں؟

اس کتاب میں سال 9-2008ء کے دوران مختلف ایشوز پر قابلِ اعتماد صحافیوں، تجزیہ نگاروں اور مصنفین کی رائے، تحقیق اور پیشگوئیوں کو بھی بطور حوالہ جات شامل کیا گیا ہے تاکہ مسائل اور کوتاہیوں پر بحث کرنے کے علاوہ ان حالات سے نکلنے کے ممکنہ راستے بھی تلاش کیے جائیں۔

پاکستان اور خطے پر مسلط کی گئی جنگ کے بعض فریقین، متاثرین اور ذمہ داران کی

تقاریر اور بیانات کے علاوہ متعدد اہم شخصیات کے انٹرویوز بھی اس کاوش کا ایک حصہ ہیں تا کہ موجودہ صورتحال کے تناظر میں اُن کی رائے اور خیالات بھی قارئین کے علم میں ہوں۔

اس موقع پر میں ان اہم اور صاحب الرائے شخصیات کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے نگارشات سے شائع شدہ میری پہلی کتاب 'طالبانائزیشن' کو سراہتے ہوئے اس کے اقتباسات اور معلومات کو اپنی تحریروں رپورٹس اور ٹی وی شوز کا حصہ بنا کر نہ صرف میری عزت افزائی کی بلکہ مجھے اس قدر حوصلہ افزائی سے نوازا کہ میں قارئین کی خدمت میں دوسری کاوش پیش کرنے کے قبل ہو سکا۔ میں اس ضمن میں جناب حمید اختر، جناب حامد میر، اطہر عباس، جناب ایمل خٹک، جناب عامر رانا، جناب خالد احمد، جناب حبیب اللہ خان، جناب ڈاکٹر فاروق خان، جناب جاوید صدیقی، جناب فضل رحیم مروت، جناب ندیم سرور، جناب بشیر شیرانی، جناب فاروق ستار، جناب جواد نذیر، محترمہ قطرینہ حسین، محترمہ سمن زہرا اور محترمہ شیرین مزاری کا بطور خاص مشکور ہوں۔ اس کاوش میں ماضی کے بعض اُن واقعات کو شامل کرنے کی حتی المقدور کوشش کی گئی ہے جن کا ذکر مذکورہ بالا شخصیات کے مطابق پہلی کتاب میں ہونا چاہیے تھا۔ زیر نظر کاوش کی تمام کمزوریوں، غلطیوں اور کوتاہیوں کی میں پیشگی ذمہ داری لیتا ہوں جبکہ تمام اچھی چیزوں کا کریڈٹ میں اپنے پبلشر جناب آصف جاوید اور اپنے استاد جناب اکرم شیخ کو دوں گا جنہوں نے میری نازبرداریاں اٹھاتے ہوئے تمام تر مشکلات کے باوجود اس کتاب کی اشاعت کو ممکن بنایا۔ جناب حامد میر کا بطور خاص مشکور ہوں جنہوں نے نہ صرف اس کاوش پر تبصرہ لکھا بلکہ قدم قدم پر میری رہنمائی بھی کی۔

عقیل یوسف زئی۔ پشاور

aqeelpips@gmail.com

ہے دوسروں کی آگ مرے گھر لگی ہوئی

عقیل یوسف زئی نے جس جرأت اور ذہانت کے ساتھ اہم تاریخی حقائق کو اس کتاب میں اکٹھا کیا ہے وہ جرأت اور ذہانت مجھے احمد فراز کے کچھ اشعار یاد دلا رہی ہے۔ 2007ء میں احمد فراز نے کہا تھا کہ

کس کا گماشتہ ہے امیرِ سپاہِ شہر
کن معرکوں میں ہے صفِ لشکر لگی ہوئی
برباد کر کے بصرہ و بغداد کا جمال
اب چشمِ بد ہے جانبِ خیبر لگی ہوئی
غیروں سے کیا گلہ ہو کہ اپنوں کے ہاتھ سے
ہے دوسروں کی آگ مرے گھر لگی ہوئی

احمد فراز نے جس ''امیرِ سپاہ شہر'' کی طرف اشارہ کیا تھا اُس کا نام جنرل پرویز مشرف تھا لیکن یہ پہلا گماشتہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی کئی گماشتے حکمران گزرے جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے دوسروں کی آگ ہمارے گھر مین لگائی۔ آج پاکستان اور افغانستان میں جو آگ لگی ہوئی ہے اس آگ کے پیچھے ایک لمبی کہانی ہے۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ 1947ء کے بعد سے پاکستان اور افغانستان کے حکمران غیروں کے گماشتے کا کردار ادا کرتے رہے اور ایک دوسرے کو غیروں کی لڑائی کا ایندھن بناتے رہے۔ 1973ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے خان عبدالولی خان، مولانا مفتی محمود، سردار عطاء اللہ مینگل اور غوث بخش بزنجو کے ساتھ مل کر ایک جمہوری پاکستان کی داغ بیل ڈالی اور وطن عزیز کو ایک متفقہ آئین دیا لیکن

افسوس کہ یہ جمہوری قیادت خود کو غیر ملکی سازشوں سے بچا نہ سکی۔ ان سازشوں کے نتیجے میں صوبہ سرحد میں نیشنل عوامی پارٹی اور جے یو آئی کی منتخب حکومت ختم کر دی گئی اور صوبہ بلوچستان میں بھی نیپ کی مخلوط حکومت ختم کر دی گئی۔ دشمن نے اس صورتحال کا فائدہ اُٹھایا اور پشاور میں پیپلز پارٹی کے رہنما حیات محمد خان شیر پاؤ کو بم دھماکے کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ پشاور کی تباہی کا آغاز تھا جس کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے آئی ایس آئی کے ذریعہ افغانستان میں گلبدین حکمت یار، برہان الدین ربانی، احمد شاہ مسعود اور کچھ دیگر افغانوں کے ذریعہ کابل حکومت کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ میں ذوالفقار علی بھٹو کی بہت عزت کرتا ہوں لیکن آئی ایس آئی کے ذریعہ افغانستان میں مداخلت اُن کی ایسی غلطی تھی جس کا خمیازہ بعد میں خود اُنہیں بھگتنا پڑا۔ 1974ء میں آئی ایس آئی کے بے لگام افسروں نے پشاور میں گلبدین حکمت یار کے ساتھ مل کر احمد شاہ مسعود کے ساتھ جان محمد کو سردار داؤد کا ایجنٹ قرار دے کر قتل کر دیا اور اس قتل نے افغانستان کی سیاست میں غلط فہمیوں اور نفرتوں کی جس آگ کو بھڑکایا یہ آج تک بجھ نہیں پائی۔ شائد بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ 1974ء میں آئی ایس آئی کے پشاور دفتر میں گلبدین حکمت یار اور احمد شاہ مسعود نے ایک دوسرے پر پستول تان لیے تھے۔ اگر جان محمد کو قتل نہ کیا جاتا تو شاید گلبدین اور احمد شاہ مسعود ایک دوسرے پر پستول نہ تانتے۔ افسوس کہ یہ واقعہ پشاور میں پیش آیا اور کئی سال گزرنے کے بعد آج پشاور میں ہم ایک دوسرے کو قتل کرنے میں مصروف ہیں۔

میں نے سابق وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر کی زبان افغان کمانڈروں گلبدین حکمت یار اور احمد شاہ مسعود کے اختلافات کی بہت کہانیاں سُنی ہیں کیونکہ ان دونوں کو پشاور لانے والے وہی تھے۔ انہوں نے آئی جی ایف سی کی حیثیت سے ان دونوں کو کرائے کے گوریلے کے طور پر بھرتی کیا تھا۔ نصیر اللہ بابر صاحب کے بقول جب 1977ء میں بھٹو حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا تو وہ گرفتار ہو گئے اور انہوں نے جیل سے شاہ ایران رضا شاہ پہلوی کو پیغام بھیجا کہ وہ امریکہ کے ذریعے گلبدین حکمت یار اور احمد شاہ مسعود کا خیال رکھے۔ امریکہ نے کچھ عرصے کے بعد جنرل ضیاء الحق کے ذریعہ ان افغان کمانڈروں کو اپنی ''پناہ'' میں لے لیا اور پھر افغانستان میں سوویت یونین کی آمد کے بعد اس خطے میں جو آگ بھڑکی وہ آج تک

ہمیں جلا رہی ہے۔ 1979ء سے 1989ء تک سوویت فوج افغانستان میں موجود رہی۔ ان دس سالوں میں اتنی تباہی نہ ہوئی جتنی تباہی 1989ء سے 1995ء کے دوران افغان گروپوں کی باہمی لڑائی کے باعث ہوئی۔ اس لڑائی نے طالبان کو جنم دیا اور نصیر اللہ بابر نے ان طالبان کو بھی اپنا بنا لیا۔

1995ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو وزیر اعظم اور نصیر اللہ بابر وزیر داخلہ تھے۔ میں نے محترمہ بینظیر بھٹو کے ہمراہ برطانیہ اور امریکہ کا دورہ کیا تو مجھے پتہ چلا کہ امریکی حکومت محترمہ بے نظیر بھٹو پر طالبان کی حمایت کے لیے دباؤ ڈال رہی ہے۔ میں نے دورے سے واپسی پر اپنے ایک کالم میں لکھا کہ امریکہ طالبان کو ''گیس پائپ لائن پولیس'' کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے۔ میرے اس کالم کے بعد نصیر اللہ بابر اور اُس وقت کے ایف آئی اے کے سربراہ رحمان ملک نے مجھے اور نصرت جاوید کو طالبان کے حق میں ایک بریفنگ دی۔ نصیر اللہ بابر چاہتے تھے کہ ہم طالبان سے ملیں اور انہیں سمجھنے کی کوشش کریں۔ نصرت جاوید نے طالبان کو ملنے سے انکار کر دیا لیکن میں نے بطور اخبار نویس معلومات اور مشاہدے کے لیے طالبان سے ملنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ یوں نصیر اللہ بابر کے توسط سے میرا طالبان سے تعارف ہوا اور مجھے پتہ چلا کہ معروف امریکی آئل کمپنی یونوکول نے رابرٹ اوکلے کے ذریعہ طالبان کے لیے 50 کروڑ روپے دیئے۔ یہ رقم نصیر اللہ بابر کے ذریعہ خرچ ہوئی اور بابر صاحب نے بڑی ایمانداری سے اس رقم کے ذریعہ کابل، جلال آباد اور پشاور کے علاوہ کوئٹہ اور قندھار کے درمیان ٹیلی فون لائن بچھا کر طالبان کو مواصلاتی نظام فراہم کر دیا۔ 1996ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو کو احساس ہوا کہ گلبدین حکمت یار اور احمد شاہ مسعود کو باہر رکھ کر افغانستان میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا انہوں نے نصیر اللہ بابر کو ہدایت کی کہ طالبان کی حکمت یار، احمد شاہ مسعود، ربانی، دوستم اور دیگر افغان رہنماؤں کے ساتھ صلح کروائی جائے۔ امریکی اس صلح کے خلاف تھے۔ نومبر 1996ء میں نصیر اللہ بابر نے تمام افغان رہنماؤں کو اسلام آباد میں ایک امن معاہدے پر دستخط کے لیے راضی کر لیا تھا لیکن امریکہ نے پاکستانی فوج کے جرنیلوں اور صدر فاروق لغاری کے ذریعہ بے نظیر حکومت کو فارغ کر دیا۔ غیر ملکی گماشتے ایک دفعہ پھر جیت گئے اور ہم عوام ہار گئے۔

نومبر 2001ء میں کابل پر امریکی طیاروں کی بمباری جاری تھی۔ میں ایک دن کابل کے علاقے دارالامان میں اُس جگہ پہنچا جہاں حرکت المجاہدین سے تعلق رکھنے والے پاکستانی کمانڈر اُستاد فاروق اپنے ساتھیوں سمیت امریکی بمباری کا نشانہ بنے تھے۔ یہاں موجود ایک افغان نے مجھے کہا کہ تمہارے بہت سے پاکستانی بھائی شہید ہونے کے لیے مزارشریف جا رہے ہیں اور ان سب کے قافلے کابل سے مزار شریف جانے والی سڑک پر اکٹھے ہو رہے ہیں۔ میں بھاگم بھاگ وہاں پہنچا تو تحریک نفاذ شریعت محمدی کے سینکڑوں نوجوانوں نے مجھے پہچان لیا۔ وہ سمجھے کہ میں بھی جہاد کے لیے اُن سے آملا ہوں۔ انہوں نے میرے حق میں نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ میں چند پاکستانی نوجوانوں کو ایک طرف لے گیا اور انہیں کہا کہ وہ کلاشنکوفوں اور بارہ بور کی بندوقوں سے امریکہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے وہ واپس چلے جائیں۔ مجھے یاد ہے کہ ان میں سے ایک نوجوان مینگورہ اور دوسرا خوازہ خیلہ کا تھا۔ یہ دونوں غصے میں آگئے اور کہنے لگے کہ وہ شہادت کے لیے مزار شریف ضرور جائیں گے۔ میری کوشش ناکام ہوگئی اور میں واپس کابل شہر کی طرف چل پڑا۔ ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ فضا میں امریکہ کے بی۔52 بمبار طیارے نمودار ہوئے اور انہوں نے میری آنکھوں کے سامنے ملاکنڈ ڈویژن کے کم از کم چار سو نوجوانوں کو چند لمحوں میں جلا کر رکھ دیا۔ اگلے دن میں کابل میں اُسامہ بن لادن کا انٹرویو کر کے واپس جا رہا تھا کہ کابل جلال آباد روڈ پر ایک طالبان کمانڈر ملا حسن نے مجھے گرفتار کر لیا کیونکہ میں داڑھی کے بغیر تھا چند گھنٹوں کے بعد مجھے وزیر داخلہ ملا عبدالرزاق اخوند کی مداخلت پر رہائی ملی تو اُس نے مجھے معذرت کرنے کے لیے اپنے دفتر بلایا۔ میں نے اُسے کہا کہ ملاکنڈ ڈویژن سے آنے والے جذباتی نوجوانوں کو مزار شریف جانے سے روکا جائے تو اُس نے کہا کہ یہ شریعت محمدی والے کسی کی نہیں سنتے اور ہمارے لیے ایک دردِ سر بنے ہوئے ہیں۔ مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ اگر ملاکنڈ پر توجہ نہ دی گئی تو یہاں کے جذباتی نوجوان ایک دن خود کو بھی تباہ کریں گے اور ہمیں بھی تباہ کریں گے۔ افسوس کہ اس طرف توجہ نہ دی گئی۔ 2006ء میں باجوڑ کے گاؤں ڈمہ ڈولا پر امریکی حملہ ہوا تو اگلے دن اس گاؤں میں میری ملاقات مینگورہ کے صحافی افتخار خان مرحوم سے ہوئی جو جیو نیوز سے وابستہ تھے۔ افتخار خان نے مجھے کہا کہ سوات کے

ہمسائے باجوڑ میں امریکی میزائل حملے کے بعد جو آگ لگی ہے یہ بہت جلد مینگورہ، پشاور اور اسلام آباد تک پہنچ جائے گی۔

افتخار خان اس دنیا میں نہیں رہا لیکن اُس کا اندازہ درست نکلا۔ ہم نے 1974ء میں جن غلطیوں کا آغاز کیا تھا 2007ء میں ان غلطیوں کو انتہا پر پہنچا دیا۔ جنرل پرویز مشرف نے محض امریکہ کو متاثر کرنے کے لیے 2007ء میں اسلام آباد کی لال مسجد میں آپریشن کا ڈرامہ کیا۔ اس آپریشن میں مارے جانے والے اکثر طلبہ و طالبات کا تعلق قبائلی علاقوں اور سوات سے تھا اور پھر انہی کے ساتھیوں نے ملک بھر میں پھیل کر جو آگ لگائی اب اُس میں کئی بیرونی دشمن بھی شامل ہو چکے ہیں۔ جس وقت میں یہ سطور تحریر کر رہا ہوں تو مجھے اطلاع ملی ہے کہ بلوچستان کے دور دراز علاقے تربت میں دو مشکوک امریکیوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ امریکیوں کی مشکوک سرگرمیاں پختون علاقوں میں بھی جاری ہیں اور عقیل یوسف زئی نے ان سرگرمیوں کا بھی اس کتاب میں بھرپور جائزہ لیا ہے۔ ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ 1978ء میں کابل کے حکمرانوں نے سوویت یونین کو افغانستان میں مداخلت کی دعوت دے کر مجرمانہ غلطی کی اور پھر جنرل ضیاء الحق نے امریکی سی آئی اے کو اپنا مہمان بنا کر اس سے بھی بڑی غلطی کی۔ رہی سہی کسر گیارہ ستمبر 2001ء کے بعد جنرل پرویز مشرف نے پوری کر دی جس نے پسنی اور جیکب آباد کے ہوائی اڈے امریکہ کے حوالے کر دیئے اور انہیں ہوائی اڈوں سے اُڑنے والے جہاز افغانستان میں بمباری کرتے رہے۔ امریکہ افغانستان کے بعد پاکستان میں اپنے قدم جمانا چاہتا ہے۔ ہمیں امریکہ کے ساتھ جنگ کیے بغیر اُس کے ارادوں کو ناکام بنانا ہے کیونکہ امریکی جہاں ایک دفعہ اپنے اڈے بنا لیں وہاں سے آسانی کے ساتھ واپس نہیں جاتے۔ امریکہ افغانستان اور پاکستان کی سرزمین کو ایران اور چین کے خلاف استعمال کرنا چاہتا ہے اور خطے میں امریکی فوجوں کی موجودگی روس کے لیے بھی باعث تشویش ہے۔ ہمیں امریکی مفادات کے تحفظ کی پالیسی کو خیرباد کہنا ہوگا اور اپنے مفاد کی خود نگہبانی کرنی ہوگی۔ ہمارا مفاد یہ ہے کہ ہم افغانستان میں مداخلت نہ کریں اور افغانستان ہمارے دشمنوں کو اپنے علاقے سے پاکستان میں مداخلت کی اجازت نہ دے۔ پاکستان اور افغانستان کو چاہیے کہ ایران، روس، چین، ترکی، تاجکستان، ازبکستان، ترکمانستان، سعودی

عرب اور بھارت کے ساتھ مل کر ایک مشترکہ ورکنگ گروپ بنائیں۔ یہ ورکنگ گروپ افغانستان کو اس خطے کا ایک نیوٹرل ملک بنانے کا کام کرے اور افغانستان کے تمام ہمسایوں کو افغانستان میں مداخلت سے روکے۔ ایک آزاد، خودمختار اور نیوٹرل افغانستان ایک آزاد اور خودمختار پاکستان کی سلامتی کی ضمانت بن سکتا ہے۔ خطے کے تمام ممالک متحد ہو کر اس خطے کو مغرب کی مداخلت سے پاک کریں اور آپس میں ایک معاہدہ کریں جس کے تحت وہ ایک دوسرے کے ساتھ وعدہ کریں کہ خطے کا کوئی بھی ملک نہ تو دوسرے ملک میں مداخلت کرے گا اور نہ ہی اپنی سرزمین پر کسی غیر ملکی فوج کو اڈہ بنانے کی اجازت دے گا۔ میں نے پچھلے بیس سال میں اُسامہ بن لادن اور ملا عمر سے لے کر برہان الدین ربانی، دوستم اور حامد کرزئی تک، ہیلری کلنٹن، کنڈولیزا رائس، ٹونی بلیئر، منوچہر متقی، پرویز مشرف، بے نظیر بھٹو، آصف زرداری، نواز شریف اور اسفندیار والی سمیت کئی شخصیات کے ساتھ افغانستان اور پاکستان کے مستقبل پر تبادلہ خیال کیا ہے۔ سب سے اچھی بات مجھے نیلسن منڈیلا نے کہی۔ انہوں نے کہا کہ ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر ایک نئے سفر کا آغاز کرو۔ سب کی سنو لیکن صرف اپنا اور اپنے لوگوں کا مفاد مقدم رکھو۔ میں نے جنوبی افریقہ کے عظیم لیڈر سے پوچھا کہ نئے سفر کا آغاز کیسے کیا جائے؟ عظیم نیلسن منڈیلا نے کہا کہ نئے سفر کے آغاز سے پہلے سب سے معافی مانگو اور سب کو معاف کر دو۔ ہمیں بھی ایک نئے سفر کا آغاز کرنا ہے اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے ایک دوسرے سے معافی بھی مانگنی ہے اور ایک دوسرے کو معاف بھی کرنا ہے۔ میرے پیارے بھائی عقیل یوسف زئی کی یہ کتاب ہماری بہت سے غلطیوں کی نشاندہی کر رہی ہے۔ اب ہمیں اس کتاب کے مصنف کی طرح جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لینا چاہیے تاکہ ہم اُس آگ کو بجھانے میں کامیاب ہو سکیں جو غیروں نے بھڑکائی لیکن ہمارے اپنے اس آگ کو اپنے ہاتھوں سے اپنے ہی گھر میں دہکائے بیٹھے ہیں۔ اللہ ہم سب کو ہدایت دے۔

حامد میر

اسلام آباد

راہِ راست سے راہِ نجات کی طرف

ایک زمانہ تھا جب ـــــ تاریخ صرف حکمرانوں کے کارناموں تک محدود ہوا کرتی تھی اور اس کے لیے حکمرانوں نے باقاعدہ تنخواہ دار ملازم رکھے ہوئے تھے۔ جو شام کو یہ تاریخ لکھتے اور صبح بادشاہ سلامت کے حضور پیش کرتے وہ اُس میں اصلاح بھی کرتا اور احکام بھی پیش کرتا جو بصد شکر قبول کرلیا جاتا۔ ایسے لوگوں کی آج بھی کوئی کمی نہیں۔

یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے تاریخ کو گڈمڈ کیا اور آج اس کو پڑھنے کے قابل بھی نہیں چھوڑا ـــ تاریخ کا کوئی بھی ورق الٹیں تو دیانت اور سچائی کے سوا سب کچھ مل جاتا ہے جو مفادات کے تابع ہوتا ہے۔ غیر جانبداری نام کی چیز تو عنقا ہوگئی ہے۔ یہی کچھ پاکستان اور اُس کی تاریخ کے ساتھ ہوا تھا اور یہ آج بھی ایک شکل میں جاری ہے جس کی مثال مطالعہ پاکستان بھی ہے کہ ہم اپنی علیحدہ ایک شناخت چاہتے تھے۔ ہم نے مسلمان بادشاہوں، آمروں اور ڈکٹیٹروں کی تاریخ کو تاریخ اسلام کہہ کر خود فریبی سے کام لیا اور پھر افغانستان سے آنے والے ڈاکوؤں، چوروں اور لیٹروں کو اسلام کے مجاہد قرار دیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ـــ اپنے جدید ہتھیاروں کے نام بھی انہی سے منسوب کر دیئے ......غزنی، غوری اور نہ جانے کیا کیا؟

جب ایسا رویہ اور مزاج ہو تو پھر ـــ کیسی تاریخ؟؟ اور کیسی ماضی کی تلاش؟؟ وہ بھی پوری دیانت اور سچائی کے ساتھ!

حالانکہ — تاریخ تو صرف سچائی ہوتی ہے جس میں قوموں کا ماضی آئینے کی طرح سچ بولتا ہے۔ تمام تر غلطیوں اور کوتاہیوں کے ساتھ! یا پھر چہروں پر چیچک کے نشانوں اور گڑھوں کے ساتھ!!

لیکن — افسوس کہ ہم نے صرف کامیابیوں اور فتوحات کو ہی تاریخ سمجھ لیا یا پھر اس کو ہی تاریخ بنا کر پیش کر دیا تاکہ کوئی اپنا اصلی اور گھناؤنا چہرہ نہ دیکھ سکے۔

پاکستان میں کیا کچھ نہیں ہوا؟ اس ملک، اس قوم کے ساتھ ڈکٹیٹروں اور آمروں نے کیا کچھ نہیں کیا؟ اقتدار و اختیار پر قبضہ کے لیے تمام جمہوری، سیاسی اور اخلاقی اقدار کو پاؤں تلے روندا — اور یہ دعویٰ بھی کیا کہ — جو ہم جانتے وہ نہ تو سیاستدان جانتے ہیں اور نہ ہی عوام۔ ہم ہی سقراط اور ہم ہی افلاطون ہیں، جو ری پبلک لکھ بھی سکتے ہیں اور بنا بھی سکتے ہیں۔ اس ملک اس دھرتی پر کوئی ہم سے بہتر حکمران ہو ہی نہیں سکتا۔

اور پھر — ایسے لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں رہی جنھوں نے ان کو ظل الٰہی اور امیر المومنین تک کہا! روٹی کے چند ٹکڑوں اور مشروب کے کچھ قطروں کے لیے کس کا ذکر کریں اور کس کو نظر انداز کریں۔ یہ تو ایک ایسی فہرست ہے جو نہ ختم ہونے والی ہے ...... ستم ظریفی کی انتہا ہے کہ یہ کسی احتسابی فہرست میں بھی نہیں آتی اور آج بھی دندناتے پھرتے ہیں حکومتیں بدل جاتی ہیں حکمرانوں کے چہرے بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مگر ان کے چہرے پر کوئی بدنما لکیر نہیں ابھرتی۔ یہ کل بھی مطمئن تھے اور آج بھی خوش ہیں۔

کیونکہ — انہیں معلوم ہے کہ نہ تو نظام تبدیل ہو سکتا ہے اور نہ ہی حکمرانوں کی ترجیحات میں کوئی تبدیلی رونما ہو سکتی ہے یہ ضرورتوں اور مفادات میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ایوب خان، یحییٰ خان، ضیاء الحق اور پھر جنرل مشرف سب چلے گئے لیکن اس کے باوجود آج بھی وہی حکمران ہیں۔ انہی کا بنایا ہوا نظام ہے اور اُس میں وہی تاریخ ہے اور وہی تاریخ لکھنے والے۔ حق کے قلم کلمۂ حق کہنے سے پہلے حکمرانوں کی رضا اور مرضی کا گہرا مطالعہ کر لیتے ہیں۔ بلکہ یہ تو حکمرانوں کے مزاج آشنا ہیں۔ جن کی بنیادی تعلیم و تربیت ہی مزاج آشنائی سے ہوتی ہے یہ سیاستدانوں اور دانشوروں سے بڑے دانشور ہیں۔ جو ایک خبر کو بنیاد بناتے اور پھر اُس پر یوں سنہرے حروف سجاتے ہیں کہ خبر بھی شرمندہ ہونے لگتی ہے۔

خیر چھوڑیئے — بات ذرا دور نکل گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ خبر تاریخ نہیں ہوتی یہ تاریخ کا ایک جزو یا پھر ایک لمحہ ضرور ہوتی ہے۔ جس میں بہت سارے دن ہفتے اور سال چھپے ہوتے ہیں۔ اُس میں بہت سارے واقعات و حوادث پنہاں ہوتے ہیں۔ جن کے اجتماع سے تاریخ بنتی ہے یا پھر ان محرکات وعوامل کے ذخیرہ کی تلاش کا نام تاریخ ہے جو ایک چھوٹی سی خبر کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ یہ چھوٹی خبر سب کے لیے بڑی خبر ہو یہ تو دیکھنے والے کی آنکھ اور پڑھنے والے کے ذہن پر منحصر ہے کہ وہ اس چھوٹی سی خبر سے کتنی بڑی صداقت تلاش کرتا ہے۔

شاید یہی کام عقیل یوسف زئی نے کیا ہے۔ کیونکہ بنیادی طور پر وہ ایک جرنلسٹ ہے اور اُس کا خبر کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ لیکن ایک حساس اور پڑھا لکھا نوجوان بھی ہے جو اپنے اردگرد کے حالات کا بھی گہرا شعور رکھتا ہے اور اُس کی اپنی دھرتی کے ساتھ اٹوٹ وابستگی ہے — یہی ہے کہ جب اس کی دھرتی پر طالبان کا عفریت نمایاں ہوا تو وہ تڑپ اٹھا۔ اور اُس نے طالبانائزیشن کی شکل میں صدائے احتجاج بلند کرنا ضروری سمجھی اور اس کو لوگوں نے پوری توجہ کے ساتھ سنا اور اُس کی ہاں میں ہاں بھی ملائی۔ کیونکہ یہ اُس کی اپنی دھرتی، اپنی مٹی پر ہونے والے ظلم وستم کی سچی اور بے لاگ داستان تھی جس کے نتیجہ میں آپریشن راہِ راست شروع ہوا اور نہ صرف اُس کی خوبصورت اور حسین وادی طالبان کے چنگل سے آزاد ہوئی بلکہ خود اُس کے اندر بھی اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی اور اُس کو نیا حوصلہ اور نئی قوت عطا کی اور اُس نے فوجی آپریشن کے ذریعے مابعد واقعات کو درج کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ تاکہ تاریخ کا تسلسل برقرار رہے۔ اور یہ کہانی اپنے انجام تک پہنچے۔

آپریشن راہِ راست سے آپریشن راہ نجات تک دراصل ایک طویل کہانی کے مختلف ابواب ہیں جن میں کہانی در کہانیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جس میں ہر کہانی ایک منفرد داستان بیان کرتی اور بہت سارے عبرت کے نشان چھوڑ جاتی ہے تاکہ سننے اور پڑھنے والے اس سے فیض حاصل کرسکیں۔ جس کا اظہار عقیل یوسف زئی نے اپنے پہلے شاہکار طالبانائزیشن میں بھی کیا ہے اور اب اس تسلسل میں فوجی آپریشن کے ذریعے بھی کیا ہے اور میں نے بھی اس کا پس منظر بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ کتاب نہ صرف افغانستان اور پاکستان کے شورش زدہ علاقوں کی جغرافیائی، سیاسی اور معاشرتی صورتحال کا تجزیہ کرتی ہے بلکہ خطے میں پھیلے ہوئے اقتصادی اور معاشی وسیلوں کو بیان کرتے ہوئے بین الاقوامی ضرورتوں کا احساس بھی دلاتی ہے۔

یہ کتاب پاکستان کے حکمران طبقوں کی ناکام اور کامیاب پالیسیوں کا حال بھی بیان کرتی ہے اور اُس سوچ کا بھی احاطہ کرتی ہے جو اس جنگ کا محرک ہے۔

یہ کتاب ـــ علاقے کے عوام کی خواہشوں اور امیدوں کا احوال بھی بیان کرتی ہے اور ان کی ان محرومیوں کی نشاندہی کرتی ہے جو انہیں متبادل کی طرف دیکھنے پر مجبور کرتی رہیں۔

یہ کتاب فاٹا اور اُس کے عوام کا سیاسی اور معاشرتی پس منظر بھی بیان کرتی ہے اور ان کی آئینی اور جمہوری حقوق سے محرومیوں کے اسباب بھی تلاش کرتی ہے اور انسانی حقوق کی تنظیموں کو دعوتِ فکر بھی دیتی ہے۔ جو اکیسویں صدی کی اشد ضرورت ہے۔

اب بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ــ عُقیل یوسفزئی ایک نوجوان دانشور کے طور پر سامنے آئے ہیں جو اس خطے کی نازک ترین سیاسی اور جغرافیائی صورتحال کو بہت گہرائی میں دیکھتے اور اس کے بارے میں اپنی ایک رائے بھی رکھتے ہیں جو انہیں اس دھرتی سے وابستگی نے دی ہے۔ اُمید ہے کہ ان کی یہ رائے بھی طالبانائزیشن کی طرح عوام میں قبولیت حاصل کرے گی۔

شیخو

لاہور

کچھ اس کتاب کے بارے

طالبانائزیشن ایک سوچ، ایک رویہ، ایک نظریہ ہے۔ جس کے تمام زاویے انتہاپسندی کی طرف مڑتے ہیں۔ یہ ایک ایسے معاشرتی اور سیاسی تسلط کا نام ہے جس میں کسی اور سوچ، کسی اور نظریے کی گنجائش ہے اور نہ ہی کسی غیر کو برداشت کیا جاتا ہے بلکہ جو بھی غیر ہے وہ ناقابل معافی اور گردن زدنی ہے۔

پاکستان میں اس سوچ اور نظریے کا ظہور — کہا تو یہی جاتا ہے کہ جنرل ضیاء الحق کے زمانہ میں ہوا تھا لیکن اگر سچائی کے ساتھ دیکھا اور پرکھا جائے تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس کی جڑیں پاکستان کی بنیادوں میں بھی موجود تھیں جن کو پھل پھول 1940ء میں اُس وقت کی مسلم لیگ اور حکمران طبقوں نے قرارداد مقاصد کو منظور کر کے لگائے اور پھر — جب جنرل ضیاء الحق اس قرارداد کو آئین کا حصہ بنا چکا تو طالبانائزیشن کے اس درخت کی جڑیں زمین کے اندر تک گہری اتر گئیں بلکہ یہ درخت برگد کے درخت کی طرح گھنا اور تناور ہو گیا۔

یہ صحیح ہے کہ — 70ء کی دہائی کے اواخر میں جب پوری دنیا کی طرح پاکستان میں بھی سوشلزم کی تحریکیں نمایاں تھیں اور یہ خطرہ موجود تھا کہ کہیں یہ تحریک معاشی اور معاشرتی ڈھانچے کو ہلا کر نہ رکھ دے تو یحییٰ خان کے وزیرِ اطلاعات قابلِ غور لفظ نوشیرعلی خان نے جہاں نظریہ پاکستان کی اختراع ایجاد کی تو یہ اعلان کرنا بھی ضروری سمجھا کہ پاکستان کی مسلح افواج ملک کی جغرافیائی ہی نہیں نظریاتی سرحدوں کی بھی محافظ ہیں۔ بس یہ اعلان ہونا تھا کہ

دائیں بازو کے چہروں پر طمانچہ کے ایک نئے احساس نے جنم لیا تھا اور پھر یہ بھی ہوا کہ جماعت اسلامی نے مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی اور مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے بالمقابل کچھ اضافی ذمہ داریاں بھی قبول کرلیں۔ مغربی پاکستان میں پی پی پی اور بھٹو صاحب کے خلاف فتوے جاری ہوئے تو مشرقی پاکستان میں فوج کی سرپرستی میں البدر اور الشمس جیسی مسلح تنظیمیں بنا کر اُسے معاونت فراہم کی۔ کیونکہ اُس کے نظریات میں ایک نکتہ یہ بھی شامل تھا کہ دین اور اسلامی اقدار کے پھیلاؤ کے لیے حکمرانوں کا قرب ضروری ہے یا پھر یہ کہ دین کے تسلط کے لیے طاقت کا حصول ضروری ہے لیکن بدقسمتی سے طاقت تو حکمرانوں کے پاس تھی۔ لہٰذا ان کی سرپرستی اور تعاون ایک مجبوری بھی بن گیا۔

لیکن افسوس کہ — حکمران مشرقی پاکستان پر اپنا تسلط برقرار نہیں رکھ سکے اور اس سے جان چھڑوائی گئی کہ مشرقی پاکستان کے اکثریتی عوام کی موجودگی میں جاگیرداری اور فوج کا تسلط برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔ پاکستان میں (قابلِ غور لفظ) کی بحالی بھی لازم ہو جاتی اور عوام کو اس کے حقوق بھی لوٹانا پڑے۔ ذوالفقار علی بھٹو کا دورِ حکومت ایک مجبوری تھی اور یہ زہر بھی مجبوراً پینا پڑا تھا چنانچہ اس دور میں بغاوتیں بھی ہوئیں اور سازشیں بھی۔ اور بالآخر اپنے وقت سے پہلے انتخابات کی طرف دھکیل کر اُس سازش کے گھیرے میں لے لیا گیا جس میں اب عالمی کھلاڑی بھی شریک ہو چکے تھے۔ بھٹو صاحب کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو اس کو دائیں بازو کی جماعتوں خصوصاً جماعت اسلامی نے فوج کی سرپرستی اور تعاون سے ہائی جیک کرلیا جماعت ایک طرف تو کروڑوں کے فنڈز حاصل کر رہی تھی تو دوسری طرف نئے انتخابات کے لیے چلائی جانے والی اس تحریک کو نظامِ مصطفیٰ کے نفاذ سے جوڑنے کا فریضہ انجام دے رہی تھی۔ جنرل ضیاء الحق عین اس موقع پر مارشل لاء نافذ کر دیا جب فریقین کے درمیان معاہدہ ہو گیا تھا۔ جماعت اسلامی سب کچھ پیچھے چھوڑ کر ہائی جیک کر کے جنرل ضیاء الحق کے اقتدار کی ساتھی بن گئی تا کہ نظام مصطفیٰ کو یقینی بنایا جا سکے۔ اگرچہ جنرل ضیاء الحق نے بھی نظامِ مصطفیٰ کا دعویٰ کیا اور پھر کچھ رسمی اقدامات بھی کیے اور پھر اپنے پورے عرصۂ اقتدار میں وہ ایسے اقدامات کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے رہے۔

لیکن — جنرل ضیاء الحق کی لاٹری۔ افغانستان میں پے در پے اختلافات اور پھر

سوویت فوجوں کی آمد سے شروع ہوئی۔ جو سوویت فوجوں کے انخلا تک جاری رہی۔ امریکہ نے سوویت یونین سے ویت نام کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے پاکستان کے توسط سے افغانستان میں جہاد شروع کروایا اور ان مجاہدین کی تربیت اور فراہمی کی ذمہ داری قبول کی اب پاکستان کی دینی سیاسی جماعتوں اور مختلف گروہوں کو حکومت اور ریاست کی سرپرستی میسر آ گئی تھی لیکن اس سرپرستی سے سب سے زیادہ فیض اب جے یو آئی کو حاصل ہو رہا تھا کیونکہ وہ علاقے جو اس جہاد کے لیے خام مال فراہم کر رہے تھے وہاں کے اکثریتی عوام کا تعلق مکتبہ دیوبند سے تھا اور افغانستان میں پختون علاقوں میں بھی اکثریت اسی مکتب فکر کی تھی۔ چنانچہ ایک طرف تو ان علاقوں میں مجاہدین کے مدرسے اور تربیتی مرکز قائم ہو گئے تو دوسری طرف اس عرصہ کے دوران میں پاکستان بھر میں جگہ جگہ مدرسوں کا قیام شروع ہو گیا۔ 80 کے شروع میں تو یہ مدرسے چار پانچ ہزار سے زیادہ نہیں تھے لیکن چند سالوں میں یہ تعداد بیس ہزار تک پہنچ گئی جن میں 60 فیصد مدرسوں کا تعلق مکتب دیوبند سے تھا جو جہاد کے حوالے سے ایک مخصوص نظریہ کا حامل تھا۔

اب جمعیت العلمائے اسلام جماعت اسلامی سے بھی بڑی حکومت کی پارٹنر بن چکی تھی لیکن کیونکہ یہی وہ جماعت تھی جو افغان جہاد میں سب سے زیادہ خام مال فراہم کر رہی تھی طالبان تو خالصتاً اسی جماعت کی پیداوار تھے اور ملا عمر کے بارے کہا جاتا تھا کہ وہ مولانا سمیع الحق سے دینی تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں۔ لیکن صرف یہی دونوں جماعتیں ہی نہیں بنیں کچھ اور لوگ بھی اس جہاد فی سبیل اللہ میں شامل ہو کر ریاست و حکومت کی سرپرستی کے ساتھ جنرل ضیاء الحق اور اُن کی (قابل توجہ لفظ) کی محبت اور شفقت حاصل کر چکے تھے۔ اسے بدقسمتی کہیے کہ سوویت فوجیں امریکہ کے ساتھ معاہدے کے لیے واپس چلی گئیں اور خود امریکہ بھی ان جہادیوں کو بے یارومددگار اور بے سہارا چھوڑ کر چلا گیا۔ پاکستان کے خواب بھی ادھورے رہ گئے اور وہ جس سٹرٹیجک ڈیپتھ کے نام پر افغانستان پر حکومت یا اُس کو پانچواں صوبہ بنانے کی کوششیں کر رہے تھے وہ سب التوا کا شکار ہو گئیں۔ افغانستان میں لڑنے والے مجاہد آپس میں برسرپیکار ہو کر اقتدار کی جنگ لڑنے لگے۔ پاکستان کے ریاستی ادارے کبھی سیاف، کبھی خالص، کبھی ربانی اور کبھی گلبدین حکمت یار کے ذریعے حکومت اور

اقتدار کو ممکن اور مستحکم بنانے کی کوشش کرتے رہے لیکن طویل خانہ جنگی کے باوجود کوئی بھی گروہ حتمی کامیابی حاصل نہیں کر سکا تو ملا عمر کی قیادت میں طالبان کی دریافت ہوئی جن کے لیے امریکہ کی آشیر باد بھی حاصل تھی۔

اس دوران میں بہت سارے گروہ ہتھیاروں اور دولت کے ساتھ واپس آ چکے تھے جنہوں نے پاکستان میں آ کر ایک نئی نظریاتی جنگ کا آغاز کرتے ہوئے شیعہ کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی تو دوسری طرف افغانستان میں طالبان کی حکومت قائم ہو گئی۔ جس کو دُنیا بھر کے مطلوب افراد کا مالی اور عسکری تعاون حاصل ہوا تو انہوں نے بھی افغانی طالبان سے نظریاتی تسلط کی قیمت وصول کرنا شروع کر دی۔ عورتوں پر پابندی لگا دی گئی۔ تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی نشانات مٹا دیئے گئے اسلامی قوانین کے تحت سزاؤں کا عمل شروع ہو گیا۔ شاید یہ بات دنیا کے لیے کسی حد تک قابل قبول بھی تھی لیکن جب افغانستان کو بیس کیمپ بنا کر مختلف ممالک میں جنگجو بھیجنے کا سلسلہ شروع ہوا تو برداشت کی حد بھی ختم ہو گئی اور پھر ہم نے دیکھا کہ طالبان کو بغیر کسی مزاحمت کے طالبان چھوڑ گئے۔

کہا جاتا ہے کہ ـــ یہ عملی تھی اور اس کا مقصد امریکہ اور نیٹو افواج کے خلاف طویل جنگ لڑنا تھا۔ کیونکہ ایک تصور تو یہ بھی تھا کہ امریکہ بھی یو مین کی طرح یہاں سے فرار ہونے پر مجبور ہو جائے گا۔ یہ خیال آج بھی موجود ہے جو حقائق کے منافی ہے کیونکہ افغانستان پر قبضہ محض جغرافیائی اور سیاسی نہیں بلکہ اس کے پیچھے اقتصادی مفادات کا طویل سلسلہ ہے ویسے بھی جو ملک پچھلے تیس سال سے اس خطے میں دس ارب ڈالر سے زائد انویسٹ کر چکا ہے وہ آسانی سے پیچھے ہٹنے کے لیے نہیں آیا۔ بہر حال یہی وہ خوش فہمی تھی جس میں پاکستان کے حکمران طبقوں نے ایک طرف تو طالبان اور القاعدہ کے ارکان کو قبائلی علاقوں میں موجود بیس کیمپس کی طرف واپسی کا محفوظ راستہ دیا بلکہ 2002ء کے انتخابات میں متحدہ مجلس بنوائی اور پھر اس کی مغربی سرحدوں پر موجود سرحد اور بلوچستان میں حکومتوں سے بھی نوازا کہ نہ صرف دنیا کو یہ تاثر دیا جائے کہ یہ خطہ مذہبی اور جہادی ہے بلکہ ان کو افغانستان میں موجود طالبان کی سرگرمیوں میں تعاون کے لیے بھی استعمال کیا جائے۔

لیکن ـــ پاکستان کے حکمران یہ اندازہ لگانے میں بری طرح ناکام رہے کہ اب

نہ تو طالبان ہیں اور نہ ہی القاعدہ کے وہ مقاصد۔ وہ تواب دُنیا بھر میں ایسی نظریاتی اسلامی حکومت کے خواہاں تھے جو ان کے نظریات اور اصولوں کے مطابق ہو چنانچہ دونوں کے درمیان فکری تفاوت بھی ہوا اور پھر ٹکراؤ بھی۔ جو ایک فطری ردِعمل بھی تھا کیونکہ اب طاقت کا وہ توازن نہیں تھا جو اسی اور نوے کی دہائی کے آغاز تک تھا۔ اب ایک طرف تو طاقت اور حکومت سے لذت آشنائی تھی تو دوسری طرف قوتوں اور طاقتوں سے براہِ راست تعلق کا عکس بھی نمایاں ہو چکا تھا۔ تیسرا اہم پہلو یہ بھی کہ وہ کیمپ جو ایک زمانہ میں محض تربیت تک ہی محدود تھا اب وہ عوامی حمایت کے ساتھ ایک باقاعدہ ریاست کے خواب میں تبدیل ہو چکا تھا اور دوسری احکامات کی تکمیل بھی ہو رہی تھی اور سزا و جزا کا عمل بھی شروع ہو چکا تھا — یاد رہے کہ سوات میں عورتوں نے اپنے زیور تک اتار کر مجوزہ حکومت کے بیت المال میں جمع کروا دیئے تھے اور لوگوں نے باقاعدہ اسے فنڈز بھی فراہم کیے اور یہی فنڈز دنیا کے مختلف ممالک میں موجود تنظیمیں بھی اُسے ارسال کرنے لگیں یہ وہ صورتحال تھی جس کا پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کا ایک مخصوص حصہ یا پھر جنرل ضیاء الحق کی باقیات صحیح اندازہ نہیں لگا سکی بلکہ وہ اسی تصور کی اسیر رہی کہ یہ طالبان ابھی تک ان کے ہمنوا اور ساتھی ہیں۔ لیکن پانی تو سر سے گزر چکا تھا اور اس کا ادراک سوات میں اُس وقت ہوا جب سکیورٹی فورسز کے چار اہم عہدیداروں کو قتل کر کے ان کی لاشیں عبرت کا نشان بنا دی گئیں۔

اس مرحلہ پر اس حقیقت کا ادراک بھی ضروری ہے کہ نائن الیون کے بعد افغانستان پر قبضہ کو بھی پاکستانی حکمران طبقے گہرائی میں نہیں دیکھ سکے اور وہ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ وہ یہی سمجھتے رہے اور شاید اب بھی یہ سمجھ رہے ہیں کہ طالبان اور افغانستان کے دیگر مزاحمتی گروپ امریکہ کو بھی سوویت یونین کی طرف نکلنے پر مجبور کر دیں گے اسی تناظر میں ہی متحدہ مجلس عمل کی ان علاقوں میں حکومت بنوائی گئی تھی جو خود طالبان کی حمایتی اور نظریاتی مددگار بھی تھی۔ اُس نے پانچ سال کے عرصۂ اقتدار کے دوران میں وہ مزاحمتی رویہ اختیار نہیں کیا جس کی مرکزی حکومت بظاہر تنقید کرتی رہی تھی اور یہ اُس کی باقاعدہ پالیسی کا حصہ تھا جو بعد میں بُری طرح ناکام ثابت ہوئی لیکن اس عرصہ اقتدار میں نہ صرف طالبان مضبوط ہوئے بلکہ انہوں نے فاٹا کے علاقہ بندوبستی اضلاع میں بھی اپنے

مستقل ٹھکانے بنا کر نہ صرف اپنے سیاسی اور نظریاتی دشمنوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا اور حکومتی محاذ آرائی کو بھی حتمی شکل دینا شروع کر دی جبکہ مجلس عمل کی حکومت اور دیگر ادارے بھی ان سے صرف نظر کرتے رہے بلکہ بعض سرکاری اداروں کے تعاون کی خبریں بھی آتی رہیں چنانچہ جب 2007ء بین الاقوامی دباؤ کے تحت پاکستان میں تبدیلی کو ناگزیر سمجھ لیا گیا اور محترمہ بینظیر بھٹو شہید کے ساتھ معاہدہ ہوا اور اُس کے تحت این آر او بھی جاری کیا گیا اور پھر انتخابات بھی ناگزیر ہو گئے تو یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ اب طالبان اور القاعدہ کے خلاف جنگ کی حکمت عملی بھی تبدیل ہو گی۔ ہم اس معاہدے کی گہرائی میں نہیں جاتے مگر اتنا ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ بے نظیر بھٹو کی جنرل مشرف یا پھر افغان پالیسی کے کرتا دھرتا واپسی نہیں چاہتے تھے جس کا اظہار انہوں نے 18 اکتوبر کو کراچی میں ان کے استقبالیہ جلوس میں دھماکوں اور پھر 27 دسمبر کو اُن کو موت کے گھاٹ اتار کر کیا تھا۔ یہاں ایک دلچسپ حقیقت تو یہ ہے کہ جنرل مشرف بھی اُن کی واپسی کے حق میں نہیں تھے اور انہوں نے محترمہ کو واپس نہ آنے کے لیے بھی کہا تھا۔ مگر وہ اس کے باوجود وطن واپس لوٹ آئی تھیں جو بقول شخصی جنرل مشرف کے ساتھ ہونے والے معاہدے کی خلاف ورزی تھی۔ کیونکہ طے یہ پایا تھا کہ وہ وطن واپس نہیں آئیں گی اور ان کا کوئی نمائندہ (مخدوم امین فہیم) حکومت میں پی پی پی کا سربراہ ہو گا جبکہ قاف لیگ ان کے ساتھ تعاون کرے گی۔ مگر محترمہ کی شہادت، جناب زرداری کے پارٹی قیادت سنبھالنے اور پھر انتخابات میں کامیابی تک صورتحال لمحہ لمحہ تبدیل ہوتی گئی۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ـــ بینظیر بھٹو کے ساتھ معاہدے اور عوامی نیشنل پارٹی کے بین الاقوامی رابطوں سے جب یہ واضح ہو گیا کہ اب حکومت کے ساتھ دہشت گردی کے خلاف جنگ کی حکمت عملی نہ صرف تبدیل ہو گئی بلکہ انتہا پسندوں کے بالمقابل ترقی پسند اور سیکولر فورسز کو قوت اور توانائی فراہم کی جائے گی تو میاں محمد نواز شریف کی واپسی کے احکامات بھی پیدا کیے گئے جو لندن میں دائیں بازو کی جماعتوں سے بھی اتحاد کر چکے تھے اور جو بینظیر بھٹو کے ساتھ میثاق جمہوریت پر بھی متفق ہو چکے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ بینظیر بھٹو نے اس میثاق کو جنرل مشرف کے ساتھ معاہدے کے لیے بھی استعمال کیا کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ اس معاہدے سے نہ صرف سیاستدانوں بلکہ جمہوریت کی واپسی کے امکانات بھی

پیدا ہوں گے اور یہ بعد کے حالات میں کسی حد تک ثابت بھی ہوا۔ بہرحال وہ قوتیں جو مشرف اور بینظیر معاہدے کے خلاف تھیں اور جو بینظیر بھٹو کی واپسی کو بھی پسند نہیں کرتی تھیں انہوں نے نواز شریف کی واپسی کے لیے بھی راستہ ہموار کیا حالانکہ وہ دسمبر 2010ء سے پہلے وطن واپس آ سکتے تھے اور نہ ہی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لے سکتے تھے اور پھر یہی وہ قوتیں تھیں جنہوں نے انتخابات کو ایک بار پھر ہائی جیک کیا اور پیپلز پارٹی کو سادہ اکثریت بھی حاصل نہیں کرنے دی اور روایتی طور پر منقسم مینڈیٹ ہی برقرار رکھا تاکہ سیاسی جماعتوں کے درمیان محاذ آرائی بھی چلتی رہے اور ایک کمزور حکومت قائم ہو جس کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ یہ الگ بات ہے کہ سیاستدانوں خصوصاً دونوں بڑی جماعتوں میں کچھ عرصہ تک تو اتفاق رائے رہا لیکن پھر دونوں کی راہیں اپنے اپنے مفادات کی اسیر ہو کر علیحدہ علیحدہ ہو گئیں۔

بہرحال اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ — نئی حکومت کے قیام خصوصاً جناب زرداری کے عہدہ صدارت پر منتخب ہونے کے بعد دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ایک نئی تیزی آئی اور پہلے سوات اور مالاکنڈ میں آپریشن راہِ راست شروع ہوا جس میں فورسز کے ساتھ مرکزی اور صوبائی حکومتیں بھی شامل ہوئیں اور ان کو وہاں کے عوام نے بھی اپنی بھرپور حمایت فراہم کی۔ سوات کے عوام نے شدید ترین گرمی میں ہجرت کے عذاب بھی برداشت کیے اور فورسز کو اپنا تعاون بھی فراہم کیا جس کے نتیجہ میں بہت ساری کامیابیاں حاصل ہوئیں لیکن ادھر ایک اور سچ تو یہ بھی ہے کہ اس دوران میں بہت سارے غیر ملکی اور مقامی کمانڈرز جو ان علاقوں میں دہشت اور وحشت کی علامت بن چکے تھے یا تو وہ محفوظ پناہ گاہوں میں چلے گئے یا پھر فاٹا کے ان علاقوں میں چلے گئے جہاں ابھی جنگ شروع نہیں ہوئی تھی۔

یہ وہ مرحلہ تھا جب اس بات میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا تھا اب حکومت اور سکیورٹی فورسز کو فاٹا کے علاقوں پر بھی توجہ مرکوز کرنا پڑے گی لیکن یہ بات بھی واضح تھی کہ سکیورٹی فورسز سوات کی غلطیاں دوبارہ نہیں دہرائیں گی اور یہاں پہلے تمام صف بندی کر کے باقاعدہ کارروائی کا آغاز کریں گی لیکن اس دوران میں یوں بھی ہوا کہ طالبان اور دیگر جنگجو گروپوں

نے بعض فوجی ٹھکانوں اور تنصیبات کو براہِ راست ٹھکانہ بنا کر فورسز کے لیے جنگ کا چیلنج کھڑا کر دیا جسے فوج اور حکومت نے قبول کر کے ہنگامی بنیادوں پر آپریشن راہِ نجات کا فیصلہ کر لیا۔

بعض مبصرین کی اس رائے میں بھی وزن ہے کہ باقاعدہ جنگ سے پہلے جس قدر وہاں کے عوام کو اعتماد میں لینے اور حکومت کے حامی گروپوں کو تحفظ فراہم کرنے کی ضرورت تھی وہ تحفظ نہیں دیا گیا۔ دوسرا یہ کہ جنگ زدہ علاقوں سے ہجرت کرنے والے لوگوں کے لیے بھی مناسب نہیں انتظامات نہیں کیے جا سکے تھے۔ تیسرا یہ کہ افغانستان سے ملحقہ سرحد کی بندش کا بندوبست کیا گیا یا افغانستان کی حکومت اور نیٹو فورسز کو پوری طرح اعتماد میں نہیں لیا گیا جس کے نتیجہ میں ادھر سے بھی جنگجوؤں کی آمد کی خبریں بھی سامنے آتی رہیں۔ چوتھا یہ کہ بلوچستان کے ملحقہ علاقوں پر بھی توجہ مرکوز نہیں کی گئی جس کی وجہ سے فاٹا کے علاقوں سے طالبان کے بلوچستان فرار ہونے کے امکانات ختم نہیں ہوئے اور بلوچستان کو ڈورن حملوں کا نشانہ بنانے کا عندیہ دیا جاتا رہا۔

بہرحال یہ ایک طویل کہانی ہے جو طالبانائزیشن کے حوالے سے شروع ہو کر ایک باقاعدہ اسلامی ریاست تک پہنچ کر پاکستان اور اس خطے کے لیے چیلنجز کا باعث بن چکی ہے۔ یہی اس کتاب کی کہانی ہے جو طالبانائزیشن سے شروع ہوئی تھی اور اب فوجی آپریشن تک پہنچ چکی ہے اس پر کہانی کا انجام کیا ہوگا، یہ کہنا قبل از وقت ہے یہ ایک ایسا زہر ہے جو پاکستان کی رگوں میں سرایت کر چکا ہے دیکھئے اس کا نتیجہ کیا برآمد ہو۔

لیکن ـــ اس کا کوئی ایک مجرم نہیں عقیل یوسف زئی نے کچھ بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے باقی آپ خود پہچان لیجیے گا۔

اکرم شیخ

615-E گلشن راوی لاہور

✿ ✿ ✿ ✿

آپریشن راہِ راست اور اس کی کامیابی کے اسباب

اے این پی اور پی پی پی کی صوبہ سرحد میں مخلوط صوبائی حکومت نے 16 فروری 2009ء کو تحریک نفاذِ شریعت محمدی (ٹی این ایس ایم) کے ساتھ جب ملاکنڈ ڈویژن میں نظامِ عدل کے نفاذ کا معاہدہ کیا تو سیاسی حلقوں اور تجزیہ نگاروں کو پختہ یقین تھا کہ یہ معاہدہ حکومت کے لیے نقصان اور طالبان کے لیے فائدے اور رعایت کا سبب بنے گا۔ پاکستان کے علاوہ عالمی برادری اور میڈیا نے بھی اس معاہدے کو پاکستانی ریاست کی شکست اور انتہا پسندوں کی زبردست کامیابی کا نام دے کر شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس کے باوجود حکومت خصوصاً اے این پی جس کا حکومت میں بھی زیادہ حصہ ہے، کا موقف تھا کہ اس معاہدے کے بعد نہ صرف یہ کہ ملاکنڈ ڈویژن میں امن قائم ہو گا بلکہ نظام عدل کے نفاذ کے نتیجے میں ڈویژن کے عوام کا ایک دیرینہ اور مقبول مطالبہ (Popular Demand) بھی پورا ہو جائے گا۔ اور یہ کہ حکومت اور اے این پی کی حمایت میں بھی اضافہ کا باعث ہو گا۔ حالانکہ ملاکنڈ خصوصاً سوات اور بونیر کے عوام نے اے این پی کو ووٹ اس لیے نہیں دیئے تھے کہ اس پارٹی کے نفاذ شریعت یا نظام عدل کے نفاذ کا کوئی وعدہ کیا تھا بلکہ عوام کے اعتماد کی بنیادی وجہ انتہا پسندوں کے خاتمے اور امن کے قیام کا وہ نعرہ تھا جس کی بنیاد پر اے این پی اور پی پی پی نے اپنی انتخابی مہم چلائی تھی۔

اے این پی نے بہت بڑا سیاسی رسک لیتے ہوئے مولانا صوفی محمد کو رہا کر کے ایک بڑے کردار کے لیے یہ سمجھ کر منتخب کیا تھا کہ وہ انتہا پسند طالبان کو نظام عدل کے نفاذ

کے اعلان اور اقدامات کے بعد ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیں گے۔ ایسا کرنے کا صوفی محمد اور ان کے ساتھیوں نے وعدہ بھی کیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ 16 فروری کے اگلے روز سیدو شریف جا کر اپنی کوششوں میں لگ گئے۔ تاہم طالبان کا ردِعمل اتنا مثبت اور ذمہ دارانہ نہیں تھا جس کی حکومت کے علاوہ صوفی محمد کو بھی توقع تھی۔ اس کی بنیادی وجہ طالبان کی وہ قیادت تھی جو کہ القاعدہ تحریک طالبان پاکستان اور کشمیری یا پنجابی جہادی گروپوں کے ساتھ نہ صرف مسلسل رابطوں میں تھی بلکہ وہ سلسلہ بند جہادی ہونے کے باعث اپنی تحریک اور مزاحمت کو پاکستان کے دوسرے علاقوں تک پھیلانے کے ایک مربوط پلان پر بھی عمل پیرا تھے۔

ناقابل عمل اور نام نہاد امن معاہدے کے بعد اس گروپ کے کمانڈروں کو یہ کہتے سنا گیا کہ وہ ایک مخبوط الحواس اور ریٹائرڈ شخص یعنی مولانا صوفی محمد پر انحصار کرنے کی بجائے اپنے اہداف اور مقاصد کے حصول کو ذہن میں رکھ کر اپنی حکمت عملی پر ہی چلنے کو ترجیح دیں گے۔ چنانچہ مشاہدے میں یہ بھی آیا کہ مذکورہ کمانڈرز صوفی محمد اور ان کی طرح کے دوسرے نسبتاً اعتدال پسند افراد کا نجی محفلوں میں مذاق اڑانے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

اس کے ساتھ اپنے بیانات میں ایک تسلسل میں صوفی محمد کو اپنا رہبر قرار دے کر ان کے لیے کیے گئے معاہدے اور وعدے کی پاسداری کا تاثر بھی دیتے رہے۔ معاہدے کے فوراً بعد اس گروپ یعنی طالبان نے اپنے ان ساتھیوں کی رہائی کے مطالبے پر سخت رویہ اپنایا جو کہ فورسز کے ہاتھوں گزشتہ آپریشن کے دوران گرفتار کیے جا چکے تھے۔ ان گرفتار افراد کی تعداد ایک سو دس (110) سے زائد تھی ان میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو کہ خودکش حملوں کی پلاننگ کے علاوہ اس قسم کی دوسری ریاست مخالف سرگرمیوں میں ملوث رہے تھے اور ان میں متعدد آپریشنل کمانڈرز بھی شامل تھے اور یہی وجہ تھی کہ فورسز اور انٹیلی جنس ایجنسیاں ان افراد کی رہائی میں نہ صرف ٹال مٹول کا مظاہرہ کر رہی تھیں بلکہ وہ ممکنہ حد تک مزاحمت کی پالیسی پر بھی عمل پیرا تھیں۔ وزراء اور طالبان کی خوداعتمادی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی لیکن حکومت کا مورال حسبِ توقع گرتا جا رہا تھا پھر ایک موقع وہ بھی آیا جب سواتی طالبان کے انتہائی بااثر اور تشدد پسند کمانڈر ابن امین (پیر صاحب) نے یہاں تک کہا کہ ہتھیار پھینکنے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم نہ صرف جہاد سے دستبردار ہو

جائیں بلکہ اپنے ہی ہاتھوں اپنی گردن میں موت کا پھندا ڈالنے کا راستہ بھی ہموار کر دیں۔

اسی روّیے کا نتیجہ تھا کہ طالبان کے نائب امیر شاہ دوران اور ترجمان مسلم خان نے ہتھیار ڈالنے سے قطعی انکار کرتے ہوئے ہتھیار رکھنے کے عمل کو پشتونوں کی روایات کے خلاف قرار دے کر حکومت اور صوفی محمد کو ایک نئی مشکل میں ڈال دیا۔

طالبان نے اپنی شرائط منوانے کی جانب عملی اقدامات کے باوجود مینگورہ سمیت دیگر تمام علاقوں میں نہ صرف گشت وغیرہ کا سلسلہ جاری رکھا بلکہ ان کی سرگرمیوں اور خوداعتمادی میں اور بھی اضافہ ہونے لگا۔ انہوں نے مینگورہ میں تبلیغی مرکز کو نہ صرف اپنی تحویل میں لے لیا بلکہ بعض تبلیغی محرکین کو مارنے اور تشدد کا نشانہ بنانے سے بھی دریغ نہیں کیا تو ادھر مولانا صوفی محمد کی طرف سے اس قسم کا مطالبہ بھی سامنے آیا کہ قاضیوں کی تعیناتی کا عمل ان کی مشاورت سے کیا جائے تو اس کے ساتھ ہی قیدیوں کی رہائی کے معاملے پر طالبان کا دباؤ اتنا بڑھ گیا کہ فورسز کو حکومت کے کہنے پر تقریباً سارے گرفتار طالبان اور ان کے کمانڈروں کو رہا کرنا پڑا۔ طالبان کی نفسیاتی بالادستی کا یہ عالم تھا کہ صوفی محمد جیسے مہرے نے دو بار صوبائی حکومت کے نمائندوں سے یہ کہہ کر ملنے سے انکار کر دیا کہ حکومت ان کے مطالبات ماننے سے ٹال مٹول سے کام لے رہی ہے اور یہ کہ حکمران وعدوں کی پاسداری کے معاملے پر ان کی توقعات پر پورا نہیں اتر رہے۔ اسی صورتحال حال نے اے این پی کو اپنی نیک نیتی کے باوجود نتائج کے حوالے سے اور بھی مشکلات سے دوچار کر دیا۔

تو دوسری طرف صوفی محمد مسلح طالبان گروپوں کا دباؤ بڑھنے سے بھی غیر متوقع طور پر مشکلات کا شکار ہو گئے۔ لیکن ادھر خفیہ ادارے اور فورسز کے اعلیٰ حکام معاہدے کے بعد کی صورتحال کو بہت تشویش کی نظر سے دیکھ رہے تھے کیونکہ فورسز کا مؤقف تھا کہ اے این پی کی حکومت نے ایک ایسے مرحلے پر آپریشن روکنے کا فیصلہ کیا تھا جب فورسز ایک خاص حکمت عملی کے تحت طالبان کے قریب پہنچ کر ان کا محاصرہ کرنے والی تھیں۔ خفیہ اداروں اور فورسز کو طالبان کے بڑھتے ہوئے حوصلے اور مطالبات کے علاوہ گرفتار افراد کی رہائی کے حکومتی فیصلے پر شدید تحفظات لاحق ہو گئے۔ عین اسی دوران فضل اللہ اور ان کے دوسرے کمانڈروں کے ذہن میں یہ بات ڈال دی گئی کہ حکومت نے مولانا صوفی محمد کو حکومت کے ساتھ تعاون

کرنے کے بدلے چار سے لے کر آٹھ کروڑ تک کی رقم دی ہے جس سے طالبان کمانڈروں کو بے خبر رکھا گیا تھا۔ یہ خبر طالبان اور صوفی محمد کے درمیان بداعتمادی اور اختلاف میں مزید دوری کا سبب بن گئی۔ بعض حلقوں کے مطابق اس خبر کے پھیلانے کے ذمہ دار وہ لوگ تھے جو کہ حکومت اور طالبان کے درمیان مصالحت کی کوشش کو سبوتاژ کرنے کی کوشش میں تھے۔ اس بداعتمادی نے طالبان کو نہ صرف حکومت بلکہ صوفی محمد کے خلاف بھی کھل کر میدان میں آنے کا بہانہ فراہم کر دیا۔ چنانچہ صوفی محمد کو یہ بھی پیغام بھیجوایا گیا کہ وہ نہ صرف یہ کہ اس ڈیل کا طالبان کے سامنے اعتراف کریں بلکہ اگر انہوں نے یہ رقم لی ہوتی تو یہ طالبان کے بیت المال میں جمع کروائیں تاہم صوفی محمد اسی ڈیل سے انکار کرتے رہے۔

اس اختلاف اور بداعتمادی کا نتیجہ کچھ یوں نکلا کہ طالبان کی سرگرمیوں میں یکدم اضافہ ہونے لگا اور جب صوفی محمد صوبائی حکومت کے ساتھ اپنے وعدے کے مطابق مینگورہ کے گراسی گراؤنڈ میں 80 ہزار سے زاید کے اجتماع میں طالبان کو ہتھیار رکھنے کی ترغیبی تقریر کرنے پہنچے تو طالبان نے اپنے چار افراد بھیج کر نہ صرف ان کو اعلان سے گریز کرنے کا حکم دیا بلکہ انہوں نے صوفی محمد کو یہ مشورہ دیا کہ وہ پارلیمنٹ، جمہوریت اور سیاسی پارٹیوں کو خلافِ اسلام قرار دے کر حکومتی سیٹ اپ کو بھی کھل کر تنقید کا نشانہ بنائیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اسی موقع پر ہی ان کو ایسا کرنے کی صورت میں اُنہی چار افراد کے ذریعے سنگین نتائج بھگتنے کی دھمکی بھی دی گئی تھی۔ صوفی محمد تقریر کرنے اٹھے تو ٹیلی ویژن چینلز نے ان کی لائیو کوریج کر کے حکومت کی امیدوں پر پانی پھیر دیا کیونکہ وہ اپنے وعدے کے برعکس ریاستی ستونوں کو خلاف اسلام قرار دے رہے تھے اور یوں 16 فروری کے معاہدے سے حکومت نے جو توقعات وابستہ کیں تھیں وہ دم توڑ گئیں۔ صوفی محمد کے اس طرزِ عمل اور طالبان کی کارروائیوں کے باوجود اے این پی اس کوشش میں تھی کہ معاہدے کو برقرار رکھ کر مطلوبہ مقاصد حاصل کیے جائیں تاہم وفاقی حکومت، حساس اداروں، پاکستانی میڈیا اور جمہوریت پسند سیاسی قوتوں کے لیے اس تقریر کے بعد 16 فروری کا معاہدہ اب کسی صورت میں قابل عمل اور قابل قبول نہیں رہا تھا۔ جس پر غیر جانبدار صحافیوں اور تجزیہ نگاروں کے علاوہ عالمی میڈیا کا بھی شدید ردِعمل سامنے آ گیا۔ اور یوں نئی صف بندی کی بنیاد پر طالبان کے خلاف

ایک فیصلہ کن آپریشن کی تیاری کے احکامات جاری کر دیئے گئے اور اے این پی اور پی پی پی کے ایم پی ایز اور عہدیداروں کے ذریعے عوام کو سوات سے نقل مکانی کرنے کے پیغامات بھجوائے گئے۔ دوسری طرف طالبان کی محدود سرگرمیاں اب کھلی کارروائیوں کی صورت میں بڑھنی شروع ہوگئیں اور یہ بات سب پر عیاں ہوگئی کہ معاہدے کی ناکامی کی صورت میں فریقین کے درمیان اب فیصلہ کن جنگ لڑی جائے گی۔ عوام نے جانی نقصان سے بچنے کے لیے اپنی مدد آپ کے تحت علاقے سے محفوظ مقامات کی طرف نقل مکانی شروع کر دی۔ اسی دوران فورسز اور طالبان کے درمیان محدود پیمانے پر جھڑپوں کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس سے قبل معاہدے کے باوجود جب سواتی طالبان نے وعدہ خلافی کر کے ضلع بونیر کے بعض علاقوں کی طرف بھاری اسلحے اور ساز و سامان کے ساتھ پیش قدمی کی تو لوگوں کو یہ دیکھ بہت حیرت ہوئی کہ ملاکنڈ ڈویژن کے کمشنر سید جاوید نہ صرف یہ کہ کھل کر طالبان کا ساتھ دیتے رہے تھے بلکہ ان کی موجودگی میں طالبان کے اہم کمانڈرز اُن کی گاڑی میں سفر کرتے تھے اور ان کے ہاں ٹھہرتے بھی تھے۔ سید جاوید نے طالبان کی ہمدردی میں سرکاری عہدے کا کوئی خیال رکھے بغیر خود کو کسی کے سامنے جوابدہ سمجھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ انہی دنوں لوئیر دیر کے ایک ایس پی خورشید خان اور متعدد دوسرے سرکاری اہلکار طالبان کے ہاتھوں قتل کر دیئے گئے تو حساس اداروں اور عوام نے واقعہ کی معلومات لے کر اس کی ذمہ داری کمشنر ملاکنڈ ہی کے اوپر ڈال دی۔

لوئیر دیر کے اس واقعہ اور بونیر پر قبضہ کرنے کے اقدام نے پوائنٹ آف نو ریٹرن کی صورتحال کو جنم دیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورے پاکستان سے طالبان کی مخالفت اور حکومت کے حق میں آواز اٹھنی شروع ہوگئی۔ بونیر میں قومی لشکر نے طالبان کے ساتھ ایک جھڑپ کے دوران شل بانڈی نامی مقام پر متعدد طالبان کو ہلاک کر دیا جس کے بعد بونیر بھی ہاتھ سے نکلتے نظر آنا شروع ہو گیا۔ جبکہ کمشنر موصوف نے طالبان کی واپسی کا ایک ڈرامہ رچانے کا اہتمام کر کے بے شمار طالبان کمانڈروں کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بونیر کے اندر محفوظ ٹھکانے فراہم کر دیئے تو بونیر میں بھی جھڑپوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حکومت اور عسکری قیادت نے اپریل 2007ء کو بونیر میں اور اُس کے بعد سوات سمیت پورے ملاکنڈ

ڈویژن میں ایک بڑے فوجی آپریشن کے احکامات جاری کر دیئے یوں مئی کے پہلے ہفتے کے دوران سوات میں آپریشن کا باقاعدہ آغاز کیا گیا اس کو آپریشن براہ راست کا نام دیا گیا۔ اس آپریشن سے قبل 20 لاکھ سے زائد شہری قافلوں کی شکل میں مردان، صوابی، چارسدہ، پشاور اور دوسرے علاقوں میں نقل مکانی پر مجبور ہوئے، یوں پاکستان کی تاریخ میں پہلی دفعہ اتنے بڑے پیمانے پر نقل مکانی عمل میں آئی جس کی اس سے قبل ملکی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

سوات کے آپریشن اور اس کی کامیابی کا پس منظر تفصیلات میں بتانے کی بجائے ان چیدہ چیدہ نکات پر مختصراً بات کرنا زیادہ مناسب ہوگا جو کہ اس کارروائی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کا سبب بنے۔

1- انٹیلی جنس کا نیٹ ورک فعال بنانا

حکومت اور طالبان کے درمیان جب 16 فروری کے معاہدے پر دستخط کیے گئے اور صورتحال تھوڑی بہتر ہوگئی تو پاکستان کے انٹیلی جنس ادارہ نے معاہدے کے نتائج سے قطع نظر اپنے نیٹ ورک کو ان علاقوں تک پھیلا دیا جہاں طالبان یا ان کے مقامی کمانڈروں کا ہولڈ تھا۔ اداروں نے معلومات کے حصول کے علاوہ امن پسند عوامی حلقے کو بھی اپنی حمایت اور تعاون پر آمادہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپریشن سے قبل سیکورٹی فورسز کے پاس نہ صرف مکمل اور درست معلومات موجود تھیں بلکہ ان کو عوام کی حمایت بھی حاصل ہوگئی تھی۔

2- اے این پی کی تنظیموں کا کردار

اے این پی کی مقامی تنظیموں اور ممبران اسمبلی کے طالبان سے چھٹکارا پانے کے لیے پارٹی قیادت کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے معلومات کی فراہمی کے علاوہ عوام کے دلوں سے طالبان کا خوف نکالنے، عوام کو حکومت اور فورسز کے ساتھ تعاون پر آمادہ کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا اگر اے این پی جیسی سیاسی قوت میدان میں موجود نہ ہوتی تو آپریشن کی کامیابی کے امکانات نہ صرف کم ہوتے بلکہ اس کا دورانیہ بھی بڑھ جاتا اور فورسز کا جانی نقصان بھی زیادہ ہوتا۔ پی پی پی، پختونخواہ اور سوات امن جرگہ نے بھی اس ضمن میں انتہائی جرأت کا مظاہرہ کر کے اہم کردار ادا کیا۔

3- بندوبستی اضلاع کی سٹیٹس کا فائدہ

فورسز نے پوری تیاری کے ساتھ پیش قدمی کی پلاننگ کی تھی۔ اس لیے اس پلاننگ میں یہ بات مدِنظر رکھی گئی کہ دوسرے متاثرہ اضلاع دیر، شانگلہ اور بونیر میں نہ صرف کارروائیاں جاری رکھی جائیں۔ بلکہ ان اضلاع کی سرحدوں پر کڑی نظر رکھی جائے تاکہ دباؤ کی صورت میں جنگجو آسانی کے ساتھ ان علاقوں میں منتقل نہ ہوں۔ لیکن اکثر طالبان کی منتقلی کے باوجود اس پلاننگ کے بہتر نتائج برآمد ہوئے جبکہ شاہ دوران سمیت متعدد طالبان کو دوسرے علاقوں میں منتقلی کی کوششوں کے دوران ہی ہلاک کر دیا گیا۔

4- جنگجوؤں کا مواصلاتی نیٹ ورک جام کرنا

فورسز نے اس بات پر بہت توجہ دی کہ جنگجوؤں کے درمیان رابطے کا سلسلہ ممکنہ حد تک جام کر دیا جائے اس مقصد کے لیے جہاں پی ٹی سی ایل اور موبائلز کمپنیوں کے نظام منقطع کیے گئے وہاں بعض آلات کے ذریعے دوسرے ذرائع کو یا تو منقطع کیا گیا یا ان کی کالز کی مانیٹرنگ کر کے باتیں سننے کے سلسلے سے جنگجوؤں کے ٹھکانوں یا اداروں سے متعلق معلومات حاصل کی جاتی رہیں اس کے علاوہ وہ ریڈیو (ایف ایم) سسٹم بھی بلاک کر دیئے گئے جن کو لوگوں کے ہراساں کرنے کے علاوہ حکومت اور فورسز کے خلاف بطور مہلک ہتھیار استعمال کیا جاتا رہا تھا۔

5- عوام کو بروقت نکالنے کا فیصلہ

مینگورہ سمیت زیادہ تر علاقوں میں شرپسندوں نے لوگوں اور آبادی کو یرغمال بنا کر ان کو ڈھال بنایا ہوا تھا۔ حکومت کی موبلائزیشن کے باعث 20لاکھ سے زائد شہریوں نے اپنی مدد آپ کے تحت فیصلہ کن آپریشن کی بُو سونگھتے اور محدود جھڑپوں کے باوجود نقل مکانی کا سلسلہ شروع کر کے فورسز کا نہ صرف کام آسان بنا دیا بلکہ شرپسندوں سے عوامی ڈھال کی صورت میں ایک بڑی سہولت بھی چھین لی۔ حکومت کی فراہم کردہ سہولیات نے آئی ڈی پیز کو اپنے علاقے چھوڑنے کی طرف تیزی سے راغب کیا جس کے بعد فورسز کی پیش قدمی میں

تیزی واقع ہوگئی۔

6- کرفیو کے مسلسل نفاذ کا فائدہ

باقاعدہ کارروائیوں اور زمینی پیش قدمی سے قبل کئی کئی روز تک مسلسل کرفیو کے نفاذ نے شرپسندوں کی نقل وحرکت کو ناممکن بنا دیا۔ بے شمار چیک پوسٹوں کے قیام اور فورسز کے علاوہ ہیلی کاپٹرز کی گشت نے خودکش حملہ آوروں کی حرکت کو بھی مشکل بنا دیا حالانکہ مستند اطلاعات کے مطابق فورسز کی دوبارہ کارروائیوں کی صورت میں 50 سے زائد خودکش گاڑیاں تیار کر کے ان کو مختلف علاقوں میں رکھا گیا تھا جنہیں فورسز کے خلاف مزاحمت کے طور پر استعمال کیا جانا تھا۔ مندرجہ بالا اور بعد کے اقدامات کو ضروری اور ناگزیر قرار دینے کی میڈیا مہم میں جن افراد نے اہم کردار ادا کیا اُن میں ڈی جی آئی ایس پی آر میجر جنرل امیر عباس، صوبائی وزیر اطلاعات میاں افتخار حسین، سینئر وزیر بشیر بلور، وزیرِ تعلیم سردار حسین بابک، وزیرِ اعلیٰ حیدر ہوتی، ایچ آر سی پی کے اقبال حیدر۔ سوات امن جرگہ کے ضیاء الدین یوسف زئی، مسلم لیگ (ن) کے ایاز امیر اور گورنر سرحد اویس غنی نمایاں رہے۔ پی پی پی کی قیادت عملاً اس مہم سے لاتعلق ہی رہی۔

7- عوامی نمائندوں اور اعلیٰ احکام کے دورے

چیف آف آرمی سٹاف، وزیراعظم، وزیر اعلیٰ اور گورنر سرحد سمیت مقامی اور دوسرے وزراء کی جانب سے سوات کے دوروں نے نہ صرف پولیس اور دوسرے اداروں کی فعالیت کو ممکنہ حد تک تیز کر دیا۔ بلکہ انکی آمد سے عام لوگوں کا حوصلہ بھی بڑھتا گیا۔ چونکہ نظام عدل کے نفاذ کے فیصلے اور اس کے عمل پذیر ہونے کے باوجود طالبان کی خلاف ورزیوں سے عوام طالبان سے بددل ہو گئے تھے چنانچہ وہ حکومتی اداروں کے قریب آنا شروع ہو گئے۔

8- فورسز کے افسران کا مثبت رویّہ

2007ء کے دوران میں شروع ہونے والی آپریشنل فورسز اور حکومت نے گزشتہ

کارروائیوں میں فورسز کے ہاتھوں دوران سخت چیکنگ اور منفی رویے کا نوٹس لے کر اب کی بار اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ عام لوگوں کے ساتھ نامناسب سلوک سے گریز کرتے ہوئے ان کو اپنی حمایت پر آمادہ کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے خصوصی ہدایات جاری کی گئی تھیں جس کا نتیجہ بہت مثبت نکلا اور عوام فورسز کے ساتھ نہ صرف تعاون کرتے نظر آئے بلکہ وہ ممکنہ حد تک فورسز کو طالبان کی نقل وحرکت کی اطلاعات بھی فراہم کرتے رہے۔

9- طالبان کے حامیوں کی گرفتاریاں

جس فیصلے یا اقدام نے فورسز کے کام کو آسان بنا دیا وہ انٹیلی جنس اطلاعات کی بنیاد پر طالبان کے رشتہ داروں اور حامیوں کی گرفتاریوں کا عمل تھا۔ فورسز نے آپریشن کے عروج کے دور سے لے کر اس کی کامیابی تک کے تمام عرصے کے دوران سینکڑوں مشکوک افراد کو طالبان کی حمایت کرنے پر گرفتار کر کے شرپسندوں کے رشتہ داروں کے گرد بھی گھیرا تنگ کر دیا اس سلسلے کو دوسرے اضلاع تک بھی پھیلا دیا گیا۔ اس عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ طالبان جنگجو اپنے رشتہ داروں کی گرفتاریوں کی اطلاعات پا کر نفسیاتی دباؤ اور خوف کا شکار ہو گئے۔ اسی پالیسی کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ تیسرے درجے کے جنگجوؤں نے مورچے اور ٹھکانے چھوڑ کر اپنے رشتہ داروں کی رہائی کے لیے ہتھیار ڈالنے شروع کر دیئے۔ گھروں کی مسماری کے اقدامات اور خوف نے بھی حکومتی دباؤ ڈالنے میں اہم کردار ادا کیا جبکہ حکومت کی طرف سے طالبان کے حامی سرکاری اہلکاروں اور خود طالبان کی جائیدایں ضبط کرنے کے اعلانات نے بھی عام طالبان کے حوصلے پست کرنے میں بہت معاونت فراہم کی۔

10- قومی میڈیا کا مثبت کردار

مقامی ناتجربہ کار اور کسی حد تک طالبان کے حامیوں پر مشتمل میڈیا نمائندوں کی پشاور اور دوسرے شہروں کی جانب منتقلی سے سوات آپریشن کی کارروائیوں کی کوریج تمام میڈیا مراکز کے سنجیدہ اور سینئر لوگوں کے ہاتھوں میں آ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ طالبان کے بجائے فورسز اور حکومت کے اقدامات، اعلانات اور کارروائیوں کی کوریج کی شرح بڑھ گئی یوں دوسرے علاقوں میں موجود متاثرین کا حوصلہ بڑھنا شروع ہو گیا اور ان کو اُمید ہونے لگی کہ

اب کی بار فورسز کے ہاتھوں سوات میں یقیناً ایک فیصلہ کن کارروائی کی جائے گی۔ قومی سطح کے اینکر پرسنز، تجزیہ نگاروں اور مختلف کیمپوں کا دورہ کرنے والی ٹیموں نے اپنے تجزیوں اور رپورٹوں کے ذریعے عسکریت پسندوں کے عزائم کو بے نقاب کرنے میں اہم ترین کردار ادا کیا۔ اس سلسلے میں جن قابلِ ذکر اینکر پرسنز اور تجزیہ نگاروں نے حقائق اور دلائل کی بنیاد پر رائے عامہ ہموار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ان میں حامد میر، طلعت حسین، حسن خان، نصرت جاوید، قطرنیہ حسین، مشتاق منہاس، عباس اطہر، سلیم صافی، شوکت خٹک، اسماعیل خان، شمیم شاہد، سہیل قلندر، کاشف عباسی، نسیم زہرا، بہروز خان، فرید اللہ خان، حمید اختر، عرفان صدیقی، عاصمہ شیرازی، عامر خاکوانی، حیدر جاوید سید، قیصر تنویر شاہد، اکرم شیخ، عبدالحئی کاکڑ، ایم ریاض، زاہدہ حنا، امتیاز عالم، شفقت محمود، ہارون الرشید، مہر بخاری شامل ہیں۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ان افراد نے رائے عامہ ہموار کرنے، آئی ڈی پیز کا حوصلہ بڑھانے، حکومت کو گائیڈ لائن فراہم کرنے اور عوام کو شرپسندوں کے عزائم بتانے کے علاوہ حکومتی اقدامات پر چیک رکھنے کے حوالے سے بھی بنیادی کردار ادا کیا اور ان کی خدمات ان فوجی کمانڈروں سے کسی قدر کم نہیں تھیں جو کہ محاذ پر لڑ رہے تھے۔ جبکہ ان کے برعکس پشاور کے مقامی اخبارات اور قلمکاروں کی بہت مایوس کن کارکردگی سامنے آئی۔ شائد وہ کسی خوف میں مبتلا تھے کیونکہ انہیں طالبان کی طرف سے دھمکیاں بھی مل رہی تھیں۔

راہِ راست کے بعد سوات کی صورتحال

آپریشن راہِ راست کی کامیابی کے بعض معاونِ حالاتی عوامل کا تجزیہ ہم نے گزشتہ باب میں پیش کرتے ہوئے ایسے بعض اقدامات کو اگلے باب میں علیحدہ بیان کرنے کا قصد کیا تھا تاکہ صورتحال کو سمجھنے میں زیادہ آسانی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ آپریشن راہِ راست عسکری قوتوں نے باقاعدہ جنگی حکمت عملی اور منصوبہ بندی کے ساتھ شروع کیا تھا اور اس کے لیے نہ صرف ایک باقاعدہ فریم ورک بنایا تھا بلکہ 2007ء میں ہونے والی غلطیوں اور کوتاہیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ان سے بچنے کی کوشش بھی کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ آپریشن وقت سے پہلے مکمل ہوا۔ حالانکہ بہت سارے لوگ جو طالبان کی سرگرمیوں، قوت اور طاقت، اسلحہ اور مالی امداد کی فراہمی پر نظر رکھے ہوئے تھے ان کا یہ خیال تھا کہ طالبان نہ صرف طویل عرصہ تک مزاحمت کریں گے بلکہ وہ فوج کو بھی ٹف ٹائم دیں گے اور یہ آپریشن کم از کم ڈیڑھ دو سال تک جاری رہے گا۔ لیکن مئی 2009ء میں شروع ہونے والا یہ آپریشن اگست تک بہت ساری کامیابیوں سے ہمکنار ہو چکا تھا۔ چنانچہ بہت سارے ایسے معاملات تھے جن کو نہ صرف حکومت اور سیاستدانوں سے پوشیدہ رکھا گیا کہ گرفتار شدگان کے مقامات کی نشاندہی بھی نہیں ہونے دی گئی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سچائی ہے کہ حکومت نے دہشت گردوں کے خلاف کارروائی کے لیے نئی قانون سازی کے ذریعے ان کی قانونی استحکام سے فائدہ اٹھانے کی کوششوں کے سامنے بھی دیوار کھڑی کر دی جس کی ہر سطح پر حوصلہ افزائی ہوئی۔

آئی ایس پی آر کے 15 اگست 2009ء کو جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق

آپریشن راہِ راست میں اس عرصہ کے دوران سوات میں 1300 جنگجو ہلاک کیے گئے جبکہ 95 سکیورٹی اہلکار جاں بحق ہوئے۔ وزارت داخلہ کی ایک رپورٹ کے مطابق ہلاک شدگان کی تعدد 2000 کے لگ بھگ تھی۔ جبکہ گرفتار افراد کی تعداد بھی تقریباً اتنی ہی بتائی گئی۔ حکومتی ذرائع کے مطابق 24 سے زائد وہ کمانڈرز ہلاک کیے گئے جن کوسواتی طالبان کے تناظر میں عسکری طور پر ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل تھی۔ ان میں ابن عقیل، شاہ دوران، عبدالرحمان، ابواللیث، مرجان شیر محمد، قصاب، ابو جندل، محمد عالم نامی جنگجو بھی شامل تھے۔ جبکہ گرفتار شدگان میں دوسروں کے علاوہ مرکزی ترجمان مولوی عمر، مسلم خان، محمود اور دوسرے شامل تھے۔ اگرچہ ٹاپ کمانڈرز کے لوگ تاحال بچے ہوئے ہیں۔ تاہم 24 کمانڈروں کی ہلاکت نے طالبان سے مزاحمت یا پلاننگ کی صلاحیت چھین کر ان کو لمبے عرصے تک بے دست و پا کر دیا کیونکہ جن لوگوں نے مزاحمت کی کمانڈ کو اپنے ساتھ رکھا تھا وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ جبکہ گرفتار افراد نہ صرف انٹیلی جنس اداروں کو بنیادی معلومات فراہم کرنے پر مجبور ہو گئے بلکہ متعدد فورسز کے ساتھ تعاون پر بھی آمادہ ہو گئے۔

گرفتار افراد کے بارے میں اب کی بار ریاستی اداروں کی حکمت عملی یہ رہی کہ ان کو ایسے مقامات پر رکھا جائے جس کے بارے میں طالبان اور گرفتار شدگان کے رشتہ داروں کے علاوہ حکومت کے حکام کو بھی آگاہی حاصل نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ بتائی جا رہی تھی کہ جگہیں معلوم ہونے کی صورت میں حکومت سمیت دوسرے لوگ ان کی رہائی کے لیے دباؤ بڑھا کر مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ انٹیلی جنس ادارے گرفتار طالبان سے متعلق معلومات کی فراہمی میں بھی ٹال مٹول کا مظاہرہ کر کے راہِ احتیاط برت رہے تھے کیونکہ اس سے قبل فضل اللہ اور صوفی محمد کے ساتھ حکومت کے دو مذاکراتی عمل کے دوران 140 سے زائد طالبان کی رہائی پر بھی حساس اداروں نے شدید تحفظات کا اظہار کیا تھا۔ اس لیے اب کی بار وہ حکومت کو بھی ممکنہ حد تک تمام پراسس سے باہر رکھنے کی پالیسی پر عمل پیرا رہے۔ حکومت نے انتہاپسند کمانڈروں کو قانونی نقائص کے باعث عدالتوں سے بری ہونے کے روایتی سلسلے کا بھی نوٹس لیتے ہوئے اکتوبر کے مہینے میں ایسے افراد کو سخت ترین سزائیں دلوانے کے لیے دہشت گردی سے متعلق ایک جامع مگر سخت آرڈیننس کی تیاری کا بھی فیصلہ کیا۔

سیاسی و عسکری تجزیہ نگاروں کے مطابق فورسز نے حکومت اور عوام کی بھرپور حمایت سے سوات، دیر اور بونیر میں طالبان کی کمر توڑ دی۔ تاہم اب سوال یہ تھا کہ دوسرے ریاستی اداروں کی موجودگی اور فعالیت کو کس طرح ممکن اور یقینی بنایا جائے۔ کیونکہ فوج دوسرے اداروں کے معاملات تو نہیں سنبھال سکتی تھی پولیس کی کارکردگی ایک سوالیہ نشان تھی کیونکہ یہ پولیس ہی تھی جو بعد کے حالات میں امن و امان برقرار رکھ کر لوگوں کو تحفظ فراہم کر سکتی تھی کیونکہ ڈی ایس پی اور ایس ایچ اوز سے لے کر تمام سپاہی تک سوات میں ڈیوٹی دینے سے گریزاں نظر آتے تھے حالانکہ ان کی مراعات میں بھی معقول اضافہ کیا جا چکا تھا اور اس کے نتیجہ میں صوبائی حکومت نے 3 ڈی ایس پیز سمیت اُن درجنوں پولیس اہلکاروں کو نوٹس جاری کر دیئے جو کہ ڈیوٹی دینے میں ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔ سوات میں پولیس تھانوں اور چوکیوں کی تعداد اور نفری میں اضافہ کیا گیا ہر ایک تھانے میں 60 سے 70 تک اہلکاروں کی تعیناتی کی گئی۔ تاہم کبل، چارباغ، مٹہ اور متعدد دوسرے علاقوں میں (تحصیلوں میں) پولیس کو فعال نہیں بنایا جا سکا۔

ایکس سروس مین پر مشتمل 5 ہزار پولیس اہلکاروں کی تعیناتی کا سلسلہ بھی ابھی تک شروع نہیں کیا جا سکا۔ جبکہ پولیس کو ان کے مطالبے کے مطابق جدید ہتھیاروں کی فراہمی کا سلسلہ بھی سست روی کا شکار رہا۔

کمیونٹی پولسنگ کا فارمولہ ناکامی سے دوچار ہوتا دکھائی دیا۔ مقامی لوگ حتیٰ کہ حکمران اے این پی کے کارکن بھی کمیونٹی پولیس فورس میں شمولیت سے گریزاں دکھائی دیئے حالانکہ اس فورس کے لیے نہ صرف یہ کہ مناسب تنخواہ اور مراعات اور سہولتیں دی گئیں۔ بلکہ اس میں شمولیت کے لیے تعلیم و تربیت اور عمر کی حد میں بھی بہت زیادہ مراعات اور سہولتیں دی گئیں۔ سوات سے تعلق رکھنے والے ایک ایم پی اے کے مطابق ان سمیت سب عوامی نمائندوں کو بار بار رابطے کے باوجود اس فورس میں شمولیت کے لیے اپنے کارکنوں یا ضرورت مند افراد کی طرف سے مایوس کن طرزِ عمل کا سامنا رہا۔ ان کے مطابق اس سردمہری کی وجہ یہ ہے کہ عام لوگ طالبان کی مخالفت کے باوجود اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ اسی فورس میں شامل ہونے سے ان کی زندگی خطرے سے دوچار ہو سکتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے

بذاتِ خود 100 کے قریب افراد سے رابطے کیے تاہم جن افراد نے حامی بھری ہے ان کی تعداد 20 سے زائد نہیں حالانکہ مراعات کافی پرکشش تھیں۔

پشاور میں موجود اعلیٰ حکومتی شخصیات کے مطابق کمیونٹی پولسنگ میں لوگوں کی شرکت کا مسئلہ عام پولیس کی فعالیت کے بعد آہستہ آہستہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ ان کو امید ہے کہ آرمی کے آپریشن کی تکمیل سے قبل پوری وادی میں پولیس کو اس قابل بنا دیا جائے گا کہ وہ امن و امان کی بحالی کا فریضہ انجام دے سکے۔ تاہم تجزیہ نگار اور خود پولیس افسران فی الحال اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے۔

محکمہ پولیس کے علاوہ دوسرے اداروں خصوصاً تعلیم، صحت اور قانون کے محکموں سے متعلق افسران اور اہلکاروں کو بھی خوف اور پریشانی کی صورتحال اور نفسیاتی دباؤ کا سامنا رہا۔ محکمہ پبلک ورکس کو ٹھیکیداروں کی سردمہری کا سامنا تھا کیونکہ جن عمارتوں اور پلوں کو اُڑایا گیا ان کی تعداد سینکڑوں میں ہے جبکہ ٹھیکیدار غیر یقینی صورتحال کے باعث کام کرنے میں دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ واپڈا اور ٹیلی کمیونیکیشن جیسے وفاقی اداروں کو بھی مشکلات کا سامنا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ان اداروں کی موجودگی یا سرگرمیاں حکومتی دعوؤں کے باوجود دیر تک نظر نہیں آئیں۔ سوات میں پولیس کے بعد جس شعبے کو بدترین تباہی اور شدید مشکلات کا سامنا رہا وہ محکمہ تعلیم ہے۔ محکمہ تعلیم کے اعداد و شمار کے مطابق ملاکنڈ ڈویژن خصوصاً سوات میں شرپندوں کے ہاتھوں 210 سکول تباہ کیے گئے۔ لڑکوں کے 65 جبکہ لڑکیوں کے 145 سکول مسمار کیے گئے۔ 365 سکولوں کو جزوی نقصان پہنچا۔ ملاکنڈ ڈویژن کے سکولوں میں 9 لاکھ سے زائد طلبا و طالبات زیرِ تعلیم تھے ان کے لیے تعلیم کی ضروریات کی فراہمی اور سکولوں اور اساتذہ کو تحفظ فراہم کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے جس نے حکومت کو بڑی مشکل صورتحال میں ڈال دیا کیونکہ متاثرہ اضلاع میں 7 ہزار خواتین اساتذہ سمیت تقریباً 30 ہزار ٹیچرز فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ حکومت نے یکم اگست سے سکول کھولنے کا اعلان کیا تو نہ صرف یہ کہ اساتذہ بہت سہمے ہوئے تھے بلکہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کو بھی تشویش تھی کہ مبادہ کوئی ناگوار حادثہ پیش نہ آجائے۔ پھر بھی سکول کھول دیئے گے مگر سٹوڈنٹس کی شرح چار، پانچ دن گزرنے کے باوجود 50 فیصد سے زیادہ طلباء کی حاضری نہ

رہی اور اساتذہ بھی نہ صرف غیر حاضر پائے گئے بلکہ بعض کے طالبان کے ساتھ رابطوں کے انکشافات بھی سامنے آ ۔ ئ جس کا صوبائی وزیرِ تعلیم سردار حسین بابک نے اتنا نوٹس لیا کہ ایسے تمام اساتذہ کی مکمل فہرستیں اور معلومات مہیا کرنے کے احکامات جاری کرنے پڑے۔ وزارتِ تعلیم کے مطابق کوائف چیک کرنے کے بعد ایسے اساتذہ کے خلاف سخت ترین کارروائیوں میں نوکریوں سے برخاستگی اور جائیداد کی ضبطگی بھی شامل ہو سکتی ہے۔

محکمۂ صحت کی کارکردگی اور فعالیت بھی نظر نہیں آئی۔ اس کی بنیادی وجہ شاید یہ تھی کہ یہ وزارت پی پی پی کے پاس تھی اور متعلقہ وزیر کو وزارت چلانے سے زیادہ پارٹی کی صوبائی صدارت کے معاملات سے دلچسپی تھی۔ اتنے اہم شعبے کی کارکردگی کے متعلق مالاکنڈ ڈویژن سے بہت سی شکایات دوسرے ریاستی اداروں کو بڑی تعداد میں ملتی چلی آ رہی تھیں اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزیر اعلیٰ کو 25 جولائی کو محکمۂ صحت کی جانب سے ہسپتالوں، ڈاکٹروں اور ادویات سے متعلق شکایات کا سخت نوٹس لینا پڑا۔

حکومت کو اُسی وقت طالبان پر نفسیاتی غلبہ میسر آیا جب سوات میں 14 اگست کے روز جشنِ آزادی کی ایک بڑی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اس تقریب میں وفاقی وزیر قمرالزمان کائرہ، صوبائی وزراء اور علاقے کی ممتاز شخصیت محمد افضل خان سمیت ہزاروں افراد نے شرکت کر کے حکومت پر پورے اعتماد کا اظہار کیا۔ اس تقریب کا انعقاد یقیناً حکومت کے لیے نہ صرف ایک مشکل کام تھا بلکہ اس میں بہت سے خطرات اور پیچیدگیاں بھی حائل تھیں۔ سوات کے عوام، سیاسی کارکنوں اور سرکاری اہلکاروں نے دل کھول کر جشنِ آزادی کی تقریبات میں حصہ لے کر دنیا کو واضح پیغام دیا کہ وہ انتہاپسندوں کے ساتھ نہ تو کوئی وابستگی رکھتے ہیں اور نہ ہی کوئی ہمدردی۔

14 اگست کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے صوبائی وزیر اطلاعات میاں افتخار حسین کا انداز خطاب اور اعتماد طالبان کے لیے یقیناً واضح اشارہ تھا کہ حکومت ان کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی اس تقریر کے دوسرے روز ایک چیک پوسٹ پر حملہ کیا گیا جبکہ تیسرے روز سوات پولیس کے زیرِ تربیت جوانوں پر خودکش حملہ کر کے 17 سے زائد افراد کو شہید کر دیا گیا۔

اس سے قبل اگست 2009ء کو جب یہ انکشاف ہوا کہ تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) کے سربراہ اور دنیا کو مطلوب شخص بیت اللہ محسود ایک امریکی ڈرون حملے کے دوران ہلاک کیے جا چکے ہیں تو خدشہ تھا کہ شاید طالبان 14 اگست کے روز سوات آپریشن اور محسود کی موت پر ردِعمل کا اظہار کرتے ہوئے کوئی بڑی جواب کارروائی کریں گے۔ 15 اگست کو طالبان نے آپریشن راہِ راست کے بعد پہلی دفعہ تحصیل خوازہ خیلہ کی ایک فوجی چیک پوسٹ پر خودکش حملہ کیا جس میں 5 فوجی اہلکار شہید ہو گئے تاہم اس کے جواب میں فورسز نے 16 اور 17 اگست کو انتہائی کامیاب کارروائیوں کی ابتدا کر کے 36 گھنٹے کے دوران 30 کے قریب عسکریت پسندوں کو نرغے میں لے کر ہلاک اور گرفتار کیا جو کہ فورسز کی طرف سے یہ ثابت کرنے کا ایک اقدام تھا کہ طالبان کا پیچھا کرنے کا فیصلہ واقعتاً اٹل اور حتمی ہے۔ 17 اگست کی رات کو صرف مینگورہ سٹی میں ایک درجن سے زائد شرپسندوں کی لاشیں گرائی گئیں اور دوسرے دن کہا گیا کہ ان کو نامعلوم افراد نے مارا ہوگا۔ اس قسم کی کارروائیوں نے امن پسند لوگوں کے دل سے دھماکہ کے بعد پیدا ہونے والے خوف کو کم کر کے ان پر واضح کیا کہ وہ طالبان سے خوفزدہ ہونے کے بجائے حکومت سے تعاون کی پالیسی ہی پر عمل پیرا ہو کر امن کے قیام کو یقینی بنا سکتے ہیں۔

17 اکتوبر 2009ء کو جب وزیرستان میں آپریشن راہِ نجات کا آغاز ہوا تو اس کے بعد سوات میں ماضی قریب کے برعکس طالبان کی سرگرمیوں کا سلسلہ محدود پیمانے پر پھر سے دیکھا گیا۔ اس سے یہ اندازہ لگایا گیا کہ سواتی جنگجو ہلاکتوں اور نقل مکانی کے ساتھ ساتھ اب بھی بعض محفوظ مقامات پر موجود ہیں۔ فورسز نے 17 اکتوبر کے وزیرستان آپریشن کے بعد 17 نومبر تک کے ایک مہینے کے دوران 180 سے زائد افراد گرفتار کیے جبکہ مختلف علاقوں میں اس عرصہ کے دوران 35 سے زائد کو ہلاک کر دیا گیا۔ 10 نومبر 2009ء کو ایک معتبر اخبار میں شائع شدہ رپورٹ کے مطابق آپریشن راہِ راست کے آغاز کے بعد نامعلوم افراد کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے طالبان کی تعداد 10 نومبر تک 300 تک پہنچ گئی تھی۔

17 نومبر 2009ء کو حکومتی اعلانات اور دعوؤں کو اُس وقت شدید دھچکا لگ گیا۔ جب بی بی سی نے کہا کہ فضل اللہ نے خود ان سے رابطہ کر کے دعویٰ کیا ہے کہ وہ نہ صرف

زندہ ہے بلکہ اپنے پلان پر عمل پیرا بھی ہے۔ اس نے دوسروں کے علاوہ سرحد حکومت کے ترجمان میاں افتخار حسین کو سنگین نتائج بھگتنے کی دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ موصوف کا انجام سابق افغان صدر ڈاکٹر نجیب اللہ سے بھی بدتر ہوگا۔ اس خبر نے امن پسند حلقوں کو پھر سے تشویش میں مبتلا کر دیا۔

1- حکومت کے اہم اقدامات اور عوام کی تائید کے باوجود باخبر حلقے اور عوام یہ باور کرنے کو تیار نہیں تھے کہ آپریشن راہِ راست کے نتیجے میں ملاکنڈ ڈویژن سے واقعتاً طالبان اور انتہاپسندوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کی بنیادی وجہ طالبان کی اعلیٰ قیادت کی موجودگی اور ان عناصر کا دوسری جہادی تنظیموں اور القاعدہ کے ساتھ گہرے نظریاتی رابطے اور رشتے تھے جبکہ اس خدشے کی دوسری بڑی وجہ طالبان کی اعلیٰ قیادت کی موجودگی اور بعض علاقوں میں ان کی موثر مزاحمت بھی تھی فورسز نے مختلف کارروائیوں کے دوران 200 سے زائد ان کم عمر بچوں کو بازیاب کر کے اپنی تحویل میں لے لیا جو کہ ان کے بقول طالبان زبردستی لے کر لڑانے کے لیے لے گئے تھے۔ طالبان کے خوف کا یہ عالم تھا کہ ان بچوں کے والدین اور رشتہ دار ان کو گھر لانے سے بھی گریزاں تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ طالبان ان بچوں کو مناسب وقت دیکھ کر انتقام کا نشانہ بنا سکتے ہیں۔ پولیس فورس کی غیر فعالیت، امن کمیٹیوں کے قیام سے عوام کی ہچکچاہٹ اور کمیونٹی پولسنگ عین عوام کی عدم شرکت وہ اشارے تھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ طالبان کا خوف اور ان کی موجودگی اب بھی برقرار ہے۔ اس حقیقت کو نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ اگر 2000 مارے گئے ہیں اور اتنے ہی گرفتار ہیں تو باقی جنگجو کہاں چلے گئے۔ مصدقہ اطلاعات کے مطابق سوات کے رجسٹرڈ طالبان کی تعداد 10 ہزار سے زائد تھی۔ اس تعداد میں ان کے حامی شامل نہیں تھے۔ جس سے یہ اندازہ بھی لگایا جاتا ہے کہ آدھے سے زائد جنگجو یا تو محفوظ مقامات پر پناہ لیے ہوئے ہیں یا وہ ایک حکمت عملی کے تحت دوسرے علاقوں کو منتقل ہو گئے ہیں۔ وہ فورسز اور حکومت کا دباؤ کم ہونے کی صورت میں دوبارہ حملہ آور ہو سکتے ہیں یہ امکان اس حوالے سے یقین میں تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ افغانستان اور فاٹا کے طالبان ماضی میں ایسا کرتے آئے ہیں شاید انہیں خدشات اور اسباب کا نتیجہ تھا کہ بعض امریکی شخصیات کے علاوہ واشنگٹن پوسٹ اور نیویارک ٹائمز جیسے اخبارات

بھی اس امکان کو بار بار مٹاتے نظر آئے کہ پاکستانی طالبان کے خاتمے کو اس وقت تک یقینی نہیں کہا جا سکتا جب تک ان کی اعلیٰ قیادت کو مارا نہیں جاتا جبکہ بعض ذرائع یہ بھی دعویٰ کرتے رہے کہ اعلیٰ طالبان قیادت آئی ڈی پیز کی منتقلی کے دوران بھیس بدل کر صوبہ سرحد کے دوسرے اضلاع خصوصاً شانگلہ، مانسہرہ، کالا ڈھاکہ، صوابی، مردان، نوشہرہ اور پشاور منتقل ہو گئی تھی جبکہ بعض کے بارے میں اطلاعات تھیں کہ وہ قبائلی علاقہ جات اور وہاں سے افغانستان منتقل ہو چکے ہیں۔

فضل اللہ پاک فوج سے مخاطب

ملاکنڈ ڈویژن خصوصاً سوات میں گزشتہ چند برسوں (2007ء) سے مولانا فضل اللہ کی قیادت میں پاکستانی تاریخ کی بدترین جنگ لڑی گئی۔ اس مزاحمت نے پاکستان کے ریاستی ڈھانچے کو ہلا کر رکھ دیا تو پاکستانی سیاست اور عسکری قیادت نے ملکی سلامتی کی خاطر ریاست وحکومت کے لیے چیلنج بن جانے والی قوت کے خاتمے کے لیے 10 مئی 2009ء کو ایک بھرپور آپریشن کا آغاز کر دیا جو کہ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہونے کے بعد ایک نئی منصوبہ بندی کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ مولوی فضل اللہ اور ان کے دوسرے ساتھی کمانڈر فورسز کے خلاف ممکنہ حد تک لڑائی بھی لڑ رہے تھے۔ اس دوران متعدد بار ان کی ہلاکت اور زخمی ہونے کی اطلاعات بھی ملتی رہیں، تاہم یہ اطلاعات تصدیق کا مرحلہ طے نہ کر سکیں۔ 23 جولائی 2009ء کو مولوی فضل اللہ کی ایک آڈیو میڈیا کے ذریعے منظر عام پر آ گئی تو ثابت ہوا کہ موصوف نہ صرف زندہ ہیں بلکہ وہ شریعت کے نفاذ تک لڑنے کا عزم بھی ظاہر کر رہے ہیں۔ اسی روز ان کے ترجمان مسلم خان بھی کئی روز کی غیر حاضری کے بعد منظر عام پر آ گئے۔

یہاں ہم مولوی فضل اللہ کی تقریر کسی تنقیح یا کانٹ چھانٹ کے بغیر قارئین کی خدمت میں پیش کرنے جا رہے ہیں جو کہ انہوں نے پیوچار کیمپ پر پاکستانی فضائیہ کے ایک بڑے حملے کے بعد ریکارڈ کروائی تھی۔ ان کی یہ تقریر محض قارئین کی دلچسپی تک محدود رہنے والی چیز نہیں بلکہ یہ ان اہم لوگوں کے لیے بھی بھرپور توجہ اور تشویش کا سبب بن سکتی

ہے جو کہ پاکستانی ریاست، اس کی فوج اور اس کے مستقبل پر نظر رکھے ہوئے ہیں اور جاننا چاہتے ہیں کہ مولوی فضل اللہ اور ان جیسے دوسرے لوگ کیا سوچ رہے ہیں یا کیا کرنا چاہتے ہیں۔

''میرے بھائیو اور بہنو! میں آج پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ جو میزائل پھینکے جا رہے ہیں۔ ان کا نشانہ کون لوگ بن رہے ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو کہ ایماندار ہیں۔ خدا کی زمین پر اس کا نظام چاہتے ہیں اور اللہ کے نام پر غیرت کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر ہم نے ظالم کا ہاتھ نہیں روکا اور ظالم کے خلاف متحد نہیں ہوئے تو قیامت کے روز اللہ کو کیا جواب دیں گے؟

ان بدمذہب حکمرانوں کی نظر میں تو ہم ہندوؤں سے بھی بدتر ہیں۔ یہ حکمران اور فوجی یہ میزائل ہندو، سکھ، انگریز اور روس کے بجائے ہم پر داغ رہے ہیں۔ جن لوگوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے ان کا قصور صرف یہ ہے کہ اللہ کی زمین پر اللہ کا نظام قائم ہو۔ یہ فوجی گھروں میں بچوں، بوڑھوں، خواتین اور بے زبان جانوروں پر بمباری کر رہے ہیں۔ یہ قرآن اور دوسری مقدس کتابوں اور مساجد پر بمباری کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب دہشت گرد اور مجرم ہیں؟ وقت آ گیا ہے کہ علماء کرام میدان میں نکل کر اسلام کی رو سے اپنی آواز بلند کر کے شرعی فریضہ انجام دیں۔

میں علماء سے پوچھتا ہوں کہ وہ نبیؐ کے منبر پر بیٹھ کر یہ واضح کیوں نہیں کرتے کہ کون ظالم ہیں اور کون مظلوم۔ کیا ان کو اس روز کا خوف نہیں جب اللہ ان سے پوچھے گا کہ انہوں نے مظلوم مسلمانوں کا ساتھ کیوں نہیں دیا؟ یہ علماء یہ کیوں بھول گئے ہیں کہ ظالم اور جابر کے سامنے کلمہ حق کہنا ان کے فرائض میں شامل ہے۔ کیا موجودہ حکمرانوں سے بڑے ظالم اور کوئی ہیں؟

بھائیو اور بہنو! یہ وہ فوج ہے جس نے 90 ہزار کی تعداد میں وردیوں اور بندوقوں کے ہمراہ ہندو کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ انہوں نے کارگل میں شکست کھائی اور ہمارے تین دریا ہندو کے حوالے کر دیئے۔ یہ دوسروں سے نہیں لڑ سکتے۔ یہ ہمارے لیے بہادر ہیں۔ ہم نے ان کو اپنے خون پسینے کی کمائی سے پال کر اس لیے بڑا کیا ہے کہ یہ مساجد اور معصوم

مسلمانوں پر بمباری کریں گے۔ یہ ہے ہمارے احسانات اور قربانیوں کا صلہ......؟

آج ثابت ہو گیا کہ انگریز تو چلا گیا مگر اس نے میراث میں ہمیں اس فوج کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ آج اس کا اسلام دشمن اور عوام دشمن کردار سب کے سامنے ہے۔

جن علماء نے علم حاصل کیا ہے۔ آج وہ کہاں ہیں؟ میں پوچھتا ہوں کہ وہ اس ظالم فوج اور حکمرانوں کے خلاف فتویٰ جاری کیوں نہیں کرتے۔ کیا ہمارے حق میں آواز اٹھانا ان کے فرائض میں شامل نہیں؟ کیا یہ اللہ کا ارشاد نہیں کہ جو بھی تم سے میرے نام پر مدد طلب کرے، اس کا ساتھ دو؟

یہ علماء ہمیں بتائیں کہ اگر ہم کوئی غلط کام یا مطالبہ کر رہے ہیں تو دلائل سے اس پر ہماری رہنمائی کریں۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ہم حق پر ہیں اور اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ ہمارے لیے شیخ الاسلام سید ابن تیمیہ کا وہ فتویٰ ہی کافی ہے جو کہ انہوں نے اس قسم کے ظالم مسلمان حکمرانوں کے بارے میں دیا تھا۔

آج جن لوگوں کے بچے شہید ہو رہے ہیں۔ جن کی جائیدادیں، کھیت اور املاک تباہ ہو رہی ہیں۔ میں ان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ یہ ان پر اللہ کی آزمائش کا ایک مرحلہ ہے۔ وہ صبر کریں۔ اس کا ان کو صلہ ملے گا۔ چونکہ آپ سچے اور ایماندار مسلمان ہو اس لیے اللہ نے آپ پر یہ آزمائش ڈال دی ہے۔ اللہ کے نبیؐ کا فرمان ہے کہ آخری زمانے میں اچھے اور برے مسلمان کا فرق آزمائش، قربانی اور صبر کے دوران واضح ہو گا۔

ہم انسان ہیں۔ ہم سے دسیوں غلطیاں ہوئی ہوں گی۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا ہم حق پر ہیں۔ اگر ہم حق پر نہ ہوتے تو ان جیٹ طیاروں اور میزائلوں کا مقابلہ نہ کرتے۔ اے کاش کہ ان طیاروں کا رخ امریکہ اور ہندوستان کی طرف ہوتا......

بھائیو اور بہنو! یہ تو وہ کہانی ہوگئی کہ ایک خان نے اپنے نوکر کو قصاب کو مارنے بھیجا۔ اس نے جا کر جب قصاب کے ہاتھ میں چھری دیکھی تو گھبرا گیا اور ساتھ بیٹھے سبزی فروش کو مار ڈالا۔ خان نے ایسا کرنے کی وجہ پوچھی تو نوکر نے کہا، میں بھلا اس قصاب کو کیسے مار سکتا تھا جس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ یہ کہانی پاکستانی فوج کے کردار پر بالکل پوری اترتی ہے کہ نہیں؟

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فوج اسلام کے دشمن سے ڈرتی ہے۔ اس لیے ہم پر ٹوٹ پڑی ہے۔ یہ مندر اور کلیسا کی بجائے مسجدوں پر ٹوٹ پڑی ہے۔ یہ ہر اس مسلمان کو شہید کرنے نکلی ہے جو کہ اسلام اور شریعت کی بات کرتا ہے۔ پاکستان کے مسلمان اور بہت سے علماء محض شناختی کارڈ کی حد تک مسلمان رہ گئے ہیں۔ ان سب کے ایمان ٹوٹ گئے ہیں۔ کوئی بھی محض شناختی کارڈ میں خود کو مسلمان کہنے یا کلمہ پڑھنے سے صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتا۔ علماء خاموش کیوں ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟

بہنو! یا در بھائیو اور بچو! مجھے ابوجہل، فرعون، قارون اور مشرف، زرداری، گیلانی اور کیانی میں کوئی فرق دکھائی نہیں دے رہا۔ مجھے امریکی، ہندوستانی اور پاکستانی فوج میں بھی کوئی فرق نظر نہیں آ رہا۔ یہ سب اسلام کے دشمن اور مرتدین ہیں۔ ان سب نے قرآن اور اسلام کے خلاف بندوق اٹھائی ہوئی ہے۔ ان کے خلاف لڑنا ہمارا فرض ہے۔ اس بمباری اور ظلم سے ثابت ہوا ہے کہ اس پاکستان میں سب سے بڑا جرم اسلام کے نفاذ کا مطالبہ اور جدوجہد ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر آج نبی کریمؐ اور ان کے صحابہ کرامؓ اسلام کی سربلندی کی بات کرنے آ جائیں تو کیا یہ ظالم ان پر بھی بمباری کریں گے؟ بے شک یہ ایسا ہی کرنے والے لوگ ہیں۔

بھائیو اور بہنو! آج ہم حق پر ہیں۔ اس لیے ہم جیت کر سرخرو ہو رہے ہیں۔ ہم خالی ہاتھ ان کے میزائلوں، گولیوں اور ٹینکوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ جس الخالد ٹینک پر یہ فخر کرتے ہیں، ہم نے ان ٹینکوں کے پرخچے اڑا دیئے ہیں۔ ہم نے ان ٹینکوں میں بیٹھے کمانڈوز کو جہنم بھیج دیا ہے۔ ان کے جسموں میں قبر سے قبل ہی کیڑے پڑے گئے ہیں۔ یہ لوگ مرے نہیں مُردار ہو گئے ہیں۔ ملائکہ (فرشتوں) نے خود اپنے ہاتھوں ان کو چابک مارے ہیں۔ یہ شریعت کے متوالوں کو مغلوب کرنے آئے تھے، ہم ان کو اب شہید کافر کہہ کر پکارتے ہیں۔

میں نے ان کو چیلنج کیا تھا کہ چلو میں اپنے مرے لوگوں کو نکالتا ہوں۔ آپ اپنے سپاہی قبر سے نکال کر لے آؤ جن میں کیڑے پڑے ہوں گے وہ کفر پر ہوگا اور دوسرا حق پر

شہید ہوا ہوگا۔ آ جائیں آج دونوں کا موازنہ کر ہی لیتے ہیں۔ ان میں کیڑے اس لیے ہوں گے کہ ان کا امیر بش اور کمانڈر کیانی ہے جبکہ ہمارا امیر پیغمبر اسلام اور کمانڈر ہر باایمان مسلمان ہے۔ اب یہ لوگوں پر منحصر ہے کہ وہ بش کے ساتھیوں کا ساتھ دیتے ہیں یا محمدؐ کے علمبرداروں کا!

ہم کمزور، بے بس، غریب اور اسلحہ سے محروم فدائین کفر کی ان قوتوں پر حاوی تھے، ہیں اور رہیں گے۔ یہ محض اللہ کی نصرت کا نتیجہ ہے کہ یہ مغلوب ہو رہے ہیں۔''

مولوی فضل اللہ کی اس تقریر میں بہت سارے سوالات نمایاں ہیں جن پر معمولی توجہ مرکوز کرنے سے بھی بہت کچھ سمجھ میں آ سکتا ہے۔ مولوی فضل اللہ

O......اسلام کے ایک مخصوص مکتبہ فکر میں مذہب کو استعمال کرتے ہوئے علمائے کرام کو بھی اپنی حمایت کی دعوت دے رہے ہیں۔

O......ان کے نزدیک حکمران بدمذہب اور وہ بقول ان کے مذہب کی بالادستی کے لیے لڑنے والوں کو غیر مسلموں سے بھی بدتر سمجھتے ہیں لیکن ان کا دعویٰ ہے کہ ہم ہی ''ایماندار'' ہیں اور ہم ہی حق پر ہیں۔

O......ہم ''خدا کی زمین'' پر خدا کا نظام چاہتے ہیں۔ گویا صرف پاکستان میں ہی نہیں پوری دنیا میں...... یہی نقطہ نظر القاعدہ کا بھی ہے۔

O......ان کا دعویٰ ہے کہ گھروں میں بچوں، بوڑھوں اور عورتوں پر بمباری کرنے والے، مساجد میں مقدس کتابوں کو نشانہ بنانے والے دہشت گرد اور مجرم ہیں (جن کو سزا دینا ضروری ہے) اور ان کے خلاف آواز بلند کرنا شرعی فریضہ ہے۔

O......پاکستان کی فوج ایک بزدل اور شکست خوردہ فوج ہے جس نے ہندو کے سامنے ہتھیار پھینک دیئے۔ یہ دوسروں کے خلاف تو لڑ نہیں سکتی لیکن اپنوں کے لیے بہادر بنی ہوئی ہے اور یہ فوج اسلام اور عوام کی دشمن ہے۔

O......انہیں موجودہ علماء کی حمایت کی ضرورت نہیں۔ ان کے لیے پہلے سے موجود فتاویٰ ہی کافی ہیں۔ جو علماء ان کی حمایت نہیں کرتے ان کے ایمان ٹوٹ چکے ہیں۔

O......انہیں ابوجہل، فرعون، قارون اور مشرف، زرداری، گیلانی اور کیانی میں کوئی فرق نظر نہیں

آ تا۔ یہ سب اسلام کے دشمن اور مرتد ہیں یعنی مرتدین کی سزا موت ہے اور ان کے خلاف لڑنا جائز ہے۔

O..... جو لوگ فورسز کے ساتھ مل کر لڑ رہے ہیں وہ جہنمی ہیں اور ان کی لاشوں میں کیڑے پڑ چکے ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ وہ دعویٰ بھی قابل توجہ ہے کہ جس میں الخالد ٹینکوں کو اڑانے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر سوال تو یہ بھی ہے کہ آخر ان کے پاس وہ ٹیکنالوجی اور ہتھیار کہاں سے آئے؟؟ یہ دعویٰ تو ایک اعتراف بھی ہے۔ تاہم وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم اسلحہ سے محروم، بے بس اور کمزور ہیں! کیسے؟؟

✿ ✿ ✿ ✿

فورسز پر ماورائے قانون ہلاکتوں کے الزامات

ضلع سوات میں فوجی آپریشن ''راہ راست'' کی کامیابی کے باوجود علاقے میں ماورائے قانون، ماورائے عدالت ہلاکتوں نے نہ صرف حکومت اور فورسز کی نیک نامی کو دھچکا لگایا بلکہ نامعلوم قوتوں یا افراد کی جانب سے درجنوں افراد کی ہلاکتوں اور لاشوں کو گنجان آباد علاقوں میں پھینکنے کے واقعات نے کئی سوالات کو جنم دیا۔ 26 اگست کو تحصیل چارباغ کے علاقہ بنجوٹ (Banjot) اور سیر تیلگرام (Ser Talegram) میں 29 لاشیں سڑکوں، گلیوں اور بازاروں میں پائی گئیں۔ ان میں سے بعض لاشوں پر ایسی چٹیں بھی لگی ہوئی تھیں جن پر لکھا گیا تھا کہ دہشت گردوں کا یہی انجام ہونا چاہیے۔

مصدقہ اعداد و شمار کے مطابق 25 جولائی سے 26 اگست کے ایک مہینے کے دوران سوات کے سب سے بڑے شہر مینگورہ کے علاوہ سیدوشریف، کانجو، ڈھیرئی، چارباغ، منگلور، خوازہ خیلہ اور باغ ڈھیری میں مجموعی طور پر 150 سے زائد لاشیں پھینکی گئیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ طالبان تھے۔ اس کے علاوہ تحصیل کبل کے علاقوں دیولئی، شاہ ڈھیری اور کبل میں بعض اجتماعی قبروں کی نشاندہی بھی کی گئی۔ ایک نقطہ نظر کے مطابق ایسا اس لیے کیا گیا کہ وہ لوگ جو طالبان کے خوف میں مبتلا ہیں، ان لاشوں کے ذریعے اس خوف سے باہر نکل آئیں اور فورسز کی حمایت کریں اور وہ لوگ جو طالبان سے ہمدردی رکھتے ہیں، ان کے انجام سے عبرت حاصل کرتے ہوئے آئندہ محتاط رویہ اختیار کریں۔

آپریشن کے ابتداء ہی سے سوات میں اس قسم کے واقعات بین الاقوامی میڈیا کے توسط سے رپورٹ ہوتے رہے کہ فورسز نے نہ صرف مبینہ طالبان کو گرفتاریوں کے بعد غیر قانونی طریقے سے ٹھکانے لگایا بلکہ 28 روز کے ابتدائی مسلسل کرفیو کے دوران 100 سے زائد ایسے افراد کو بھی گولیوں کا نشانہ بنایا گیا جو کرفیو سے تنگ آ کر سودا وغیرہ لینے یا ہسپتال جانے کے لیے گھروں سے نکلے تھے۔ ہلاک شدگان میں درجنوں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کی دماغی حالت ٹھیک نہیں تھی اور وہ کرفیو سے لاپروا ہو کر سڑکوں پر نکل آتے تھے۔ باغ ڈھیری سے تعلق رکھنے والے حماد نے بتایا کہ جون کے آخری ہفتے میں مدین سے تعلق رکھنے والے تین افراد کو اس وقت کوئی وارننگ دیئے بغیر بہت دور سے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا جب وہ مٹہ بازار سے آٹا خرید کر مدین جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

خوازہ خیلہ کے ایک رہائشی غفران احمد کے مطابق انہوں نے جون ہی کے مہینے میں مینگورہ کے علاقے فضاگٹ اور سنگھوٹہ میں ایک ہیلی کاپٹر سے دو مبینہ طالبان کو پھینکتے دیکھا تھا۔ اس کے مطابق یہ دو واقعات دیکھ کر وہ تین روز تک بخار میں مبتلا رہا کیونکہ وہ بہت زیادہ خوفزدہ ہو گیا تھا۔ فورسز نے رابطے پر اس قسم کی اطلاعات کو غلط قرار دیا۔

تحصیل خوازہ خیلہ کے علاقہ چمتلئی سے تعلق رکھنے والے ایک سکول استاد نے نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر بتایا کہ چمتلئی میں انہوں نے اپنے ایک بھائی کو جو کہ محض طالبان کا حامی تھا، راضی کر کے خوازہ خیلہ میں موجود فوجی حکام کے حوالے کیا، تاہم چند روز بعد ان کو بھائی کی لاش مل گئی اور پوچھنے پر بتایا گیا کہ فورسز کی تحویل سے بھاگتے وقت گولی کا نشانہ بنا تھا۔ یہ واقعہ ایک پولیس اہلکار کی ہلاکت کے بعد پیش آیا جس کو طالبان نے ہلاک کر دیا تھا۔

عوام نے فورسز کے ہاتھوں گرفتار افراد کے ساتھ روا رکھے گئے اس سلوک کو بھی وقتاً فوقتاً تنقید کا نشانہ بنایا۔ تاہم فورسز اور حکومت کا کہنا تھا کہ قانون اور عدالتی نظام میں بعض بنیادی نقائص کی موجودگی کے باعث گرفتار افراد کو اس وقت تک تحویل میں رکھا جائے جب تک سخت قوانین نافذ نہیں کیے جاتے۔ نامعلوم افراد یا قوتوں کے ہاتھوں مبینہ طالبان کی ہلاکتوں کا سلسلہ مینگورہ سٹی ہی سے شروع ہوا تھا۔ طالبان کی پسپائی کے بعد اس مقبول عام چوک یعنی گرین چوک میں ایسی لاشیں دیکھنے کو ملیں جہاں آپریشن سے قبل

طالبان اپنے مخالفین کی لاشیں پھینک دیا کرتے تھے۔ ابتداء میں فورسز اور حکومت کا موقف تھا کہ ان کارروائیوں کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جن کے رشتہ داروں کو طالبان نے ایسے ہی انتقام کا نشانہ بنایا تھا، تاہم بعد میں یہ سلسلہ دوسرے علاقوں تک پھیلتا گیا اور اس عمل پر عام لوگوں کے علاوہ انسانی حقوق اور سول سوسائٹی کی تنظیمیں بھی تشویش کا اظہار کرتی رہیں جبکہ اُدھر سے سواتی طالبان کے ترجمان مسلم خان نے 24 اگست کو انسانی حقوق کی کئی تنظیموں سے رابطے کر کے ان سے ان ہلاکتوں پر احتجاج کرنے کی درخواست کی تھی جس کا نوٹس بھی لیا گیا۔ ان ماورائے عدالت کارروائیوں میں 15 اگست کے بعد اس وقت اضافہ ہوا جب شرپسندوں نے جشن آزادی کی تقریب کے دوسرے روز تحصیل خوازہ خیلہ کے علاقے ولی آباد میں موجود چیک پوسٹ پر خودکش حملہ کیا جس پر بعض لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ سوات پولیس نے بھی بعض علاقوں میں کچھ طالبان کو گرفتاری کے بعد گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ اس ضمن میں تحصیل مٹہ کے ایک گاؤں سمبٹ (Sambat) میں مٹہ پولیس نے ایک گرفتار طالب کو کھلے عام گولی مار کر ہلاک کیا جبکہ انہی دنوں کے دوران خوازہ خیلہ میں نامعلوم افراد کے ہاتھوں مارے گئے چارباغ کے ایک طالب کی لاش کو اٹھانے کی اجازت نہیں دی گئی اور وہ نعش 24 گھنٹے تک ایک چوک میں پڑی رہی۔

وزارت داخلہ صوبہ سرحد نے اگست کے وسط میں ایک مراسلے کے دوران دوسرے صوبوں کو 118 ان طالبان کی فہرست بھجوا دی جن کے بارے میں کہا گیا کہ وہ ریاستی اداروں کو مطلوب ہیں۔ تاہم یہ بھی کہا گیا کہ ممکن ہے کہ یہ طالبان دوسرے علاقوں یا صوبوں میں جا چکے ہوں جس کا مطلب یہی لیا گیا کہ یہ یا تو مسنگ پرسنز ہو سکتے ہیں یا ان کو انہی طریقوں سے ٹھکانے لگایا جا چکا ہے۔ حکومت اور آئی ایس پی آر کا موقف تھا کہ عام شہری ہی ان واقعات کے ذمہ دار ہیں اور وہ طالبان سے انتقام اپنی روایت کے مطابق لیتے ہیں جس میں فورسز کا کوئی عمل نہیں۔ تاہم آزاد ذرائع اس دعوے کو غلط قرار دے کر یہ موقف اپناتے تھے کہ چونکہ سوات میں بونیر یا دیر کی طرح امن لشکر یا جرگے کا کوئی وجود ہے ہی نہیں اس لیے انفرادی طور پر 100 سے زائد طالبان کا مار دینا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔

ایک حساس ادارے کے ایک آفیسر نے رابطے پر راقم کو بتایا کہ اس سے قبل کیے

گئے آپریشن کے دوران فورسز نے 170 مطلوب ترین طالبان کو گرفتار کیا تھا، تاہم اے این پی اور صوفی محمد کے درمیان کیے گئے معاہدے کے بعد ان میں سے 110 کو رہائی دلائی گئی جنہوں نے دوبارہ کارروائیاں شروع کیں جبکہ بعض کو عدالتوں نے رہا کر دیا۔ اس لیے اس بات کا امکان موجود ہے کہ فورسز یا عوام ایسے تجربے کو سامنے رکھ کر رعایت دینے سے گریزاں ہوں۔ ان کے مطابق اس عمل میں اے این پی ملوث ہوسکتی ہے کیونکہ طالبان نے اس پارٹی کے 100 سے زائد ارکان کو مارا تھا اور اے این پی نے بعض کارکنوں میں مزاحمت کے لیے اسلحہ بھی تقسیم کیا تھا۔

اے این پی کے ایک رکن اسمبلی کے مطابق جن افراد کو مارا گیا وہ سب کے سب طالبان تھے اور یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ کسی بھی نامعلوم گروپ، فورس یا شخص نے کسی بے گناہ کو مارا ہوگا۔ حکومت کے ذمہ دار افراد ان ہلاکتوں پر ردعمل ظاہر کرنے سے گریز کرتے دکھائی دیئے۔ تاہم عام لوگ اس عمل کو تشویش اور خوف کی نظر سے دیکھ کر اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے پائے گئے۔ ستمبر 2009ء کے دوران اس وڈیو پر بھی شدید ردعمل سامنے آیا جس میں فوجی اہلکار ایک شخص کو بدترین تشدد کا نشانہ بناتے دکھائی دیئے۔ ڈی جی آئی ایس پی آر اطہر عباس نے میڈیا کو یقین دلایا کہ ذمہ دار افراد کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔ تاہم کارروائی کی تفصیلات منظر عام پر نہیں آسکیں۔ ان کہانیوں اور واقعات کی تصدیق کا کوئی مصدقہ اور مستند طریقہ کار سامنے نہیں آیا کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب سوات اور مالاکنڈ میں ذرائع ابلاغ کو براہ راست معلومات سے دور رکھا گیا تھا۔ صرف وہی اطلاعات سامنے آتی تھیں جو یا تو ''سوات میڈیا سیل'' فراہم کرتا تھا جو اکثر فوجی کارروائی اور اس میں حاصل ہونے والی کامیابیوں پر مبنی ہوتی تھیں۔ دوسرا ذریعہ عام لوگ تھے جو ان علاقوں میں موجود تھے۔ ایسی تمام خبروں اور واقعات کا ذریعہ بھی یہی عام لوگ تھے جن میں ممکن ہے کہ کچھ سنی سنائی باتیں بھی ہوں یا پھر یہ طالبان کے پروپیگنڈہ کا نتیجہ ہو لیکن اس کے باوجود سچائی تو یہ ہے کہ دھول وہیں سے اٹھتی ہے جہاں مٹی کے ڈھیر موجود ہوں۔ ان واقعات میں اگر سو فیصد سچائی موجود نہیں تو کچھ نہ کچھ عنصر سچائی کا بہرحال موجود ہے۔ اگر عام لوگوں نے پشتون روایات کے تحت اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کے طالبان کے ہاتھوں

ظلم کا نشانہ بننے کا انتقام لیا تھا تو اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ طالبان نے بھی فورسز اور دیگر اداروں کے افراد کے خلاف کوئی دوستانہ سلوک تو نہیں کیا تھا۔ چنانچہ ان میں جذبۂ انتقام کا ابھرنا بھی ایک فطری عمل تھا جس کی ان مناظر سے نشاندہی کی گئی...... لیکن اس سے بھی بڑا سچ تو یہ ہے کہ...... جنگ میں دونوں طرف سے ہی سب کچھ جائز سمجھا گیا تھا۔

ترقی کے حوالے سے پاک افغان تقابلی جائزہ

افغان شناس شاعر علامہ محمد اقبال نے افغانستان کو ایشیا کا دل کہہ کر اپنی بصیرت کی بنیاد پر کیا خوب کہا تھا کہ اگر یہ دل پریشانی اور تکلیف سے دوچار ہوگا تو اس کا درد اور اثرات پورے ایشیا میں محسوس کیے جائیں گے۔ آج افغانستان پوری دنیا کی تشویش، فکرمندی اور دلچسپی کا مرکز بنا ہوا ہے اور اب کی بار تو اس کی اہمیت اور اس سے متعلقہ معاملات صرف ایشیا تک محدود نہیں رہے بلکہ پوری دنیا اس ریاست کے اثرات کی زد میں آچکی ہے۔ 1978ء کے بعد اس بدنصیب ملک نے اتنی جنگیں برداشت کیں کہ اگر کوئی دوسرا ملک ہوتا تو شاید آج اس کا روئے زمین پر نام و نشان بھی نہ ہوتا۔ یہ ملک اپنوں کے علاوہ دوسروں کی سازشوں اور ظلم و ستم کا جس طریقے سے شکار ہوتا آیا ہے۔ اس کی مثال انسانی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ افغانستان کی جغرافیائی سرحدوں میں تمام تر سازشوں اور لڑائیوں کے باوجود ایک انچ کی بھی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور یقیناً اس کا تمام تر کریڈٹ افغان عوام اور ان کی لیڈرشپ ہی کو جانا چاہیے جنہوں نے اختلافات کے باوجود اپنی مٹی کا دفاع کیا ہے۔

افغان عوام نے امریکی اور اتحادی فوجی قوتوں کی مداخلت اور القاعدہ کی چھتری تلے بے شمار ملکی اور غیر ملکی جہادی قوتوں کی موجودگی کے باوجود نہ صرف یہ کہ اپنے ملک کی سلامتی کو تا حال یقینی بنایا ہوا ہے بلکہ ان تمام قوتوں کو ایک سیاسی حکمت عملی اور خاموش

سفارتکاری مکالمے کے ذریعے اپنی سرزمین سے باہر نکلنے کے ممکنہ راستے بھی ڈھونڈ نکالنے شروع کر دیئے ہیں۔ زمینی حقائق تو یہ ہیں کہ اگر افغان عوام اور ان کے حقیقی نمائندے امریکہ کی مداخلت پر خوش نہیں ہیں تو دوسری طرف وہ القاعدہ اور دوسری تنظیموں کی موجودگی اور عمل دخل کو بھی تشویش کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال حزب اسلامی کے ترجمان غیرت بہیر کا وہ سفارتی مشن ہے جس کے دوران انہوں نے یورپ کو باور کرایا کہ امریکہ اور اس کے اتحادی ایک باعزت طریقے سے افغانستان سے نکلنے پر آمادہ ہوں تو حزب اسلامی سمیت تمام افغان گروپ اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ القاعدہ اور دوسری غیرملکی تنظیمیں بھی افغانستان سے نکل جائیں گی۔ ایسے اشارے بعض افغان طالبان کی جانب سے بھی ملتے رہے ہیں کہ امریکہ اور القاعدہ دونوں سے افغانستان کو چھٹکارا دلایا جائے۔ پاکستانی تجزیہ نگاروں کے مقبول عام رویئے کے برعکس اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ اگر اتحادی قوتیں افغانستان کی جنگ نہیں جیت سکتیں تو القاعدہ اور طالبان کے لیے بھی بزور قوت اتحادیوں کو نکالنا اور وہاں اپنی حکومت قائم کرنا ممکن نہیں ہے۔ موجودہ صورتحال میں اگر اتحادی نہیں جیت رہے تو مزاحمت کار افغان گروپ بھی جیتنے کی پوزیشن میں نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ فریقین نہ چاہتے ہوئے بھی ایک خاموش مگر موثر سفارتکاری کے ایک فارمولے پر کام کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔

افغانستان کے بارے میں پاکستانی میڈیا اور اس کے تجزیہ نگار بہت سے حقائق اور تبدیلیوں سے صرف نظر کر کے ان کروڑوں افغان باشندوں کو مسلسل نظرانداز کرتے آئے ہیں جو کہ افغانستان کے حقیقی مالک کہلاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہ افغانستان میں رہتے ہوئے نہ صرف یہ کہ اس ملک کی تعمیر وترقی میں لگے ہوئے ہیں بلکہ انہوں نے اس ملک میں منعقدہ دو بڑے اور نمائندہ انتخابات کے انعقاد کے دوران تمام تر خطرات، دھمکیوں اور تحفظات کے باوجود بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہوئے عملاً یہ پیغام دیا کہ افغان عوام پر حکمرانی کرنے کے فیصلے کا حق بیرونی قوتوں اور تنظیموں کے بجائے افغان عوام ہی کو حاصل ہونا چاہیے۔ 2009ء کے حالیہ انتخابات کے دوران طالبان کی دھمکیوں کے باوجود ہلمند اور قندھار سمیت پورے افغانستان میں عوام (خواتین سمیت) نے ووٹ دے کر اپنی جمہوریت

پسندی کی نئی مثال قائم کر دی ہے۔ پاکستان کے تجزیہ نگار جس حامد کرزئی کو مغرب کا کٹھ پتلی کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں اسی حامد کرزئی نے بے جا مداخلت اور منفی رویئے کے باعث افغانستان اور پاکستان کے لیے امریکی وائسرائے رچرڈ ہالبروک کو ایک ملاقات کے دوران اس کی اوقات کچھ اس انداز سے یاد دلائی کہ ہالبروک کے گارڈز کو میٹنگ کے دوران اندر جا کر وائسرائے موصوف کی خیریت دریافت کرنا پڑی۔ اسی حامد کرزئی نے امریکی خواہشات کے برعکس طالبان، حزب اسلامی اور دوسری تنظیموں سے رابطے رکھ کر ان کو ایک قابل عمل امن فارمولے پر آمادہ کرنے کی مہم چلائی اور غیرت بہیر جیسے شخص کو واضح موقف اختیار کرکے ان کو باعزت طریقے سے امریکی حراست سے باہر نکال دیا۔ اسی حامد کرزئی کے کریڈٹ پر ملا ضعیف اور متعدد دوسرے طالبان لیڈروں کی رہائی کے اقدامات بھی موجود ہیں۔ حامد کرزئی نے معصوم شہریوں پر فائرنگ کرنے کے ذمہ دار چھ امریکی کمانڈروں سے ماضی میں نہ صرف وضاحتیں طلب کیں بلکہ بعض کو افغان سرزمین سے واپس پینٹا گون بھی بھیج دیا۔ آج کرزئی جیسے لوگ پاکستانی رائے کے برعکس افغانستان میں بہت مقبول دکھائی دے رہے ہیں اور یہی وجہ تھی کہ امریکہ اور اس کے میڈیا نے حالیہ افغان الیکشن سے قبل عبداللہ عبداللہ کے حق میں زبردست مہم چلا کر کرزئی کو سیاست اور حکومت سے باہر نکالنے کی ہر ممکن کوشش کی، تاہم عوام نے کرزئی پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے ان کو ووٹ ڈالے اور جب حسب توقع پلاننگ کے تحت انتخابات کے نتائج پر انگلی اٹھائی گئی تو اسی حامد کرزئی نے مزاحمت یا تلخی کے بجائے دوبارہ انتخابات کی حامی بھر کر افغانستان میں جمہوری اور پارلیمانی اقدار کو درپیش خطرات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔

جو لوگ افغانستان میں طالبان کے دوبارہ برسراقتدار آنے کا خواب دیکھ کر ایسا ہونے کی پیش گوئی کر رہے ہیں وہ ان ڈیڑھ کروڑ ووٹروں کی رائے اور خواہش کو کیسے بھول سکتے ہیں جنھوں نے سیاسی، پارلیمانی اور جمہوری نظام کے حق میں ووٹ ڈال دیئے اور ووٹ ڈالنے والوں میں طالبان اور حزب اسلامی کے حامی بھی بڑی تعداد میں شامل ہوئے۔

فرسودہ اور مقبول عام تجزیوں کے برعکس اعداد و شمار سے ثابت ہوا ہے کہ افغانستان کے موجودہ تجربہ کار اور پڑھے لکھے حکمران دوسروں پر انحصار کرنے کے بجائے

افغانیوں پر مشتمل سول اور ملٹری اداروں کی تشکیل پر نہ صرف بہت توجہ دے رہے بلکہ وہ اب حقیقتاً اس قابل بھی ہو گئے ہیں کہ اگر چاہیں تو دوسروں کی معاونت کے بغیر اپنی سرحدوں اور شہروں کا دفاع بھی کر سکیں۔ اطلاعات کے مطابق افغانیوں پر مشتمل فوجی اور پولیس جوانوں کی تعداد دو لاکھ کا ہندسہ عبور کر چکی ہے۔ امریکی میڈیا کے مطابق متعدد طالبان مخالف کارروائیوں کے دوران اتحادی افواج کے برعکس افغان نیشنل آرمی، پولیس اور انٹیلی جنس اداروں کی کارکردگی زیادہ موثر دیکھی گئی ہے۔

اعداد و شمار کے مطابق (ایک معتبر سروے) اس وقت یونٹس اینڈ ڈسپلن کے تحت افغانستان میں جو طالبان اتحادیوں اور حکومت کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں ان کی تعداد 30 ہزار ہے جبکہ روس کے خلاف جنگ لڑنے والے مجاہدین کی تعداد 250,000 تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم 2000ء کی جنگ کا موازنہ آج سے 20 سال قبل کی جنگ کے ساتھ کر ہی نہیں سکتے۔ موجودہ تعداد گزشتہ جنگ کا صرف 10 فیصد بنتی ہے۔ یہ صورتحال ثابت کرتی ہے کہ تمام تر حریت پسندی کے باوجود افغان جنگیں لڑتے لڑتے تھک چکے ہیں اور اب ان میں پہلی والی مزاحمت باقی نہیں رہی لیکن یہ دعویٰ یا تاثر بھی شاید اب درست نہ ہو کہ افغانستان دوسری سلطنتوں کے لیے اب بھی قبرستان ہے۔ اگر افغانستان ناقابل فتح ریاست ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کسی نے اس ملک پر قبضہ نہیں کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس خطے پر حکومت اور حکمرانی کرنا ہی اصل مسئلہ ہے۔

سال 2008ء کے دوران طالبان اور اتحادیوں کے ہاتھوں 2000 شہری جاں بحق ہو گئے۔ یہ عراق کے مقابلے میں ایک چوتھائی سے بھی کم تعداد بتائی جاتی ہے۔ افغانستان کو امریکہ کے لیے ویتنام قرار دے کر دلائل دینے والے لوگ یہ بات بھول رہے ہیں کہ ویت نام میں امریکہ کو روسی بلاک کے علاوہ ویتنامی فوج، عوام اور ریاست کا بھی سامنا تھا۔ اس وقت ویت نامی فوج کی تعداد چار لاکھ سے زائد تھی۔ ایک سروے کے مطابق سال 2008ء کے دوران افغانستان میں 160 امریکی فوجی ہلاک ہوئے۔ اس کے برعکس 1968ء میں ویت نام میں اپریل کے چار دن کے دوران 190 امریکی ہلاک ہوئے تھے۔ ویتنام کی جنگ کے دوران امریکہ اپنے جی ڈی پی کا ساڑھے 10 فیصد عسکری اخراجات کی نذر کرتا تھا۔ آج

عسکری اخراجات چار سے پانچ فیصد ہیں۔ اس رقم میں افغانستان پر صرف چھ فیصد خرچ ہوا باقی رقم عراق میں استعمال ہوئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ افغانستان کی موجودہ جنگ کا جانی، مالی لحاظ سے امریکہ کے لیے ویتنام اور عراق کے ساتھ موازنہ ہی نہیں کیا جانا چاہیے۔

اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد 40 لاکھ افغان مہاجرین مختلف ممالک سے افغانستان واپس چلے گئے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اب اپنے ملک کو محفوظ سمجھتے ہیں اور وہاں زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ اسی رپورٹ کے مطابق 20 لاکھ بچے اور بچیاں مختلف تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم ہیں جبکہ ہر چھٹے افغان شہری کے پاس موبائل فون کی سہولت ہے۔ 2007ء کے ورلڈ بینک کے ایک سروے کے مطابق افغانستان میں جی ڈی پی بڑھنے کی شرح 14 فیصد تھی جو کہ پاکستان سے بھی زیادہ تھی۔ ایک اور سروے میں بتایا گیا ہے کہ افغانستان مستقبل قریب میں انتہائی کم مالی وسائل استعمال کرکے کھربوں ڈالرز گیس، پانی، لوہے، سونے، تیل اور دوسری معدنیات کے ذخائر چند ہی برسوں میں دریافت کرکے خود کفیل ریاست کے طور پر سامنے آسکتا ہے۔ اس سلسلے میں جرمنی، روس، چین اور متعدد دوسرے ممالک کی کمپنیاں ان پراجیکٹس پر کام کرنے میں مصروف ہیں۔

دوسری طرف اس حقیقت کو نظر انداز کرنا پاکستانی اداروں اور تجزیہ نگاروں کے لیے پاکستان کے ساتھ ایک اور زیادتی والی بات ہوگی کہ طالبان اور عسکری قوتوں کی توجہ کا مرکز افغانستان کے بجائے اب پاکستان بنتا جا رہا ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ پاکستان کو درپیش خطرات سنگین ہوتے جا رہے ہیں۔ پاکستان کا ایک اور بڑا مسئلہ یہاں موجود قومیتوں اور صوبوں کے درمیان بڑھتی خلیج اور اس کے منفی اثرات کا بھی ہے۔ افغانستان کے عوام اور قومیتوں کے درمیان وطن پرستی اور قوم پرستی کا جذبہ اس ملک کی سرحدوں کا ضامن سمجھا جاتا ہے جبکہ پاکستان کی قومیتیں دن بدن ایک دوسرے سے دور ہوتی جا رہی ہیں اور بداعتمادی اب بغاوت کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔

پاکستان کے ایک معتبر تحقیقی ادارے PIPS کی ایک حالیہ رپورٹ سے پاکستان اور افغانستان میں تشدد، حملوں اور دھماکوں پر مشتمل واقعات کی شرح کا اندازہ لگایا جا سکتا

ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق اگست 2008ء سے لے کر جنوری 2009ء تک کے عرصہ کے دوران پاکستان میں 5408 افراد جاں بحق جبکہ 538 افراد زخمی کیے گئے۔ اس کے برعکس افغانستان میں یہ شرح کم رہی۔ افغانستان میں اس عرصہ کے دوران 2329 افراد جاں بحق جبکہ 1193 افراد زخمی ہوئے۔ ایک ایک رپورٹ کے مطابق 2007ء کے مقابلے میں 2008ء کے دوران افغانستان میں خودکش حملوں کی تعداد میں بھی واضح کمی واقع ہوئی۔ 2007ء کو وہاں 140 خودکش حملے کیے گئے، تاہم 2008ء کے دوران ان حملوں کی تعداد 84 رہی۔ سال 2009ء پاکستان خصوصاً اس کے ریاستی اور دفاعی اداروں کے لیے بدترین سال ثابت ہوا اور اداروں، شخصیات پر حملوں کا تناسب دن بدن بڑھتا چلا گیا۔ ان تمام تر اعداد و شمار اور حقائق سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ افغانستان بعض پاکستانی تجزیہ نگاروں کے دعوؤں، خواہشات اور تبصروں کے برعکس ماضی کی نسبت بہتری کی طرف جبکہ پاکستان بدتری کی جانب گامزن ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستانی ادارے اپنی افغان پالیسی پر بنیادی نظرثانی کر کے افغانستان کو اپنا پانچواں صوبہ بنانے کی خواہش کے بجائے اپنے صوبوں اور قومیتوں کی اعتماد سازی اور قربت پر توجہ دیں اور بدلتے حالات کے تناظر میں حقائق کا سامنا کرتے ہوئے افغانستان کے ساتھ بہتر تعلقات کے قیام کو ممکن بنائیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ 2004ء کے افغان انتخابات کے برعکس 2009ء کے صدارتی اور پارلیمانی الیکشن کے دوران پاکستان میں موجود لاکھوں افغان باشندے شدید خواہش اور مطالبے کے باوجود ووٹ ڈالنے کے حق سے محروم رہ گئے۔ اقوام متحدہ کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان کے مختلف علاقوں خصوصاً صوبہ سرحد اور فاٹا میں 18 لاکھ سے زائد افغان مہاجرین رہائش پذیر ہیں جبکہ افغان کمشنریٹ اور دوسرے متعلق اداروں کے مطابق یہ تعداد 25 لاکھ سے لے کر 28 لاکھ تک ہے۔ صرف پشاور اور گرد و نواح کے علاقوں میں افغانیوں کی تعداد سات لاکھ سے زائد بتائی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک محتاط اندازے کے مطابق اگر افغانستان کی مجموعی آبادی کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ افغانستان کے 12 صوبوں کے ووٹروں کی تعداد کے برابر افغان باشندوں کو انتخابی عمل سے باہر رکھا گیا۔ یاد

رہے کہ افغانستان میں کل رجسٹرڈ ووٹوں کی تعداد ایک کروڑ 56 لاکھ کے قریب ہے۔ 34 میں سے 12 صوبے ایسے ہیں جن کے رجسٹرڈ ووٹ 20 لاکھ کے لگ بھگ ہیں۔ صوبہ ننگر ہار (جلال آباد) وہ واحد علاقہ ہے جس کے انتہائی کم باشندوں کو بدھ 19 اگست کو ووٹ ڈالنے جاتے دیکھا گیا۔ ان کو بھی پاک افغان بارڈر (طورخم) کی بندش کے باعث واپس آنا پڑا۔ ذرائع کے مطابق 18 اور 19 اگست کو بہت کوشش کے باوجود جو افغان باشندے سرحد پار کرنے میں کامیاب ہوئے ان کی تعداد ایک ہزار سے کم ہی ہوگی۔

2004ء کے انتخابات کے دوران پشاور، نوشہرہ، مردان، کوہاٹ، بنوں، ڈی آئی خان، مانسہرہ، اسلام آباد، کوئٹہ اور چمن سمیت تقریباً تمام قبائلی علاقوں میں 200 سے زائد مقامات پر اقوام متحدہ کی نگرانی میں پولنگ سٹیشن قائم کیے گئے تھے۔ افغان ووٹرز نے خلاف توقع بہت بڑی تعداد میں ووٹ پول کر دیئے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں 11 لاکھ سے زائد ووٹ ڈالے گئے تھے اور حامد کرزئی کی حتمی کامیابی میں ان ووٹوں نے کلیدی کردار ادا کیا تھا کیونکہ پاکستان میں رہائش پذیر افغان مہاجرین کی اکثریت پشتونوں پر مشتمل تھی اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی قوم پرستی کے تناظر میں کرزئی کو ووٹ دے گئے تھے۔

اب کے باران لوگوں کو ووٹ ڈالنے کا حق کیوں نہیں دیا گیا۔ اس کا کوئی ٹھوس جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ اقوام متحدہ کے ایک اہلکار کے مطابق ادارے نے انتظامات کے لیے فنڈز فراہم نہیں کیے تھے کیونکہ ایک تو مہاجرین کو واپس چلے جانا چاہیے تھا اور دوسرا یہ کہ یہ انتظامات افغان حکومت کو خود کرنے چاہیے تھے۔ دوسری طرف افغان کمشنریٹ اور افغان قونصلیٹ کے بعض اہلکاروں کا کہنا ہے کہ پاکستان نے خصوصاً صوبہ سرحد اور فاٹا کی کشیدہ صورتحال کو سامنے رکھ کر پہلے کی طرح معاونت کرنے سے معذرت کر لی تھی۔

بے شمار افغانیوں نے ووٹ کی سہولت فراہم نہ کرنے پر شدید ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے موقف اپنایا کہ ایک سازش کے تحت ان کو اس عمل سے باہر رکھا گیا۔ بعض کے مطابق اس سازش میں امریکہ اور پاکستان دونوں شامل ہو سکتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ چونکہ پاکستان کے افغانی کرزئی کی حمایت کر سکتے تھے اس لیے پالیسی تبدیل ہونے پر ان کو اس عمل سے باہر رکھا گیا جس میں کرزئی کی نااہلی بھی شامل ہے۔

افغانستان پر متعدد تحقیقی مقالہ جات اور کتابیں لکھنے والے محقق ڈاکٹر فضل رحیم مروت کے مطابق ماضی میں پاکستان بنگالیوں کی جدوجہد اور مزاحمت کے باعث اکثریتی آبادی اور علاقے سے محروم ہونے کے صدمے سے اس لیے دوچار ہوا تھا کہ یہاں کے حکمران اور بالادست طبقے دوسرے صوبوں یا قومیتوں کے حقوق تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ آج بلوچستان، فاٹا اور پختونخواہ صوبے کی حالت بھی 1970ء کی صورتحال سے زیادہ مختلف نظر نہیں آتی۔ اردو بولنے والوں اور سرائیکیوں کی شکایات کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا جبکہ اس کے برعکس افغانستان میں پشتونوں اور دوسری چھوٹی قومیتوں کے درمیان بعض اختلافات کے باوجود وطن پرستی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ افغانستان کی لیڈرشپ نے ماضی کی غلطیوں، سازشوں اور عالمی جوڑ توڑ سے عملاً بہت کچھ سیکھ لیا ہے جبکہ پاکستان کی لیڈرشپ غلطیوں پر غلطیاں کرتی نظر آ رہی ہے۔ اس کے علاوہ وہاں کے قدرتی وسائل اور افرادی قوت کو بھی اقتصادی طور پر محفوظ رکھا گیا ہے۔ آج افغانستان کی کرنسی پاکستان سے بھی مضبوط ہوگئی ہے جو کہ اس جانب اشارہ ہے کہ وہاں سیاسی اور اقتصادی حالات بتدریج بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے برعکس پاکستان اپنی سلامتی اور خودمختاری کے حوالے سے متعدد سوالات اور خدشات سے دوچار دکھائی دے رہا ہے اور حالات بہتر ہونے کی بجائے بگڑتے جا رہے ہیں۔

بلوچستان سے تعلق رکھنے والے قوم پرست طالب علم رہنما اور تجزیہ نگار بشیر شیرانی کا افغانستان کے مستقبل کے حوالے سے کہنا ہے کہ افغانستان اپنی انٹیلی جنس فوجی (ملی اردو) پولیس اور دوسرے اداروں کے استحکام کے حوالے سے اپنی تاریخ کے ایک نئے دور میں داخل ہو رہا ہے۔ موجودہ افغان کابینہ میں انتہائی تعلیم یافتہ اور تجربہ کار لوگ شامل ہیں اور ان میں 9 سے زائد وہ پی ایچ ڈی ڈاکٹرز ہیں جو کہ دوسرے ممالک میں اپنے اپنے شعبوں میں بہترین خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ پاکستان کی طرح افغانستان میں تمام تر بدترین حالات کے باوجود کرپشن کی شرح انتہائی کم رہی۔ شیرانی کے مطابق افغانستان میں وزیرستان کی طرح ایسا کوئی علاقہ موجود نہیں جہاں طالبان نے مکمل کنٹرول حاصل کیا ہو یا جہاں ریاست کا داخلہ یا عمل دخل ممنوع قرار پایا ہو جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مستقبل کے

منظرنامے میں افغانستان ہمارے مقابلے میں زیادہ مستحکم اور متحد ریاست بن کر سامنے آئے گا۔ ان کا کہنا ہے کہ ڈیورنڈ لائن کے معاملے پر قوم پرستوں کے علاوہ مجاہدین اور طالبان نے بھی پاکستانی کوششوں کے باوجود کوئی لچک نہیں دکھائی کیونکہ تمام افغان اس سرحد کو متنازعہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ افغانوں میں اپنی سرحدوں کے دفاع اور وطن کی ترقی کا جنون کی حد تک جذبہ موجود ہے......

❁ ❁ ❁ ❁

نئے صوبوں کا مطالبہ اور فاٹا کا مستقبل

رواں سال کے دوران صوبوں کی تعداد بڑھانے یا نئے صوبے تشکیل دینے کے ایشو نے جہاں ایک طرف پنجاب کے مستقبل کے جغرافیائی منظرنامے سے متعلق ایک نئی بحث کی ابتداء کی وہاں بلوچستان، سندھ اور قبائلی علاقہ جات کے بارے میں کئی نئے سوالات بھی سر اٹھانے لگے کیونکہ پنجاب سے زیادہ اگر اس ایشو کی شدت کہیں موجود ہے تو وہ شمالی علاقہ جات، فاٹا اور بلوچستان کے جغرافیائی اور انتظامی ساخت کا وہ پس منظر ہے جس کے باعث سیاسی اور عوامی قوتیں وقتاً فوقتاً آواز اٹھاتی رہی ہیں۔

سات قبائلی ایجنسیوں اور چھ نیم قبائلی علاقہ جات میں رہائش پذیر 50 لاکھ سے زائد قبائلی عوام 1901ء سے قائم کردہ انگریزی سسٹم اور قوانین کے تحت اکیسویں صدی میں بھی بنیادی انسانی حقوق اور ضروریات سے محروم ہیں۔ یہ شاید دنیا کا وہ واحد علاقہ ہے جہاں پر مروجہ عدالتی نظام، بینکنگ، ٹیکس سسٹم اور دوسری ریاستی ضروریات کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ پنجاب کو دو تین صوبوں میں تقسیم کرنے کے بجائے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ 29,220 مربع میل علاقے کو یا تو صوبہ سرحد میں ضم کرکے ریاستی عملداری میں لایا جائے یا اتنے بڑے رقبے پر مشتمل علاقوں کا ایک الگ صوبہ قائم کیا جائے۔

اس وقت فاٹا کے 70 فیصد معاملات اسلام آباد کے ذریعے چلائے جارہے ہیں۔ حالانکہ تمام انتظامی اور ریاستی معاملات پشاور کے ذریعے چلائے جانے چاہیے تھے کیونکہ ایسا

ہونا عین قبائلی علاقوں کے عوام کی ضروریات اور خواہشات پر مبنی ایک ایسا مطالبہ ہے جس کی اہمیت، پس منظر اور اسباب سے نہ تو انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی پاکستانی ریاست اس حقیقت کو مزید نظرانداز کرنے کا رسک لے سکتی ہے کہ دار زون بیک گراؤنڈ رکھنے والے قبائلی علاقوں کا موجودہ سٹیٹس برقرار رکھتے ہوئے یہاں کے عوام کو انتہاپسندوں اور دہشت گردوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔

فاٹا کی پسماندگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان علاقوں میں خواتین کی شرح تعلیم 2.3 فیصد جبکہ مردوں کی شرح تعلیم 14.10 فیصد ہے۔ ان علاقوں میں صحت کی حالت یہ ہے کہ 8189 مریضوں کے لیے محض ایک ڈاکٹر دستیاب ہے جبکہ اتنے بڑے علاقے میں روزگار، زراعت اور کاروبار کی شرح 3 فیصد سے بھی کم تناسب سے ریکارڈ کی گئی ہے۔ پورے قبائلی علاقے میں ایک بھی یونیورسٹی نہیں ہے جبکہ بے انصافی کی انتہا یہ ہے کہ وفاقی بجٹ میں اتنے اہم اور بڑے علاقے کے لیے کبھی بھی 5 فیصد سے زیادہ حصہ نہیں رکھا گیا۔

ہمارے حکمرانوں کی نااہلی کا یہ عالم ہے کہ قبائلی علاقوں کو ابھی تک ایف سی آر کے ان سیاہ قوانین کے ذریعے چلایا جا رہا ہے جو کہ انگریزوں نے اپنی ریاستی عملداری اور قبضہ گیری کی ضروریات کو سامنے رکھ کر بنائے تھے۔ پاکستانی حکمرانوں نے چند برس قبل تک 50 لاکھ سے زائد کی آبادی کو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر الیکشن میں حصہ لینے کے حق سے بھی محروم رکھا تھا۔

ایسی صورتحال میں جنوبی پنجاب کی محرومیوں کی آڑ میں جب پنجاب کو دو یا اس سے زائد صوبوں کے قیام کی مہم چلائی جاتی ہے تو باخبر اور باشعور حلقوں کے ذہن میں یہ بات شدت سے سر اٹھانے لگتی ہے کہ اگر اختیارات کی مرکزیت کا خاتمہ کرنا اور چھوٹے انتظامی یونٹس بنانا ہی ایسے مسائل کا حل ہے تو کیا قبائلی علاقوں اور بلوچستان کے کروڑوں عوام کو ایسے کسی حق سے محروم رکھنا انصاف پر مبنی رویہ ہے؟

ہم اگر تلخ حقائق کا ادراک کرتے ہوئے پاکستان کے موجودہ سنگین مسائل کا جائزہ لیں تو واضح ہوتا ہے کہ مضبوط مرکز نے وفاق کے ڈھانچے اور اس کی روح کو ناقابل

تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ حکمرانوں نے فاٹا، جنوبی پنجاب، بلوچستان اور شمالی علاقوں کو ریاستی فیصلوں اور شیئرز سے باہر رکھ کر پاکستان کو چند بڑے شہروں تک محدود رکھتے ہوئے پاکستان کے مضبوط وفاقی ڈھانچے کو کبھی قائم ہونے ہی نہیں دیا۔

سیاسی مبصرین پنجاب کی تقسیم سے زیادہ فاٹا، بلوچستان اور شمالی علاقہ جات سے متعلق غیر معمولی اور غیر مروجہ ریاستی پالیسیوں کا تقاضا کرتے آئے ہیں اور عوام بھی یہ سمجھتے ہیں کہ جن علاقوں میں کئی دہائیوں کی محرومیوں نے شورش اور بغاوت کی صورت اختیار کی ہے وہاں پر اختیارات اور وسائل کی تقسیم کے فارمولے کا ازسرنو جائزہ لیا جانا چاہیے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر اس وقت سیاسی، اقتصادی محرومیوں نے کہیں پر بغاوت کی شکل اپنائی ہے تو وہ بلوچستان اور فاٹا کے علاقے میں نہ کہ جنوبی پنجاب، سندھ یا کوئی اور علاقہ۔

بلوچستان دو بڑی قوموں یعنی بلوچوں اور پشتونوں پر مشتمل صوبہ ہے۔ اس صوبے کے تمام بڑے شہر (کوئٹہ سمیت) پشتون قوم کے قبضے میں ہیں۔ بلوچوں کے مقابلے میں پشتون کاروبار، تعلیم، ملازمتوں اور دوسرے شعبوں میں کافی آگے ہیں۔ بلوچوں کا سب سے بڑا شہر خضدار سمجھا جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو خضدار کو حقیقی معنوں میں شہر بھی نہیں کہا جا سکتا۔ بلوچستان کے بلوچ اگر الگ ریاست کے قیام اور پاکستان سے علیحدگی کی بات کرتے ہیں تو دوسری طرف لاکھوں پشتون (40لاکھ کے قریب) الگ صوبے یا صوبہ سرحد کے ساتھ الحاق کا مطالبہ بھی برسوں سے کرتے آئے ہیں۔ نامور پشتون لیڈر عبدالصمد خان اچکزئی اور اب ان کے صاحبزادے محمود خان کے علاوہ عوامی نیشنل پارٹی جیسی پشتون قیادت کا بھی کہنا ہے کہ پشتونوں کو پاکستان کے اندر تین انتظامی یونٹوں یعنی صوبہ سرحد، فاٹا اور بلوچستان میں تقسیم رکھنے کا کوئی سیاسی، اخلاقی اور ریاستی جواز موجود نہیں ہے۔ عبدالصمد خان اچکزئی تو لمبے عرصے تک پشتونستان کے نام سے ایک متحدہ صوبے کے قیام کا مطالبہ اور جدوجہد کرتے رہے ہیں جبکہ محمود خان بھی چاہتے ہیں کہ پاکستان کے اندر پشتون علاقوں پر مشتمل ایک متحدہ صوبے کا قیام عمل میں لایا جائے۔

دیکھا جائے تو پشتون فیکٹر اپنے ان مطالبات اور اسباب کے تناظر میں جنوبی

پنجاب کے حالیہ فیکٹر یا مطالبے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ دوسری طرف اے این پی کے اس مطالبے میں گزشتہ چند برسوں سے پھر سے شدت آ گئی ہے کہ اگر انتہا پسندی کا خاتمہ کرنا ہے تو بعض دوسرے فیصلوں کے علاوہ فاٹا کو صوبہ سرحد میں شامل کیا جائے تاکہ صوبے کی اسمبلی میں اس پشتون آبادی کی نمائندگی کو یقینی بنایا جا سکے۔ بعض دوسرے متعلقہ حلقے فاٹا پر مشتمل الگ صوبے کے قیام کا مطالبہ بھی ٹھوس دلائل اور اسباب کے تناظر میں کرتے آئے ہیں۔ اس صورتحال کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ پاکستان کے موجودہ ریاستی اور جغرافیائی ڈھانچے میں تبدیلی لانا یا نئے صوبوں کے قیام سمیت دوسرے اقدامات اٹھانا نہ صرف یہ کہ برسوں پرانا مطالبہ رہا ہے بلکہ موجودہ تناظر میں اگر پنجاب کا حجم کم کرنے کی بات چل نکلی ہے تو یہ بات محض اس صوبے تک محدود نہیں رہے گی۔

سیاسی اور جغرافیائی ماہرین کی رائے میں انتظامی تبدیلیوں کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ایسا کرنے سے قبل ایک مکمل ہوم ورک اور سیاسی انڈرسٹینڈنگ قائم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ زبان کی بنیاد پر صوبوں کی تقسیم یا تعداد بڑھانے سے کئی دوسرے مسائل بھی پیدا ہوں گے۔ دوسری طرف دیکھا جائے تو موجودہ سیاسی انتظامی ڈھانچے کا بعض لوگ دفاع کرتے بھی نظر آ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر سرائیکی قوم اگر زبان کی بنیاد پر الگ صوبے کا مطالبہ کرتی ہے تو پنجاب میں پوٹھوہاری اور سرحد میں ہندکو کی بنیاد پر بھی ایسا کوئی مطالبہ سامنے آ سکتا ہے۔ اگر ایک طرف قوم پرستی کی بنیاد پر پنجاب کی تقسیم یا سرائیکی صوبہ بنانے کی مہم چلائی جا سکتی ہے تو دوسری طرف بلوچوں اور پشتون کا سٹینڈ قوم پرستی کے ہوتے ہوئے کچھ اور مطالبہ کرتے نظر آتا ہے یعنی پشتون ایک بڑے صوبے میں متحد ہونا چاہتے ہیں اور اس کے لیے تحاریک بھی چلاتے آئے ہیں جبکہ پنجاب میں صوبے کے حجم کم کرنے کی بات چل رہی ہے۔ دیکھا جائے تو اس ایشو سے کئی نئی پیچیدگیاں نظر آنے لگی ہیں۔

ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن کے سابق صدر لطیف آفریدی نے صوبوں کی تعداد بڑھانے کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ پنجاب بہت بڑا صوبہ ہے۔ یہاں کے عوام خصوصاً سرائیکی عوام کو بے شمار بنیادی مشکلات کا سامنا ہے۔ سرائیکی قوم

کی اپنی تاریخ، زبان اور ثقافت ہے۔ ان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ لاہور کی بجائے ملتان یا کسی اور شہر میں اپنے مسائل کے فوری حل اور اپنے حقوق کے حصول کے لیے اپنا صوبائی دارالحکومت قائم کر کے اپنے معاملات کو آگے بڑھائیں۔

لطیف آفریدی کا کہنا ہے کہ قبائلی علاقوں کے انتظامی اور جغرافیائی سٹیٹس کے بارے میں بھی فیصلہ کن اقدامات اٹھانے کا وقت آ گیا ہے جبکہ پاکستان کے تین انتظامی یونٹوں میں تقسیم پشتونوں کے لیے ان کے مطالبے کے مطابق ایک مشترکہ صوبے یا یونٹ کے قیام کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

''میرا خیال ہے کہ مزید صوبوں کے قیام کا مسئلہ ہر علاقے میں الگ الگ پس منظر رکھتا ہے۔ ہمیں اسی پس منظر کو سامنے رکھ کر فیصلے کرنے چاہئیں۔ تاہم پنجاب کے کئی صوبے کرنے سے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ پاکستان کا وفاقی ڈھانچہ کمزور ہونے کی بجائے مضبوط ہوگا۔''

صوبائی وزیر اطلاعات اور اے این پی کے رہنما میاں افتخار حسین نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ صوبہ سرحد کے ہزارہ ڈویژن میں یہ مطالبہ حقیقتاً کبھی سامنے نہیں آیا کہ اس ڈویژن پر مشتمل الگ صوبہ قائم ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ صوبہ سرحد اپنے حجم کے لحاظ سے بہت آسانی سے پشاور کے ذریعے کنٹرول ہو رہا ہے اور صوبے کے تمام علاقوں کو حکومتی معاملات میں پوری نمائندگی حاصل ہے اور کسی بھی فریق کو کوئی بنیادی شکایت نہیں ہے۔ میاں افتخار حسین نے کہا کہ ہم تو اپنے صوبے کو بڑھانے کی خواہش رکھتے ہیں۔

''صوبے کے عوام سمجھتے ہیں کہ پنجاب، اٹک اور میانوالی کے اضلاع کو صوبہ سرحد کے حوالے کر دیں کیونکہ ماضی میں یہ دونوں علاقے صوبہ سرحد کا حصہ تھے۔ اس حوالے سے وقتاً فوقتاً موثر آواز اٹھائی بھی جاتی رہی ہے۔''

پیپلز اویرنس موومنٹ (پام) کے چیئرمین ڈاکٹر سید عالم محمود نے قبائل سے متعلق سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ قبائلی عوام کو ریاستی زیادتیوں، محرومیوں اور ناانصافی کے باعث بدترین حالات کا سامنا ہے۔ قبائلی علاقوں میں جاری شورش کے چند دوسرے اسباب کے علاوہ یہ بھی ایک بڑی وجہ ہے کہ یہاں کے عوام کو بنیادی انسانی حقوق اور سہولیات سے

قصداً محروم رکھا گیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ فاٹا میں بڑی تبدیلی لانے کے ٹھوس اسباب موجود ہیں۔ پنجاب اور سندھ کے مسائل فاٹا اور بلوچستان کے ایشوز سے بالکل مختلف ہے۔ ہم اپنی سلامتی کے بنیادی مسئلے سے دوچار ہیں جبکہ باقی صوبوں کے حالات کافی بہتر ہیں۔ اس کے باوجود اگر سرائیکی عوام اپنے لیے الگ صوبے کا مطالبہ کرتے ہیں تو یہ مطالبہ ماننے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ ڈاکٹر محمود کے مطابق ایسا ہونے سے پنجاب پر زیادتی کرنے کے الزام میں بھی کمی واقع ہوگی جبکہ سرائیکی قوم کے احساس محرومی کا خاتمہ بھی ممکن ہو گا۔ قبائل کے بارے میں انہوں نے کہا کہ فاٹا کو الگ صوبے کی حیثیت دینے سے بہت سے مسائل ختم ہو جائیں گے۔ تاہم اس کا انحصار فاٹا کے عوام کی رائے پر ہے کہ ان کی کیا مرضی ہے۔

امریکی خفیہ اداروں کا پاکستان پر حملہ

امریکی جنگی حکمت عملی کو جاننے اور سمجھنے والے اس بات سے پوری طرح واقف ہیں کہ امریکی ہر جنگ کے بے باقاعدہ ہوم ورک کرتے اور پھر اس کے ہر پہلو کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے لیے حکمت عملی تیار کرتے ہیں۔ وہ ہر امکان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے اور پھر اس سے فوائد حاصل کرنے کے لیے بھرپور انوسٹمنٹ بھی کرتے ہیں جس کی ایک مثال تو پاکستان اور اس کے حکمرانوں کی بھی ہے جنہیں اس جنگ میں شمولیت کے لیے گاجر اور چھڑی کا طریقہ کار اپنایا گیا۔ انہیں ایک طرف تو امداد اور ہتھیاروں کی فراہمی کا عندیہ دیا گیا تو دوسری طرف دھمکیوں سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔ جنرل مشرف کے ساتھ اس وقت کے وزیر خارجہ کولن پاؤل کا وہ ٹیلی فون تو ریکارڈ پر آ چکا ہے اور اس کا انہوں نے اپنی کتاب میں بھی تذکرہ کیا ہے۔ یہ الگ بات کہ وہ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ پاکستان کو پتھر کے زمانے یا کھنڈرات میں تبدیل کرنے کی دھمکی دی گئی تھی لیکن یہی وہ دھمکی تھی جس کے بعد پاکستان کے حکمرانوں نے افغان پالیسی سے یوٹرن لے لیا اور جنرل مشرف نے ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ بلند کیا تھا۔

اور پھر...... یہ امریکہ ہی تھا جس نے افغانستان میں القاعدہ اور اسامہ بن لادن کے خطرہ کو نمایاں کر کے اقوام متحدہ کی حمایت حاصل کی اور پھر نیٹو کو اس جنگ میں شمولیت پر آمادہ کیا۔ حالانکہ نیٹو کا اتحاد کمیونزم کے بڑھتے ہوئے اثرات اور خطرات کو روکنے کے لیے

وجود میں آیا تھا۔ یہاں تو کمیونزم کی موجودگی نہیں تھی لیکن دوسری طرف یہ بھی سچائی ہے کہ نیٹو کے سیکرٹری جنرل نے پہلی دفعہ تہذیبوں کے تصادم کا خطرہ ظاہر کیا تھا جس کے بعد ''اسلام'' کو دنیا کے لیے خطرہ بنا کر پیش کیا گیا تھا جبکہ ایک اور صداقت تو یہ بھی ہے کہ 80ء کی دہائی میں جب افغانستان میں سوویت فوجیں آئی تھیں تو نہ امریکہ نے براہ راست اس جنگ کے لیے فوج بھیجی اور نہ ہی نیٹو یا کسی اور یورپی ملک نے۔ یہ تمام ذمہ داری پاکستان کی فوجی حکومت اور اس کے جانثار مجاہدین نے ہی ادا کی تھی۔ البتہ اس کے لیے اسلحہ اور دیگر مالی امداد امریکہ اور یورپی ممالک فراہم کرتے رہے۔ وہ بھی اس بنا پر کہ......کمیونزم کے خطرات بڑھ رہے تھے۔

لیکن اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس زمانے میں امریکی خفیہ ادارے نہ صرف پشاور بلکہ اسلام آباد کو بھی اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنائے ہوئے تھے۔ سی آئی اے کے ڈائریکٹر ولیم کیسی نے اپنی کتاب ''ویل'' میں یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ اس زمانے میں اسلام آباد سی آئی اے کے دنیا میں سب سے بڑے اڈوں میں سے ایک تھا۔ گویا اس وقت اگرچہ امریکی یا نیٹو افواج تو جنگ میں براہ راست شامل نہیں تھیں لیکن اس کے ادارے پاکستان کی حکومت اور اس کے اداروں کو مکمل تعاون فراہم کر رہے تھے لیکن اب تو صورتحال ہی بالکل برعکس ہے۔ امریکہ نے نہ صرف اپنے طور پر یہ جنگ لڑی ہے بلکہ وہاں تمام تر مزاحمت کے باوجود ایک کٹھ پتلی حکومت بھی بنوائی ہے اور اب وہاں اس کے استحکام کی کوششوں میں بھی مصروف ہے جس کے لیے نہ صرف اس کی مسلح افواج جنگ کا حصہ بنی ہوئی ہیں بلکہ اس کے تمام ادارے سی آئی اے، ایف بی آئی اور کچھ پرائیویٹ ادارے بھی اس جنگ میں اپنا حصہ ڈالتے ہوئے اپنے ملک اور اپنی حکومت کے ساتھ افغانستان میں کرزئی حکومت کو تحفظ دینے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ ایسے ہی پرائیویٹ اداروں میں ایک بلیک واٹر بھی ہے جس کی خدمات پینٹاگون اور سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے حاصل کی ہوئی ہیں جو اس سے پہلے عراق میں بھی اپنی خدمات انجام دے چکا ہے اور اب یہ ادارہ پاکستان میں بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔

بلیک واٹر ایک پرائیویٹ سکیورٹی کنسلٹنٹی کے فرائض سرانجام دیتی ہے۔ بنیادی

طور پر یہ امریکہ کی سپیشل فورسز پر مشتمل ریٹائرڈ اہلکاروں اور افسران پر انحصار کرتی ہے۔ امریکی ڈیلٹا فورس کے اہلکار اور افسران بھی اس ایجنسی کا ایک اہم حصہ ہیں۔ یہ امریکی اداروں کے لیے سکیورٹی فراہم کرنے کے علاوہ ان کو بوقت ضرورت سکیورٹی ایڈوائس کا فریضہ بھی سرانجام دیتی ہے۔ بعض ذرائع میں اس کو پرائیویٹ سیکٹر میں سی آئی اے اور ایف بی آئی کی سطح کا ادارہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کو وسائل کا 80 فیصد حصہ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور پینٹاگون سے ملتا ہے۔ یہ پاکستان جیسے ممالک کی انٹیلی جنس ایجنسیوں، افواج اور دوسرے اداروں کی نگرانی کا فریضہ بھی انجام دے سکتی ہے اور ایسا کرتی آئی ہے۔ عراق کے ایک امریکہ نواز لیڈرز کی حفاظت کا کنٹریکٹ حاصل کرتے وقت بلیک واٹر کو 21 ملین ڈالر کی خطیر رقم ملی تھی۔ افغانستان میں بھی یہ ایجنسی درجنوں آپریشنز میں حصہ لے رہی ہے۔ اس کو ایک خطرناک مگر موثر ترین ادارے کی حیثیت حاصل ہے۔

بلیک واٹر پاکستان خصوصاً پشاور میں 10 کے قریب غیر ملکی اداروں کو سپورٹ فراہم کرتی رہی ہے۔ جن اداروں کے ساتھ اس ایجنسی کے معاہدے ہوئے ہیں ان میں آئی سی آر سی، کمیونکس آئی، وایم، کریٹیو ایسوسی ایٹس، بہبودی چلڈرن، اے ای ڈی اور ایف ڈی ایس جیسے اہم ادارے شامل ہیں۔ اس ایجنسی کے اہلکار جدید ترین گاڑیوں اور اسلحہ سے لیس ہو کر انتہائی سرعت اور برق رفتاری سے ٹاسک کو حاصل کرتے ہیں۔ کالے رنگ کی جدید گاڑیاں، وردی اور ہتھیار ان کا ٹریڈ مارک ہے۔ ان کے اہلکاروں کا سٹیٹس اور خود اعتمادی قابل دید ہوتی ہے اور ان کی حرکت کا ہر کوئی فوری نوٹس لے لیتا ہے۔

جون 2009ء کو پرل کانٹی نینٹل ہوٹل پشاور پر ہونے والے خودکش حملے کے بعد بلیک واٹر کے افسران اور اہلکار اسلام آباد منتقل ہو گئے۔ پاکستانی انٹیلی جنس نے ہوٹل کے ملبے سے دستاویزات کے حصول کی بہت کوشش کی مگر کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ جولائی کے ابتدائی دنوں میں یہ لوگ ایک بار پھر پشاور آ گئے اور اب کی بار انہوں نے پشاور کے یونیورسٹی ٹاؤن میں اپنے ایک ماتحت غیر ملکی ادارے کے دفتر کو اپنا ٹھکانہ بنایا۔ مذکورہ علاقے کے باشندوں نے ان کی سرگرمیوں اور خطرناک نقل و حرکت کا سخت نوٹس لیتے ہوئے وزارت داخلہ کو ایک خط

لکھا جس میں مطالبہ کیا گیا کہ اس ایجنسی کو ٹاؤن کے علاقے سے ہٹایا جائے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ بلیک واٹر کی موجودگی سے ان کی سلامتی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

2009ء میں امریکہ کی نیم سرکاری سکیورٹی ایجنسی بلیک واٹر نے پاکستان میں اپنی مشکوک سرگرمیوں، آزادانہ نقل وحرکت نے اس ادارے کے مقاصد، مینڈیٹ اور عزائم سے متعلق متعدد سوالات کو جنم دیا۔ پرل کانٹی نینٹل ہوٹل پر ہونے والے خودکش حملے (9جون 2009ء) کے بعد انٹیلی جنس اداروں نے بڑی شدت اور سنجیدگی سے اس ادارے کا نوٹس لے کر یہ معلوم کرنے کی کوششوں کا آغاز کیا کہ یہ ادارہ پاکستان میں کیا کرتا آیا ہے اور اس کو آزادانہ نقل وحرکت کی اجازت کس نے دے رکھی ہے۔ پی سی خودکش حملے کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ حملہ آوروں کا ہدف عام لوگوں یا غیر ملکی مہمانوں کے برعکس بلیک واٹر کے وہ حکام اور اہلکار تھے جنہوں نے اس ہوٹل کے تھرڈ اور فورتھ فلورز میں دفاتر قائم کر رکھے تھے اور وہ کافی عرصہ سے اس ہوٹل میں رہائش پذیر بھی تھے۔

چنانچہ ایک طرف تو اس حملے کے پس منظر میں اسلام آباد کے میریٹ ہوٹل میں ہونے والے خودکش حملے کی بازگشت بھی سنائی دی جہاں کچھ غیر ملکی اور ان کے سامان کی نقل وحرکت کو دیکھا گیا جن کا تعلق بھی کسی بیرونی ایجنسی سے تھا اور پھر اس حملہ کی وجوہات میں بھی ان کو شمار کیا گیا تھا۔

انٹیلی جنس اور پولیس ذرائع نے اس ضمن میں بتایا کہ بلیک واٹر کو عرصہ دراز سے دھمکیاں مل رہی تھیں اور ان کو اپنی سرگرمیاں محدود کرنے کا مشورہ بھی دیا گیا تھا۔ تاہم بوجوہ اس ادارے نے اس مشورے پر عمل نہ کرتے ہوئے اپنی مصروفیات جاری رکھیں۔ پاکستان کے متعدد حساس اداروں نے اس ادارے کی سرگرمیوں، اہلکاروں کی ملاقاتوں، بعض معاملات کی چھان بین اور آزادانہ نقل وحرکت پر متعدد بار شکایت کی تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ادارہ سکیورٹی کی اپنی خدمات کے مینڈیٹ سے تجاوز کرتا رہا ہے اور بعض حلقوں کا یہاں تک کہنا تھا کہ اس کے بعض افسران اور اہلکار فاٹا اور صوبہ سرحد کی بعض شخصیات کے علاوہ متعدد اہم افغانیوں سے بھی رابطے میں رہا کرتے تھے۔ حالانکہ اس ادارے کا کام ایسی شخصیات سے ملاقات کرنا نہیں بلکہ ان افراد اور اداروں کو سکیورٹی فراہم کرنا تھا جن کے

ساتھ ان کی حکومت نے افغانستان اور قبائلی افراد کے ساتھ معاہدے کیے گئے تھے۔

پشاور کے بعض انتہائی باخبر حلقوں کا کہنا تھا کہ بلیک واٹر نے اپنے مینڈیٹ کی خلاف ورزی کر کے بعض حساس معاملات اور معلومات میں مداخلت کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا جس پر پاکستانی اداروں نے متعدد بار تشویش کا بھی اظہار کیا تھا۔ تاہم اس ایجنسی کے لوگ غیر ضروری خوداعتمادی کا مظاہرہ کر کے نہ صرف اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے بلکہ وہ پاکستانی اداروں کی تشویش، مشوروں اور ہدایات کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ پی سی ہوٹل کے حکام کو بھی کہا گیا تھا کہ اس ادارے کی موجودگی ان کی سکیورٹی کے لیے بھی خطرہ بن سکتی ہے مگر ہوٹل حکام نے بھی اس قسم کی اطلاعات اور ہدایات کا سنجیدگی سے کوئی نوٹس نہیں لیا اور اس ہٹ دھرمی اور غفلت کا نتیجہ یہ نکلا کہ خودکش حملے کے باعث دوسروں کے علاوہ متعدد بے گناہ اور معصوم لوگ بھی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ مصدقہ اطلاعات کے مطابق خودکش حملے میں بلیک واٹر کے پانچ اہلکار بھی جاں بحق ہوئے تھے جن میں دو پاکستانی اور تین غیر ملکی تھے۔ تاہم بلیک واٹر کی خواہش کے مطابق اس اہم معاملے کو میڈیا سے دور رکھا گیا کہ اس حملے کا نشانہ پی سی کا وہ حصہ تھا جس میں اس ادارے کے دفاتر اور رہائشی کمرے واقع تھے۔ جس مقام کو حملے میں ٹارگٹ کیا گیا اسی کے اوپر تیسرے اور چوتھے فلور پر اس ایجنسی کے دفاتر اور کمرے تھے اور یہی وجہ تھی کہ سامنے کی بلڈنگ کے بجائے پیچھے والے حصے کو نشانہ بنایا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ پاکستانی حکومت نے امریکی اور یورپی حکام کی خواہش پر چند برس قبل بلیک واٹر کو عراق اور افغانستان کے بعد پاکستان میں بھی اپنی خدمات سرانجام دینے کا لائسنس جاری کیا تھا۔ اس ادارے کے مختلف نیٹ ورکس عراق اور افغانستان میں اب بھی موجود ہیں اور ان کا کام امریکی اور دوسرے غیر ملکی اداروں، دفاتر اور شخصیات کو سکیورٹی فراہم کرنا ہوتا ہے۔ پاکستان میں اس ادارے کی سرگرمیوں نے جن سوالات کو جنم دیا اس میں سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ کیا پاکستان میں بھی عراق اور افغانستان کی طرح جنگ لڑی جا رہی ہے جو اس ایجنسی کو کام کرنے کی اجازت ملی۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ حکومت پاکستان نے ان اطلاعات اور شکایات کا نوٹس کیوں نہیں لیا جن میں خدشہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ یہ

ادارہ جاسوسی کے واقعات اور سرگرمیوں میں بھی ملوث ہو سکتا ہے۔

پشاور میں بلیک واٹر کے افسران اور اہلکاروں نے 2009ء کے شروع میں اپنی سرگرمیوں کی ابتداء کی تھی جبکہ ان کی مصروفیات، سرگرمیوں اور رابطوں کا سلسلہ فاٹا کے بعض علاقوں تک بھی پھیلایا گیا تھا۔ صوبہ سرحد اور فاٹا میں اس ادارے کے اہم ارکان کی تعداد دو درجن کے قریب تھی۔ جس پی سی ہوٹل میں ان کو دفاتر اور رہائشی کمرے فراہم کیے گئے تھے وہ ایک ایسی حساس اور اہم لوکیشن پر واقع تھا جہاں سے کور کمانڈر کے دفاتر اور رہائش گاہ کے علاوہ وزیر اعلیٰ ہاؤس، گورنر ہاؤس اور دوسرے ان تمام دفاتر اور عمارتوں کی نگرانی کی جا سکتی تھی اور جہاں سے پورے صوبہ سرحد کو حکومتی، انتظامی اور عسکری طور پر چلایا جاتا ہے۔ ایسے میں یہ سوال اپنی جگہ اور بھی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ اتنے حساس علاقے میں ایسے مشکوک اور خطرناک ادارے کو دفاتر کیوں فراہم کیے گئے؟ کہا جاتا ہے کہ حکومت پاکستان نے اس ایجنسی کو امریکیوں اور دوسرے غیر ملکیوں کو سکیورٹی فراہم کرنے کا لائسنس دیا ہوا تھا تاہم بعد میں یہ ثابت ہوا کہ یہ ادارہ سیاسی معاملات خصوصاً فاٹا اور افغانستان سے متعلق ایشوز میں بھی مداخلت کرتے پایا گیا۔ بعض حلقوں کا کہنا ہے کہ حکومت پاکستان نے بلیک واٹر کو افغانستان کے لیے پاکستان کے راستے کارگو سسٹم ہینڈل کرنے کی ذمہ داری بھی سونپی تھی۔ اگر یہ اطلاع درست ہے تو اس معاملے پر بھی متعدد سوالات سر اٹھائے کھڑے نظر آ سکتے ہیں۔

بعض اطلاعات کے مطابق اس ادارے کے بعض اہلکاروں نے مئی 2009ء کو پاکستانی سیاستدانوں، وزراء اور قبائلی شخصیات کے بارے میں بعض ایسی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جن کے ساتھ اس ادارے کا کوئی واسطہ نہیں بنتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بعض اہم افراد کے اکاؤنٹس تک چیک کرنے کی کوشش کی گئی۔ بعض حلقوں کا کہنا ہے کہ پشاور میں نصف درجن سے زائد افراد کو بھی مختلف اوقات میں اٹھایا گیا۔ یہ تمام کارروائیاں کس مینڈیٹ کے تحت کی جاتی رہیں اس سوال کے جواب کو پاکستان کی سلامتی اور ریاستی پالیسی کی نزاکتوں کے تناظر میں ڈھونڈنے کی ضرورت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پشاور میں اس ایجنسی کے اہلکار متعدد مواقع پر خود کو سفارتکار اور تھنک ٹینک کے طور پر متعارف کروا کر معلومات بھی حاصل کرتے رہے۔ ایسی سرگرمیوں کے دوران سکیورٹی کے ذمہ دار پاکستانی اداروں نے وہ

فرائض پورے نہیں کیے جن کا ان سے تقاضا کیا جا سکتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ادارہ پاکستان کے متعدد تھنک ٹینکس، این جی اوز اور سیاسی تجزیہ نگاروں کو بھاری فنڈز بھی فراہم کرتا تھا۔ اس سلسلے میں ان اداروں اور افراد کو بڑی رقوم سے نوازا جاتا تھا جو کہ انتہا پسندی سے متعلق عالمی جنگ کے معاملے پر امریکی موقف کی وکالت کرتے تھے۔ اس سلسلے میں پشاور اور اسلام آباد میں موجود سابقہ بیوروکریٹس، سابقہ فوجی جرنیل اور سینئر تجزیہ نگار اس ادارے کے فنڈز اور مراعات سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔

پشاور کے ایک معتبر صحافی نے بتایا کہ بلیک واٹر اور اسی طرز کا ایک اور ادارہ سپائیڈر ویب پاکستانی اداروں خصوصاً آئی ایس آئی اور طالبان گروپوں کے درمیان مبینہ رابطوں اور انڈرسٹینڈنگ کے بارے میں پینٹاگون کو اطلاعات فراہم کرنے کا خطرناک کام کرنے میں بھی ملوث رہا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بلیک واٹر محض سکیورٹی فراہم کرنے پاکستان میں موجود نہیں بلکہ اس کے کچھ اور خطرناک مقاصد بھی پیش نظر ہیں۔ دیکھا جائے تو ایسے اداروں کی موجودگی اور ان کی کھلم کھلا سرگرمیاں نہ صرف تشویشناک امر ہے بلکہ اس سے پاکستانی حکومت اور ریاستی اداروں کی غفلت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

حیرت اور افسوس کی بات یہ ہے کہ پاکستان کے حکمران اور ان کے سول ادارے نہ صرف یہ کہ شواہد، شکایات اور رپورٹس کے باوجود بلیک واٹر کی موجودگی سے لاتعلقی کا اظہار کرتے رہے بلکہ وہ صحافیوں پر غصہ نکال کر ان کی غلط رپورٹنگ کا الزام بھی لگاتے رہے تھے۔ ایک ٹی وی شو کے دوران وزیر مملکت برائے داخلہ تسنیم قریشی نے مصنف پر اس حوالے سے کافی ناراضگی ظاہر کی جو سٹوری بلیک واٹر کے بارے میں چلائی گئی تھی۔ وہ حقائق پر مبنی نہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ مصنف سمیت دوسرے تمام صحافی تصدیق کیے بغیر اس قسم کی رپورٹس شائع کروا کر پاکستان کی مشکلات میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ دیگر امریکی اداروں کے علاوہ بلیک واٹر کی پاکستان میں موجودگی کی اطلاعات پر اس کے بعد ملک کے ممتاز صحافیوں جناب حامد میر، نجم سیٹھی، شیریں مزاری اور متعدد دوسروں نے بھی کام کیا۔ جناب حامد میر نے نیوز نیوز اور نیوز انٹرنیشنل میں اعداد وشمار پر مبنی سٹوری فائل کی کہ پشاور کے علاوہ اسلام آباد اور دوسرے شہروں میں امریکیوں نے 300 کے قریب بنگلے کرائے پر

لے رکھے ہیں جہاں وہ رات کو آ کر میٹنگز کے علاوہ دوسری مشکوک سرگرمیوں میں ملوث ہوتے ہیں۔ ان کی خصوصی رپورٹ کے مطابق اسلام آباد میں ایسے بنگلوں کی تعداد 250 جبکہ پشاور میں 60 کے لگ بھگ تھی۔ انہوں نے اپنے شو کے دوران بعض وہ بنگلے بھی دکھائے جہاں پر امریکی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے اور ان کے باہر زبردست رکاوٹیں کھڑی کی گئی تھیں۔

حکومتی دعوؤں کے برعکس ان سٹوریز کی اشاعت کے بعد امریکی میرینز کی آمد کی خبریں بھی آنے لگیں۔ یہ بھی انکشاف ہوا کہ بلیک واٹر اور دوسرے لوگ پاکستانی قوانین کو نظرانداز کر کے چارٹرڈ اور خصوصی طیاروں کے ذریعے پاکستان آنے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں جبکہ ان کی ایک بڑی تعداد تربیلا میں دیکھی گئی ہے۔ پاکستانی حکومت کی جانب سے نوٹس نہ لیے جانے کے بعد امریکیوں نے اسلام آباد اور پشاور میں عوامی نمائندوں سمیت دوسرے لوگوں پر بندوقیں تان کر ہراساں کرنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا جبکہ ٹریز کے نام پر پاکستان آنے ہوئے امریکیوں کو حساس اداروں نے سہالہ سے کہوٹہ جاتے وقت گرفتار بھی کر لیا۔ اکتوبر کے آخری ہفتے کو ہونے والے اس واقعے کے بعد ان کے خلاف باقاعدہ ایف آئی آر بھی درج کرائی گئی۔ اس سے قبل اگست 2009ء ک آخری ہفتے میں اسلام آباد پولیس اور حساس اداروں نے بلیک واٹر کے آنے والے متعدد کنٹریکٹرز کو اسلام آباد اور روات سے گرفتار کر کے ان کی تحویل سے اسلحہ بھی برآمد کیا۔

امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن 27 اکتوبر 2009ء کو پاکستان کے دورے پر آئی ائی جناب حامد میر نے صحافیوں کے ساتھ ایک خصوصی نشست کے دوران ان سے امریکیوں کی ایسی سرگرمیوں کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے ایسے واقعات میں امریکیوں کے ملوث ہونے سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس تمام صورتحال نے پاکستان کی سلامتی کے بارے میں متعدد سوالات اور خدشات کو جنم دے کر عوام کو اور بھی تشویش سے دوچار کر دیا۔

✿ ✿ ✿ ✿

قبائلی علاقوں کا تاریخی پس منظر

قبائلی پٹی کے حوالے سے قدیم تاریخ کے بہت محدود شواہد دستیاب ہیں جن کے مطابق یہ علاقے زمانہ قبل از مسیح سے فاتحین کی گزرگاہ رہے ہیں یا ان کے زیر تسلط رہے ہیں۔ ان میں 800 قبل مسیح کے آرین سے لے کر مارین 313-222 قبل مسیح اور 97 قبل میں ساکا، کشانوں، ساسانیوں، ہنوں اور ترکوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ آفریدیوں کو یونانیوں کی کڑی سمجھا جاتا ہے۔ غزنویوں اور غوریوں کے دور میں اسلام لاہور سے دہلی تک پھیل چکا تھا جبکہ قبائلی علاقوں میں اسلام کی آمد اس سے بھی قبل بیان کی جاتی ہے۔ قبائلیوں نے ہندوستان میں اسلام کی ترویج اور فتوحات کے لیے ہمیشہ ہراول دستے کا کردار ادا کیا ہے لیکن بہت کم مواقع ایسے ہیں کہ قبائلیوں نے کسی شہنشاہیت کی مکمل اطاعت قبول کی ہو۔ مغل سلطنت کے بانی شہنشاہ بابر نے پہلی دفعہ اپنی خودنوشت میں مختلف قبائل کے ناموں اور خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے۔

1848ء میں جب انگریزوں نے پنجاب فتح کیا تو چترال اور بلتستان کے درمیان پٹھانوں کے سخت گیر قبائل سے ان کا واسطہ پڑا جو سکھوں اور عیسائیوں کی سخت مزاحمت کر چکے تھے۔ امیر افغانستان، سکھ مہاراجے اور انگریز حکمران تینوں خطے کے پہاڑوں پر اپنا تسلط چاہتے تھے۔ روسی توسیع پسندی کا راستہ روکنے کے لیے انگریزوں نے خیبر، کرم اور بولان کے دروں پر کنٹرول حاصل کیا لیکن وہ اس قبضے کو برقرار نہ رکھ سکے۔ انگریزی افواج میدانی اضلاع کا مناسب دفاع تو کر لیتی تھیں لیکن پہاڑی علاقوں میں انہیں مشکلات کا سامنا کرنا

پڑتا تھا جس سے ہلاکتوں، اشیاء کی رسد سے اخراجات میں اضافہ ہو جاتا اور قبائلیوں کی مزاحمت زور پکڑ لیتی۔ لاحاصل جنگ میں ہزاروں نفوس پر مشتمل حملہ آور دستہ زیادہ سے زیادہ ایک خالی قلعے یا کسی غیر آباد گاؤں ہی کو تباہ و برباد کر پاتا۔ پہاڑی قبیلوں کو مکمل آزادی تھی کہ وہ اپنی آزادی برقرار رکھیں یا کابل کے ساتھ الحاق کر لیں۔ دروں کو کھلا رکھنے کے لیے انگریزوں نے جو پیچیدہ طریقہ اختیار کیا وہ مغلوں کے طریقے سے مشابہت رکھتا تھا یعنی رعایتیں دینا، قبیلوں کو آپس میں لڑانا، مستقبل میں درست رویئے کی ضمانت کے لیے گرفتاریاں۔ افغانستان اور اس کے ملحقہ قبائلی علاقے کئی بادشاہتوں کی توجہ کا مرکز رہے جن میں برطانیہ، روس، جرمنی، ایران اور خلافت عثمانیہ شامل ہیں۔ شروع شروع میں ہند کی برطانوی سرکار شمال مغربی سرحدی علاقے کے لیے کوئی مربوط اور واضح پالیسی ترتیب نہ دے سکی۔ جارحیت سے لے کر لاتعلقی تک مختلف مواقع پر مختلف پالیسیاں اپنائی گئیں جن میں سوچی سمجھی لاپروائی، مشاورتی اور پرامن مداخلت، سرحدوں کی بندش، جارحانہ اور نیم جارحانہ پالیسیاں شامل ہیں۔ تاہم آہستہ آہستہ برطانوی حکومت نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا کہ نیم جارحانہ پالیسی یعنی پرامن اور غیر محسوس طور پر آہستہ آہستہ تسلط ہی ان کی ضروریات کو بہتر طور پر پورا کر سکتا ہے۔ 1922ء میں انگریزوں نے سرحد کے لیے اپنی ایک سوسالہ پالیسی کا خلاصہ یوں بیان کیا ہے کہ ''ہماری سرحدی پالیسی کا طویل المیعاد مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کو محفوظ بنایا جائے اور اس کا فوری اور مختصر المیعاد مقصد سرحدی اضلاع میں جان و مال کے تحفظ کے لیے قبائلی علاقوں کو قابو میں رکھنا ہے۔''

14 اگست 1947ء کو برطانوی ہند کی تقسیم کے نتیجے میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ پاکستان میں مشرقی بنگال، مغربی پنجاب، سندھ، شمال مغربی سرحدی صوبہ، ریاست قلات (موجودہ بلوچستان) اور آزاد قبائل (موجودہ فاٹا) شامل ہیں۔ وزیراعظم لیاقت علی خان نے 1947ء میں لنڈی کوتل میں ایک قبائلی جرگے سے خطاب کرتے ہوئے قبائلی جوانوں کی کشمیر سے واپسی پر زور دیا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے پشاور میں دو سو قبائلی ملکوں کے ایک جرگے کی صدارت کی جنہوں نے قائداعظم سے درخواست کی کہ قبائلی علاقوں کو مرکزی حکومت کی براہ راست نگرانی میں رکھا جائے۔ یہ درخواست منظور کی گئی۔ 1947ء کو

قائداعظم نے ریاستوں اور سرحدی علاقوں کی وزارت بنائی اور ذاتی طور پر اس کا چارج سنبھالا۔ بانی پاکستان نے گورنر جنرل پاکستان کی حیثیت سے قبائل کو واضح یقین دہانی کرائی کہ پاکستان کی شمولیت کے بدلے قبائل کے اندرونی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ تمام قبائل کے ساتھ معاہدے پر 22 تا 23 نومبر 1947ء کے دوران قائداعظم کے ایماء پر ان کے پولیٹیکل سیکرٹری مسٹر اے ایس بی شاہ نے دستخط کیے۔ معاہدوں پر دستخط کے طریقہ کار اور قبائل کی پاکستان کے ساتھ مسلسل وفاداری کے بدلے قبائل کے مختلف مفادات کا تحفظ اور دیگر معاملات طے کرنے کے لیے پولیٹیکل ایجنٹوں اور دوسری اہم شخصیات نے مختلف سطحوں پر رابطے اور اجلاس منعقد کیے۔

ایف سی آر

فاٹا کا عدالتی نظام ایف سی آر 1901ء پر مشتمل ہے جو نوآبادیاتی دور کا ایسا لیگل فریم ورک آرڈر ہے جس میں قبائلی روایات اور انتظامی اختیارات کو باہم مدغم کیا گیا ہے۔ انگریزوں نے یہ ظالمانہ قانون ہندوستانی سلطنت کی پیچیدہ سرحدی پٹی کو کنٹرول کرنے کے لیے نافذ کیا تھا۔ بنیادی طور پر یہ قانون 1872ء میں مدون کیا گیا لیکن اس کا باقاعدہ نفاذ 1901ء میں ترمیم کے ساتھ عمل میں لایا گیا۔

پاکستان میں 1963ء تک صوبہ سرحد میں اور 1977ء تک بلوچستان میں ایف سی آر کو نافذ رکھا گیا۔ فاٹا کے برعکس صوبوں کے زیرانتظام قبائلی علاقے پاٹا (PATA) پاکستان کے باقاعدہ عدالتی نظام کے دائرہ اطلاق میں آتے ہیں۔ باقی ملک کی طرح یہاں بھی ضلعی اور سیشن عدالتیں موجود ہیں جہاں سے صوبائی ہائیکورٹس اور سپریم کورٹ آف پاکستان میں اپیلیں دائر کی جا سکتی ہیں۔ آج 2009ء کے اواخر میں بھی ایک ایسے متوازی عدالتی نظام کا بدستور نفاذ ناقابل فہم ہے جو نوآبادیاتی عزائم کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا تھا اور جو پاکستان کے مرکزی عدالتی نظام سے باہر ہے۔ ایف سی آر میں پولیس، عدلیہ اور انتظامیہ کے تمام صوابدیدی اختیارات پولیٹیکل ایجنٹ کے پاس ہیں۔ انتظامی حوالے سے فاٹا کو تین حلقہ بندیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

1- قابل رسائی علاقے

یہ وہ علاقے ہیں جہاں ریاستی عملداری برائے نام ہے اور قبائلیوں کو اپنے فیصلے کرنے کی کھلی چھوٹ دی گئی ہے۔

2- انتظامی علاقے

ایف سی آر کے تحت انتظامی علاقوں کے اختیارات پولیٹیکل ایجنٹ اور ایف آر میں ڈی سی او کے پاس ہیں۔ یہاں سڑکیں، حکومتی ادارے اور دوسری تنصیبات قائم ہیں۔

3- محفوظ علاقے

ان علاقوں میں قبائلی جرگہ مقامی رسوم و رواج کے تحت جرائم اور دیگر معاملات نمٹاتا ہے۔ اگرچہ پولیٹیکل ایجنٹ کو اختیار حاصل ہے کہ وہ سرکاری اہلکاروں یا دوسرے ریاستی مفادات کے خلاف کیے گئے کسی فعل کے خلاف اقدام کرسکتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ مقامی ملکوں کا تعاون بھی حاصل کرسکتا ہے اور طاقت کا استعمال بھی کرسکتا ہے جو جرم کی شدت پر منحصر ہے۔

فاٹا کی آئینی اور سیاسی حیثیت

قبائلی علاقہ جات ابتداء سے ہی وفاقی حکومت کے زیرانتظام چلے آرہے ہیں جن کا نظم ونسق صدر پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے گورنر سرحد چلاتا ہے۔ اس علاقے میں کوئی سیاسی یا انتظامی ادارہ موجود نہیں ہے۔ افغانستان ساتھ 29 سوکلومیٹر تک یہ علاقہ پھیلا ہوا ہے۔ اس سرحد کو ڈیورنڈ لائن کہا جاتا ہے۔ سرمورٹی مورڈیورنڈ کے نام سے موسوم ہے۔ سرڈیورنڈ نے برطانوی راج کے دوران 1890ء سے 1894ء تک اس سرحد کا تعین کیا۔ قبائلی علاقہ پاکستان کے کل رقبے کا 3.4 فیصد ہے۔ اس کے مشرق میں پنجاب وصوبہ سرحد اور جنوب میں بلوچستان باجوڑ ایجنسی، مہمند ایجنسی، خیبر ایجنسی، اورکزئی ایجنسی، کرم ایجنسی، شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان کے علاوہ چھ فرنٹیئر ریجنز پشاور، کوہاٹ، بنوں، لکی مروت، ڈیرہ اسماعیل خان اور ٹانک پر مشتمل ہے۔ اورکزئی ایجنسی کے سوا تمام ایجنسیوں کی سرحد

افغانستان سے متصل ہے۔ 1998ء کی مردم شماری کے مطابق مسلمان پختون قبائل کے مسکن قبائلی علاقہ میں صدی سے زیادہ عرصے سے کچھ اقلیتیں جن میں ہندو وسکھ شامل ہیں بھی آباد ہیں۔

قبائلی علاقہ جات کا مجموعی رقبہ 27220 مربع کلومیٹر اور افغانستان کے ساتھ اس کی سرحد تقریباً 2900 کلومیٹر ہے۔ 1998ء کی مردم شماری کے مطابق اکثریتی آبادی 31لاکھ 70 ہزار پشتونوں پر مشتمل ہے اور اس کی سات ایجنسیاں ہیں۔

1-باجوڑ ایجنسی:۔ یہ رقبے کے لحاظ سے سب سے چھوٹی ایجنسی ہے۔ اس کا مجموعیہ رقبہ 1290 مربع کلومیٹر ہے۔ آبادی پانچ لاکھ پچانوے ہزار کے قریب ہے۔ اس کی سرحد افغانستان کے صوبہ کنڑ سے ملحقہ ہے۔ سلارزئی، ارنگ، تارکنے، ماموند اور اتمانخیل اہم قبیلے ہیں۔

2- خیبر ایجنسی:۔اس کا کل رقبہ 2576 مربع کلومیٹر ہے۔ اس کا نام تاریخی درہ خیبر سے لیا گیا ہے جو صوبہ سرحد اور افغانستان کے صوبے ننگرہار کو آپس میں ملاتا ہے۔ آفریدی، شنواری اور ملاگوری اس کے اہم قبیلے ہیں اور اس کی آبادی پانچ لاکھ سینتالیس ہزار کے قریب ہے۔

3- مہمند ایجنسی:۔اس کا مجموعی رقبہ 2296 مربع کلومیٹر ہے اور آبادی تین لاکھ چونتیس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ اس ایجنسی میں بسنے والی قوموں میں خویزئی، حلیم، زئی، ترکزئی، بائزئی، اتمان خیل اور صافی شامل ہیں۔ اس کے شمال میں باجوڑ ایجنسی، مشرق میں ملاکنڈ، جنوب مشرق میں پشاور، مغرب میں افغانستان واقع ہے۔

4- کرم ایجنسی:۔کرم ایجنسی کا مجموعی رقبہ 2576 مربع کلومیٹر اور آبادی چار لاکھ پچاس ہزار ہے۔ اس میں طوری، منگل، چمکنی، مسدزئی، علی شیر زئی، خوئیداد خیل اور بنگش قبائل آباد ہیں۔ اس کے شمال مغرب میں افغانستان کا صوبہ ننگرہار ہے اور جنوب مغرب میں صوبہ پکتیا واقع ہے۔

5-اورکزئی ایجنسی:۔اس کا کل رقبہ 1538 مربع کلومیٹر اور آبادی دو لاکھ پچیس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ یہاں بسنے والی قوموں میں علی خیل، فیروز خیل، اتمان خیل، آخیل،

ملاخیل، برآمد خیل، ماموزئی، مشتی اور شیخان شامل ہیں۔ یہ فاٹا کی واحد ایجنسی ہے جس کی افغانستان کے ساتھ سرحد نہیں ہے۔ اس کے مغرب میں کرم ایجنسی، شمال میں خیبر ایجنسی، جنوب میں ضلع کوہاٹ اور مشرق کی طرف پشاور واقع ہے۔

6-جنوبی وزیرستان: ۔ یہ سب سے بڑی ایجنسی ہے جس کا کل رقبہ 6620 مربع کلومیٹر ہے اور آبادی چار لاکھ تیس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ اس کے دو اہم قبیلے وزیر اور محسود ہیں۔ شمال میں شمالی وزیرستان ایجنسی اور اس کے مشرق میں ڈیرہ اسماعیل خان واقع ہیں۔ بلوچستان اس کے جنوب کی طرف ہے اور افغانستان مغرب کی طرف واقع ہے۔

7-شمالی وزیرستان: ۔ یہ دوسری بڑی ایجنسی ہے جس کا کل رقبہ 4707 مربع کلومیٹر اور آبادی تین لاکھ اسٹھ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ اس کے دو اہم ترین قبیلے وزیر اور داوڑ ہیں۔ شمالی اور جنوبی وزیرستان ایجنسیاں افغانستان کے صوبہ پکتیا اور خوست کے ساتھ واقع ہیں۔ ان سات قبائلی ایجنسیوں کے ساتھ چھ فرنٹیئر ریجز بھی منسلک ہیں۔

1-ایف آر بنوں: ۔ اس علاقے میں بنوں کے ساتھ سرحدی علاقے شامل ہیں جن میں احمد زئی اور اتمان زئی قبیلے آباد ہیں جبکہ کل آبادی 21521 ہے۔

2-ایف آر ڈی آئی خان: ۔ اس میں شیرانی اور استرانہ قبائل آباد ہیں جبکہ کل آبادی 42825 ہے۔

3-ایف آر کوہاٹ: ۔ اس علاقے میں زرغون خیل، اخروال، شیراکئی، چورچھپر، بوستی خیل اور جواکی قبائل کے تقریباً 98821 افراد مقیم ہیں۔

4-ایف آر لکی مروت: ۔ اس علاقے کی آبادی 7675 نفوس پر مشتمل ہے۔

5-ایف آر پشاور: ۔ اس میں حسن خیل، اشوخیل، پسانی اور جناں کور قبیلے آباد ہیں۔ اس کی آبادی 59215 افراد پر مشتمل ہے۔

6-ایف آر ٹانک: ۔ ٹانک کے سرحدی علاقوں میں بھٹنی قبیلہ آباد ہے۔ اس ایجنسی کی آبادی 29895 ہے۔

قبائلی علاقہ جات اقتصادی طور پر پاکستان کے پسماندہ ترین علاقوں میں سرفہرست ہیں۔ یہاں کی متوسط فی کس قومی آمدنی پانچ سو ڈالر سالانہ سے بھی آدھی ہے۔

60 فیصد کے قریب آبادی غربت کی لکیر ایک امریکی ڈالر فی کس یومیہ آمدن سے نیچے بستی ہے۔ فی کس ترقیاتی خرچ مبینہ طور پر قومی اوسط کا ایک تہائی ہے۔ سماجی شعبہ بھی خستہ حال ہے۔ ملک کی 43 فیصد شرح خواندگی کے مقابلے میں یہاں شرح خواندگی صرف 17.42 فیصد ہے۔ مردوں کی شرح خواندگی 29 فیصد اور خواتین کی شرح خواندگی 3 فیصد ہے جبکہ خواتین کی قومی شرح خواندگی 32.6 فیصد ہے۔ معدنیات اور قدرتی ذرائع سے استفادہ نہیں کیا گیا اور زیادہ تر مقامی باشندے زراعت پر انحصار کرتے ہیں۔ صنعتی ترقی نہ ہونے کی وجہ سے بہت کم ملازمتیں دستیاب ہیں۔ پولیٹیکل انتظامیہ قبائلی علاقہ جات میں اقتصادی ترقی اور منصوبہ سازی کا مرکز و محور ہے۔ مقامی حکومتی ادارے اور سماجی تنظیمیں بہت ہی کم اثر رکھتی ہیں۔ پولیٹیکل ایجنٹ مرکزی ترقیاتی منتظم اور منصوبہ ساز ہیں اور رسمی معاشی نظام سرکاری اہتمام کے تحت چنے گئے مقامی معززین و عمائدین کی سرپرستی پر قائم ہے۔ پولیٹیکل ایجنٹ کے اقتصادی کنٹرول کے طریقوں میں ایجنسیوں کے مابین درآمدات و برآمدات کے لیے پرمٹوں کی تقسیم بھی شامل ہے۔

پولیٹیکل ایجنٹ ترقیاتی منصوبوں کو منظور بھی کرتا ہے اور ان پر عملدرآمد بھی کرتا ہے۔ اکثر منصوبوں کی منظوری اور ان پر عملدرآمد سیاسی و انتظامیہ ترجیحات کے مطابق ہوتا ہے۔ اس منصوبہ سازی اور عملدرآمد کے کسی بھی مرحلے پر مقامی آبادی یا پارلیمانی نمائندوں کا بھی کوئی کردار نہیں ہوتا۔ پولیٹیکل ایجنٹ حکومت کی طرف سے ان منصوبوں کا پراجیکٹ ڈائریکٹر بھی ہوتا ہے۔

سرحد پار سے سمگلنگ اور افغان جنگ کے بعد پیدا ہونے والی لاقانونیت اور اسلحے و منشیات کی بڑھتی ہوئی تجارت کے باعث اقتصادی حالات کو سدھارنے کے امکانات مخدوش نظر آتے ہیں۔ قانون کی انتہائی کمزور عملداری اور قبائلی علاقہ جات کی افغانستان کے ساتھ سرحدوں کے اتصال کی وجہ سے عام استعمال کی پرتعیش اشیاء کی سمگلنگ ایک پرکشش تجارت ہے جس سے ٹیکسوں اور محصولات کی مد میں کروڑوں کا نقصان ہوتا ہے۔

1956ء کا پہلا آئین جو پارلیمانی طرز حکومت فراہم کرتا تھا اور پورے پاکستان پر لاگو ہوتا تھا، قبائلی علاقہ جات کے سیاسی اور انتظامیہ معالات میں کوئی تبدیلی نہ لا سکا۔

1962ء کے آئین کا آرٹیکل 223 قبائلی علاقہ جات کو ان کے مخصوص حالات اور مسائل کی وجہ سے مرکزی اور صوبائی قوانین کے دائرہ اطلاق سے باہر رکھتا ہے۔ قانون سازی اور عدلیہ کے مخصوص اختیارات صوبہ سرحد کے گورنر کو دیئے گئے۔ صدر ایوب خان کے دور میں بنیادی جمہوریتوں کا نظام متعارف کرایا گیا اور قبائلی علاقہ جات کو صوبائی اور قومی اسمبلیوں میں نمائندگی دی گئی۔ 1973ء کے آئین کے آرٹیکل 247 کے مطابق قبائلی علاقہ جات وفاق کے ماتحت ہیں۔

آرٹیکل 247 اور اس سے متعلقہ SRO-109 جو 1970ء میں جاری ہوا، کے مطابق قبائلی علاقہ جات کے انتظامی اختیارات صدر کے پاس ہیں جو یہ اختیارات گورنر سرحد کو اپنی صوابدید پر منتقل کرتا ہے اور گورنر صدر کی طرف سے دی گئی ہدایات اور اختیارات کے مطابق عمل کرتا ہے۔ صدر کے نمائندہ کے طور پر گورنر کو قبائلی علاقہ جات کے امور سے متعلق مقرر کیے گئے افسران کی خدمات بھی حاصل ہوتی ہیں۔

قبائلی رسم و رواج کے تحفظ کی آڑ میں قبائلی علاقہ جات کے عوام کو سیاسی وابستگی اور شمولیت کے بنیادی حق سے مسلسل محروم رکھا گیا ہے۔ کچھ لوگوں کے خیال میں سرکاری حلقوں میں قبائلی علاقہ جات سے متعلق سیاسی جماعتوں اور سیاست جیسے الفاظ کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قبائلی عوام کو ملک کے دیگر عوام کی نسبت الگ تھلگ رکھا گیا ہے۔ سیاسی جماعتوں کی غیر موجودگی میں بھی قبائلی نمائندے منتخب ہو کر اسمبلیوں میں آتے رہے ہیں جو سیاسی وابستگی اور مقامی حمایت نہ ہونے کے باوجود حکومتی سرپرستی کے زور پر منتخب ہوتے ہیں۔

فوجی حکمرانوں یا ان کے ماتحت حکومت نے ہمیشہ معتدل سیاسی پارٹیوں کو ان علاقوں سے دور رکھ کر قدامت پسند گروہوں کو تیزی سے پھیلنے کا موقع دیا۔ 1980ء سے روس مخالف سرگرمیوں کے لیے بنیادی مرکزی رہنے کے باعث اور پھر افغانستان میں طالبان کے اقتدار کے بعد ان علاقوں میں مذہبی انتہاپسندی کو پنپنے کا موقع ملا۔ مذہبی انتہاپسندی کے فروغ سے معتدل سیاسی جماعتوں کے علاوہ مقامی عمائدین کے اثر و رسوخ میں بھی کمی واقع ہوئی ہے۔ کچھ لوگ اس کا نقطہ آغاز جہاد افغانستان کو بھی ٹھہراتے ہیں۔

آئین کا آرٹیکل ون قبائلی علاقہ جات کو پاکستان کا حصہ قرار دیتا ہے۔ آرٹیکل 246 تقریباً گیارہ ایسے علاقوں اور ایجنسیوں کی نشاندہی کرتا ہے جن پر قبائلی علاقہ جات مشتمل ہیں۔

آرٹیکل 247 قبائلی علاقہ جات کے نظم ونسق کے طریقہ کار کی وضاحت کرتا ہے جس کے مطابق ان علاقوں میں وفاق کے زیرانتظام اختیارات کا استعمال صدر کی ہدایت پر گورنر کرتا ہے۔ مروجہ قوانین کا اطلاق اور نئے احکام کا نفاذ قبائلی علاقہ جات میں اسی اصول کے تحت ہوتا ہے۔ قبائلی علاقہ جات میں سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے دائرہ عمل کو آرٹیکل 247 کے تحت ہی محدود کیا گیا ہے۔ پارلیمنٹ آئینی ترمیم کے تحت اس رکاوٹ کو دور کر سکتی ہے مگر قبائلی علاقہ جات کے مفاد میں کبھی اس طرف توجہ نہیں دی گئی۔ آرٹیکل 142-D کے تحت پارلیمنٹ کے پاس یہ خصوصی اختیار ہے کہ وہ ان معاملات کے لحاظ سے قانون سازی کرے جو وفاق کے زیرانتظام ان علاقوں سے متعلق ہیں جو صوبوں میں شامل نہیں۔

آرٹیکل 258 صدر کو صوبوں کے علاوہ پاکستان میں شامل علاقوں کے اندر امن و امان اور حکومتی عملداری قائم کرنے کا اختیار دیتا ہے جسے پارلیمنٹ چاہے تو قانون سازی کے ذریعے تبدیل بھی کر سکتی ہے۔ آئین قبائلی علاقہ جات کو قومی پارلیمنٹ میں نمائندگی کا حق دیتا ہے۔ آرٹیکل 51 کے تحت قومی اسمبلی میں قبائلی علاقہ جات کے لیے 12 نشستیں مختص کی گئی ہیں جن کے لیے بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر انتخاب ہوتا ہے۔ آرٹیکل 59 کے تحت سینٹ میں قبائلی علاقہ جات کیلئے 8 نشستیں مختص ہیں جنھیں قومی اسمبلی میں قبائلی ممبران کے ذریعے بالواسطہ منتخب کیا جاتا ہے۔

آئینی طور پر قبائلی علاقہ جات ہر لحاظ سے واضح طور پر پاکستان کا اہم حصہ ہیں۔ آئین ان بنیادی حقوق کی بھی وضاحت کرتا ہے جو ہر پاکستانی کو حاصل ہیں لیکن قبائلی علاقہ جات کے سپریم کورٹ اور ہائیکورٹ کے دائرہ اختیار میں نہ ہونے اور آرٹیکل (7)274 کی رکاوٹ کی وجہ سے آئین میں شامل آرٹیکل 199 اور 184 کے تحت قبائلی عوام کو بطور پاکستانی یہ حقوق حاصل ہونے کے باوجود میسر نہیں۔

قبائلی علاقہ جات میں عسکری رجحانات اور ماضی میں ناکام فوجی کارروائیوں کے

بعد مختلف حلقوں کا کہنا تھا کہ قبائلی علاقہ جات کے انتظامی ڈھانچے اور حکومتی نظام میں وسیع البنیاد اصلاحات کی اشد ضرورت ہے۔ اس دباؤ کے زیراثر سابق صدر پرویز مشرف کی حکومت نے وفاقی قبائلی علاقہ جات کے لیے دور رس تبدیلیوں اور ان علاقوں میں پولیٹیکل ایجنٹ سسٹم کے خاتمہ اور انتظامی ڈھانچے کو صوبہ سرحد میں مدغم کرنے کا عزم کیا لیکن دیگر سیاسی مسائل کی طرح یہ مسئلہ بھی لٹکتا رہا اور کوئی بامعنی اصلاحات شروع کرنے کی بجائے حکومت محض بناوٹی اندامات ہی اٹھاتی رہی۔ اگرچہ ایف سی آر میں اصلاحات کے حوالے سے سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر تحقیقی اور مشاورتی رپورٹوں کی کوئی کمی نہیں۔ 2005ء میں گورنر سرحد نے ایک سابق چیف جسٹس کی سربراہی میں ایف سی آر ریفارم کمیٹی قائم کی۔ تفصیلی بحث اور مشاورت کے بعد کمیٹی نے گورنر کو اپنی سفارشات پیش کیں۔ گو کہ یہ سفارشات عام نہیں کی گئیں۔ البتہ کمیٹی کے بعض ممبران نے بتایا کہ سفارش کردہ اصلاحات میں سیکشن 40 کا خاتمہ، قید کے عرصے میں تخفیف، اجتماعی ذمہ داری، شقوں میں تبدیلی، خواتین اور بچوں پر تشدد کی روک تھام اور پولیٹیکل ایجنٹ کو زیادہ قابل احتساب بنانا شامل تھا۔ بعض حلقوں کا کہنا ہے کہ اگر ایف سی آر کی کچھ شقوں میں تبدیلی بھی کی جائے۔ پھر بھی ظلم پر مبنی اس قانون سے قبائلی عوام کی مساوی حقوق اور انصاف تک رسائی ممکن نہیں بنائی جا سکتی۔

2006ء میں مشرف حکومت نے لوکل گورنمنٹ آرڈیننس کی طرز پر فاٹا لوکل گورنمنٹ ریگولیشن ترتیب دیا۔ اس سے قبل جب پورے ملک میں لوکل گورنمنٹ نظام لاگو کیا جا رہا تھا تو اس وقت قبائلی علاقہ جات کو یہ کہہ کر ایل او جی کی دسترس سے باہر رکھا گیا کہ وہ وہاں کے عوام ایسا نہیں چاہتے۔ یہ تاثر بھی عام تھا کہ قبائل کوئی نیا نظام قبول نہیں کرتے۔ روایات کی سخت پاسداری کرتے ہیں اور موجودہ سسٹم ان کو اس لیے مناسب لگتا ہے کہ وہ اس کے عادی ہیں اور اپنی رسموں کو کسی بھی دوسرے حکومتی نظام کی نسبت بہتر سمجھنے کی وجہ سے قبائلی روایات کی پاسداری کو زیادہ آسان سمجھتے ہیں، لہٰذا لوکل گورنمنٹ نظام کی بجائے صوبہ سرحد کے گورنر نے ایک نوٹس جاری کیا جو عبوری ایجنسی کونسلز کے ذریعے ترقیاتی اور اہم علاقائی امور میں مقامی لوگوں کی شمولیت کو سہل بنانے کے متعلق تھا۔ ان کونسلز کے لیے تین

سال کا دورانیہ مقرر کیا گیا۔

اس نظام کے بعد بھی تمام ایگزیکٹو اختیارات پولیٹیکل ایجنٹ کے پاس رہے اور اس کا فیصلہ حتمی سمجھا جاتا تھا۔ البتہ پولیٹیکل ایجنٹ کونسل کے ممبران کو مختلف مانیٹرنگ کمیٹیوں اور سب کمیٹیوں کے لیے نامزد کرتا، لیکن یہ کمیٹیاں بھی پولیٹیکل ایجنٹ کے ماتحت ہی کام کرتی تھیں۔ 18 فروری کے انتخابات کے بعد وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی نے اپنی پہلی تقریر کے دوران قبائلی علاقہ جات سے ایف سی آر کا قانون ختم کرنے کا اعلان کیا تھا، تاہم اس پر بھی تاحال کوئی عملدرآمد نہیں ہو سکا ہے۔

وزیرستان کا تاریخی، عسکری پس منظر

پاکستانی فورسز (آرمی) نے فضائیہ اور پیراملٹری فورسز کے ساتھ مل کر 17 اکتوبر کو جنوبی وزیرستان میں موجود طالبان، جہادی تنظیموں اور غیر ملکی عسکریت پسندوں کے خلاف فیصلہ کن آپریشن (راہ نجات) کی باقاعدہ ابتداء کر لی۔

ذرائع کے مطابق یہ فاٹا میں فورسز کی جانب سے سولہویں جبکہ وزیرستان میں نویں کارروائی تھی جنوبی وزیرستان صوبہ سرحد کے جنوب میں واقع اپنی ترتیب کے لحاظ سے قبائلی ایجنسیوں کی وہ سب سے آخری ایجنسی ہے جس کی سرحدیں کچھ ہی فاصلے پر بیک وقت شمالی وزیرستان ڈی آئی خان، ٹانک اور بلوچستان سے ملتی ہیں۔

اس سے کچھ ہی فاصلے پر وہ مشہور زمانہ کوہ سلیمان واقع ہے جس کے اوپر دنیا کا سب سے مصروف ایئر روٹ اور ایئر پاکٹ واقع ہے اور جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ القاعدہ نے 1999ء کے دوران فیصلہ کیا تھا کہ اس علاقے کو القاعدہ کے قبضے میں لا کر اپنے محفوظ ٹھکانے میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ تاریخ میں وزیرستان عالمی برادری کی نظر میں غالباً بڑی اہمیت کے ساتھ اس وقت آ گیا تھا جب مرزا علی خان (فقیر آف ایپی) نے انگریزی راج کے خلاف ہزاروں ساتھیوں کے ہمراہ گوریلا جنگ کا سلسلہ شروع کر دیا اور مزاحمت کی ایسی مثالیں قائم کیں کہ انگریز سرکار کو ہوائی جہازوں کے ذریعے تیں بار حملے کرنا پڑے۔ اس ایجنسی کے علاقے انگور آڈہ سے چند ہی فرلانگ پر افغان سرحد شروع ہو جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس علاقے میں نہ صرف یہ کہ پاکستانی فورسز اور طالبان کے درمیان ماضی میں

جھڑپیں ہوتی رہی ہیں بلکہ دو بار امریکی دستے بھی پاکستانی حدود کی خلاف ورزی کر کے طالبان اور غیر ملکیوں کے خلاف کارروائی کر چکے ہیں۔

1978ء کو جب افغانستان میں تبدیلی آ گئی اور روسی دستے افغانستان میں داخل ہو گئے تو ایک لاکھ اٹھارہ ہزار افراد جنوبی وزیرستان میں مہاجر بن کر داخل ہوئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انہی مہاجرین کے توسط سے وزیرستان کے عوام اور مجاہد تنظیموں کے درمیان نہ صرف رابطے قائم ہوئے بلکہ یہاں کے عوام نے جہاد میں نمایاں حصہ بھی لینا شروع کیا۔ اس سے قبل یہاں کے قبائل 1948ء اور 1965ء کی پاک بھارت جنگوں میں بھی نمایاں کارنامے انجام دے چکے تھے۔ لمبا قد' گوری رنگت اور صحت مند جسمانی خدوخال کے حامل وزیرستان کے باشندے مہمان نوازی' بہادری اور جذبہ حریت جیسی خصوصیات سے مالامال ہو کر ہر دور میں دوسروں سے نمایاں رہے۔ جنوبی وزیرستان میں بڑے قبائل یعنی محسود' وزیر' داوڑ' احمد زئی' طوری خیل اور بھیٹنی رہائش پذیر ہیں۔

2003ء کے بعد اب تک کی جاری مزاحمت کو ہم وزیرستان کو جہادی اور قبائلی پس منظر کے حوالے سے دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یہاں مزاحمت کاروں کے دو گروپ بہت نمایاں اور فعال رہے ہیں۔ ایک گروپ کو ہم عبداللہ محسود' نیک محمد اور بیت اللہ محسود سے ہوتے ہوئے حکیم اللہ' قاری حسین' ولی الرحمان اور دوسرے کمانڈروں کا گروپ کہہ سکتے ہیں۔ اس گروپ کی قیادت ہمیشہ وزیرستان کے محسود قبیلے کے ہاتھ میں رہی ہے اور یہ لوگ پاکستان کے مخالف کیمپ (جہادیوں) سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ طالبان کے دوسرے گروپ کو وزیر قبیلے کا گروہ کہا جا سکتا ہے اور اس گروپ کو ہم پرو گورنمنٹ کے نام سے یاد کر سکتے ہیں۔ اس گروپ کے نمائندہ کمانڈروں یا سرداروں میں ملا نذیر، حاجی محمد عمر، جاوید وزیر، غلام جان، حاجی شریف، میٹھا خان وزیر اور ولی محمد وزیر (نیک محمد کا بھائی) سمیت متعدد دوسرے شامل ہیں۔ اعظم درسک' وانا' کالوشہ' انگور آڈہ (بفر) لدھا، سپینکئی، رغیزئی اور شکئی، جنڈولہ جنوبی وزیرستان کے وہ علاقے ہیں جہاں فورسز اور طالبان کے درمیان 2003ء سے لے کر 2009ء تک تقریباً 75 جھڑپیں ہوئی ہیں۔ جنوبی وزیرستان میں ترکی سے تعلق رکھنے والے ابو حمام گروپ کے علاوہ افغان طالبان' پنجابی طالبان' ازبکستان اسلامی موومنٹ اور بعض عرب

ممالک سمیت چینی اسلامک پسندوں کے عناصر نے بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ اسی ایجنسی کے علاقے انگور آڈہ میں پاکستانی فورسز نے چینی تنظیم کے سربراہ کے علاوہ طاہر یلدیشوف کا بھی گھیراؤ کیا تھا جس میں اول الذکر مر گیا تھا جبکہ دوسرا زخمی ہو کر بھاگ نکلا تھا۔

ایک دوسرے موقع پر طاہر یلدیشوف کو اس کے ساتھیوں سمیت کالوشہ میں بھی گھیرا گیا تاہم وہ اس بار بھی زخمی ہو کر بھاگنے میں کامیاب ہوا۔

اس صورتحال سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فاٹا میں اب تک فورسز کے خلاف جتنی مزاحمت جنوبی وزیرستان میں ریکارڈ کی گئی اس کا موازنہ دوسری تمام ایجنسیوں سے نہیں کیا جا سکتا۔ مجموعی طور پر جنوبی وزیرستان میں 12 مقامی جبکہ سات غیر مقامی تنظیمیں موجود ہیں۔ جنوبی وزیرستان میں پاکستان کے خلاف مزاحمت نیک محمد اور عبداللہ محسود کے ادوار میں شروع ہوئی تھیں۔ اس میں شدت 2003ء کے اواخر میں دیکھی گئی۔ فورسز کو اس انداز سے پھنسایا جاتا رہا کہ فوجی حکومت نے مئی 2004ء کو شکئی معاہدے کے ذریعے عملاً طالبان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور اس وقت کے کور کمانڈر پشاور صفدر حسین نے نیک محمد کے گلے میں ہار ڈال کر ان کو امن کا داعی کہہ کر پکارا تھا۔

مئی 2004ء کے معاہدے پر امریکہ نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور ردعمل کے طور پر 18 جنون 2004ء ہی کو ایک ڈرون حملے کے دوران اس کا خاتمہ بھی کر دیا گیا۔ اس حملے کے بعد 2009ء تک کے عرصہ کے دوران امریکہ نے ایک محتاط اندازے کے مطابق تادم تحریر 31 حملے کیے ہیں جنوبی وزیرستان کے ان حملوں میں اگست کا وہ حملہ بھی شامل ہے جس میں تحریک طالبان پاکستان کے امیر بیت اللہ محسود زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ یوں پاکستان، امریکہ مخالف بڑے طالبان کمانڈرز یعنی نیک محمد (2004ء) عبداللہ محسود (2007ء) اور بیت اللہ محسود (2009ء) یکے بعد دیگرے امریکی اور پاکستانی کارروائیوں کا نشانہ بن کر محض تاریخ کا حصہ بن گئے۔ ان کی ہلاکتوں کے باوجود جنوبی وزیرستان میں ''اسلامی امارت'' کی عملداری قائم رہی اور پاکستانی رٹ کے قیام کا خواب تاحال شرمندہ تعبیر ہونے کا منتظر ہے۔

تاہم اس دوران بیت اللہ کا گروپ اتنا طاقتور ہوتا گیا کہ اس نے نیک محمد اور عبداللہ کی ہلاکتوں کے بعد اپنی کارروائیاں دوسرے علاقوں' قبائلی ایجنسیوں اور بندوبستی اضلاع تک بڑھا دیں۔ نومبر 2006ء کو اس گروپ نے درگائی کے مقام پر آرمی ٹریننگ بیس میں خودکش حملہ کر کے 40 سپاہیوں کی ہلاکت اور اگست 2007ء میں 300 سپاہیوں اور انگورآڈہ کی دوسری طرف واقع ایک سرحدی امریکی چوکی سے نصف درجن سے زائد امریکیوں کے اغوا سے جس مہم کی ابتداء کی تھی اس کے اثرات اور عملی کارروائیوں کا تسلسل بعد میں پورے پاکستان میں آئے روز کے حملوں' دھماکوں اور دوسرے اقدامات کی صورت میں دیکھا گیا۔

حکومت پاکستان اور وزیرستان کے طالبان اب تک دو بڑے معاہدے کر چکے ہیں۔ ایک 2004ء کو نیک محمد کے ساتھ (معاہدہ شکئی) اور دوسرا بیت اللہ محسود کے ساتھ 2006ء (ستمبر) کو معاہدہ سارا روغہ۔ ان معاہدوں کی ناکامی اور اثرات ہی نے مصالحت' مذاکرات اور اعتماد سازی کے تمام دروازے اس طریقے سے بند کر دیئے کہ 2009ء میں فریقین ایک فیصلہ کن اور خونریز جنگ لڑنے پر تیار ہو کر ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہو گئے۔

آپریشن راہ نجات شروع ہونے کے بعد بیت اللہ گروپ نے کھل کر جنگ لڑنے کی بجائے غاروں' خندقوں اور جنگلوں میں ٹھکانے بنا کر اپنی قوت کو بچانے کی کوشش کی حکمت عملی اپنائی جبکہ اعلیٰ قیادت نہ صرف محفوظ مقامات پر ڈیرے ڈالے بیٹھی رہی بلکہ متعدد دوسرے علاقوں خصوصاً کرم اور اورکزئی کی ایجنسیوں میں منتقل ہوگئی۔ اس حکمت عملی کے تحت یہ لوگ وزیرستان میں مزاحمت کے بجائے اپنے اتحادی گروپوں کے ساتھ مل کر پاکستان کے بڑے شہروں اور وہاں موجود اعلیٰ سیاسی اور حکومتی قیادت کو نشانہ بنانے کی پلاننگ پر عمل پیرا رہے۔

پاکستانی حکومت اور عسکری قیادت نے اسلامی امارت آف وزیرستان پر قبضہ کرنے یا اس کو پاکستانی کنٹرول میں لانے کے لیے ابتداء میں زمینی فورسز کے بجائے ہوائی حملوں اور بھاری توپ خانے پر انحصار کر کے امریکی فارمولے کو اپنایا۔ اس کی بڑی وجہ

طالبان کی اس مزاحمت سے خود کو بچائے رکھنا تھا جو کہ وہ خود کش حملوں اور گوریلا کارروائیوں کے ذریعے غاروں' جنگلوں اور پہاڑوں سے نکلنے کے بعد فورسز پر کرنے کا پروگرام بنائے ہوئی تھی۔ پشاور میں موجود عسکری ذرائع طالبان کی خاموشی اور فورسز کی پیش قدمی کو شک' حیرت اور تشویش کی نظر سے دیکھتے رہے کیونکہ فریقین کے درمیان جس جنگ کی توقع کی جا رہی تھی وہ سامنے نہیں آئی تھی۔ اے این پی کے رہنما افراسیاب خٹک کے مطابق وزیرستان کا آپریشن صوبہ سرحد اور پورے پاکستان کی سلامتی اور امن و امان کی بحالی کے لیے ناگزیر ہو چکا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وزیرستان میں طالبان کی اسلامی امارت کے ہوتے ہوئے پاکستان کی سلامتی کو ممکن نہیں بنایا جا سکتا۔

انہوں نے بتایا کہ ان کی اطلاعات کے مطابق پاکستان کے قبائلی علاقوں میں 5000 سے لے کر 7000 تک غیر ملکی جنگجو موجود تھے جبکہ وزیرستان میں پنجاب' کشمیر اور دوسرے علاقوں سے تعلق رکھنے والے اور مقامی' غیر ملکی عسکریت پسندوں کی تعداد ان کی معلومات کے مطابق 20 ہزار کے لگ بھگ تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر فورسز نے سوات کی طرح تندہی اور تیاری کے ساتھ پیش قدمی کی تو شرپسندوں کا خاتمہ ممکن ہو جائے گا اور ایسا کرنا پاکستان کی سلامتی اور خطے کے استحکام کے لیے انتہائی ضروری ہو گیا ہے۔

افراسیاب کے بالمقابل سرکاری اداروں کا کہنا تھا کہ وزیرستان میں جنگجوؤں کی تعداد سات سے دس ہزار تک ہے جن میں ایک ہزار غیر ملکی بھی ہیں۔ (اطہر عباس کے متعدد بیانات) جبکہ آزاد ذرائع اور خود افراسیاب خٹک یہ تعداد پاک فوج کے اندازے سے زائد بتا رہے تھے۔ آزاد اور مقامی ذرائع کے مطابق وزیرستان میں لڑنے والوں کی تعداد کسی بھی طور 25 ہزار سے کم نہیں۔

اس تعداد میں حکومت کے حامی گروپ شامل نہیں ہیں۔ ایک معتبر ذرائع نے رابطے پر بتایا کہ سب سے موثر ترین طالبان قوت یعنی حقانی گروپ وزیرستان آپریشن کے بعد اس قسم کے حالات سے لاتعلقی کی اپنی پالیسی پر نظر ثانی کر سکتا ہے اور اگر اس گروپ نے بیت اللہ کو مدد فراہم کی تو جنگ یا مزاحمت کا نقشہ ہی الٹ جائے گا۔ دوسری طرف لشکر طیبہ' لشکر جھنگوی' جیش محمد' سپاہ صحابہ' حرکت جہاد اسلامی اور متعدد دوسری تنظیمیں بھی اس لڑائی سے

الگ تھلگ رہنے کے بجائے اس کا باقاعدہ حصہ بننے کا فیصلہ کر چکی تھیں جبکہ وزیر داخلہ رحمان ملک نے 2 نومبر 2009ء کو یہ اعتراف کیا کہ وزیرستان میں پانچ ہزار غیر ملکی موجود ہیں' تاہم ایسے شواہد سامنے آ چکے تھے کہ جنوبی وزیرستان میں 12 مقامی طالبان گروپ' پانچ غیر ملکی تنظیمیں اور چھ سے زائد پنجابی' کشمیری اور فرقہ ورانہ تنظیمیں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھیں۔

یاد رہے کہ مقامی گروپ سب کے سب دیو بندی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں جن میں محسود اور دوسری اقوام یا نسلوں سے یہ مقامی تنظیمیں تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں محسود، احمدزئی وزیر، کرماز خیل وزیر، بھیٹنی، اتمانزئی وزیر، داوڑ اور طوری خیل شامل ہیں جن میں بیت اللہ گروپ، شہریار گروپ، سید عالم گروپ، ملا نذیر گروپ، کمانڈر عباس گروپ، نور الاسلام گروپ، حاجی شریف گروپ، حاجی عمر گروپ، غلام جان گروپ، کمانڈر جاوید گروپ، اول خان بھیٹنی گروپ اور ڈاکٹر گل زمان خان گروپ، عربی، چینی، وسطی ایشیائی، افغانی، پنجابی، کشمیری اور دوسری غیر ملکی تنظیمیں بھی بیت اللہ گروپ کا ساتھ دے رہی ہیں۔ ایک نقطہ نظر کے مطابق وزیرستان کے طالبان نے ایک حکمت عملی کے تحت دوسری ایجنسیوں میں منتقل ہونے کو ترجیح دی ہے۔

اس سلسلے میں کرم' اورکزئی اور مہمند کے نام لیے جاتے ہیں جبکہ یہ لوگ دشوار گزار پہاڑی راستوں کے ذریعے افغانستان بھی منتقل ہوئے لیکن ایسا ہونے کی صورت میں یہ خدشہ بھی ظاہر کیا جاتا رہا کہ وزیرستان پر حکومت کا کنٹرول تو قائم ہو جائے، تاہم طالبان کا نہ صرف یہ کہ خاتمہ ممکن نہیں ہو سکے گا بلکہ وہ دوسرے علاقوں تک پھیل کر مزید تباہی اور مزاحمت کا سبب بن جائیں گے۔

شاید یہی وجہ تھی کہ ڈی جی آئی ایس پی آر اطہر عباس نے یکم نومبر کو اپنی بریفنگ کے دوران کہا کہ وزیرستان میں مزاحمت کاروں کا وہ ردعمل سامنے نہیں آ رہا جس کی توقع تھی۔ انہوں نے طالبان قیادت کی شمالی وزیرستان منتقلی کا خدشہ بھی ظاہر کیا۔ تاہم ان کا کہنا تھا کہ طالبان کے خاتمے یا ہتھیار ڈالنے تک تمام علاقوں میں ان کا پیچھا کیا جائے گا۔ وزیرستان آپریشن کے دوران یہ دعویٰ بہت سے خدشات کو جنم دینے کا سبب بنا کہ افغانستان

کی سرحد کے قریب متعدد ہیلی کاپٹرز نے لینڈنگ کر کے بے شمار افراد کو اٹھاتے ہوئے افغانستان منتقل کیا جبکہ بعض ذرائع کا یہ بھی کہنا تھا کہ امریکہ اور نیٹو نے پاکستان کے سرحدی علاقے پر افغانستان میں واقع اپنی بعض چیک پوسٹوں کو بھی خالی کرا دیا جس کے بارے میں نہ تو امریکہ نے کوئی وضاحت پیش کی اور نہ ہی اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ ایسا کرتے ہوئے پاکستانی حکام کو آگاہ کر دیا جاتا۔

چیک پوسٹوں کو خالی کرنے کے حوالے سے امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن سے اسلام آباد کے دورے کے موقع پر سوال بھی کیے گئے لیکن وہ ان کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکی تھیں جبکہ ایسے ہی سوالات کے جواب میں پاکستانی حکام نے امریکہ سے بات کرنے کا عندیہ دیا تھا لیکن ہر دو اقدام پاکستان کی سلامتی اور اس جنگ کی حکمت عملی کے حوالے سے بہت سارے سوالات چھوڑ گئے جن سے عوام میں شکوک و شبہات اور تشویش کا ابھرنا ایک فطری عمل تھا۔

فاٹا اصلاحات میں عجلت کا مظاہرہ

صدر پاکستان آصف علی زرداری نے 14 اگست 2009ء کی اپنی تقریر کے دوران شورش زدہ قبائلی علاقہ جات (فاٹا) میں سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دینے کے لیے پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ کے نافذ اور ظالمانہ قانون ایف سی آر میں بنیادی ترامیم کا اعلان کرتے ہوئے ایک نئی اور پیچیدہ بحث چھیڑ دی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ دونوں کام قیام پاکستان کے بعد ہی ہو جانے چاہیے تھے کیونکہ آزادی کے بعد فاٹا کو انگریزوں کی طرح بفرزون بنائے رکھنا اور انگریز کی پالیسی کے تحت چلانا واقعتاً ایک بلاجواز عمل تھا۔ تاہم سوال یہ ہے کہ کیا صدر موصوف اور ان کی ٹیم نے کبھی غور کیا کہ موجودہ خطرناک اور پیچیدہ ماحول میں ان دو اہم اعلانات کو عملی جامہ پہنایا بھی جا سکتا ہے یا نہیں؟ حقیقت کے تناظر میں دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ موجودہ حالات میں ایسا کرنا بہت ہی مشکل بلکہ ناممکن نظر آتا ہے کیونکہ فاٹا درحقیقت آج عملاً پاکستان کی عملداری ہی میں نہیں ہے۔

اس کے بیشتر علاقوں میں طالبان اور القاعدہ کے ارکان اپنی عملداری بنا چکے ہیں جہاں انہی کے احکامات اور فیصلوں کی پابندی بھی ہوتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ حکومت نے اپنی نیک نیتی کے باوجود ان اعلانات سے قبل وہ ہوم ورک نہیں کیا جس کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی اور جس کی اب بھی ضرورت ہے۔ قبائلی عوام اور ان کے نمائندوں کو منظم اور مربوط طریقے سے اعتماد میں لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی بلکہ ان حلقوں کی رائے معلوم کرنے سے بھی گریز کیا گیا جو کہ فاٹا میں اس قسم کی بنیادی

تبدیلیوں سے متعلق مختلف معاملات پر نہ صرف گہری نظر رکھتے تھے بلکہ انہوں نے مختلف فورم اور تنظیموں کے ذریعے برسوں کی محنت سے ان ایشوز پر کام بھی کیا ہے۔ ایوان صدر اور وزیراعظم ہاؤس کی Consultation کی یہ حالت رہی کہ اے این پی جیسی اتحادی پارٹی بھی کہہ رہی تھی کہ ان کو ایسا کرتے وقت اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ اسفندر یار ولی خان نے اپنی پریس کانفرنس میں لگی لپٹی رکھے بغیر کہا کہ ان سے اس معاملے پر مشاورت نہیں کی گئی۔ دیکھا جائے تو اتنے اہم اعلان کے باوجود پیپلز پارٹی کے لیڈروں، وزراء اور ممبران اسمبلی نے اپنے صدر کے اس اقدام کا اس طریقے سے سیاسی دفاع نہیں کیا اور نہ ہی اس کی تشہیر کی جس کی ضرورت تھی جبکہ فاٹا کے اراکین اسمبلی کی جانب سے بھی اس قسم کا مثبت طرزعمل نہیں آیا جس کی توقع کی جا رہی تھی۔ پیپلز پارٹی کی قیادت نے اس اہم ترین اور بنیادی ایشو کو عجلت اور لاپرواہی کی نذر کر کے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ اس پارٹی کو اچھے کاموں اور فیصلوں کو ڈیل کرنے اور ان کا کریڈٹ لینے کا سلیقہ ہی نہیں آتا حالانکہ اگر پوری تیاری، مشاورت اور موثر ہوم ورم کا مظاہرہ کیا جاتا تو اس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ فاٹا مرکزی دھارے میں آجاتا بلکہ ان علاقوں میں موجود انتہاپسندی اور طالبائزیشن کے آگے بھی مضبوط دیوار کھڑی کی جا سکتی تھی جس کا حکومت کو بڑا کریڈٹ بھی مل جاتا۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ فاٹا کی وجہ سے آج پاکستان تو کیا پورے خطے کی سلامتی داؤ پر لگی ہوئی ہے اور اس خطرناک صورتحال سے نکلنے کے لیے اگر ایک طرف فیصلہ کن کارروائیوں کے ذریعے انتہاپسندوں کو ٹھکانے لگانا ضروری ہو گیا تو دوسری طرف اس سے بھی ضروری کام یہ ہے کہ سات قبائلی ایجنسیوں پر مشتمل اس علاقے میں مین سٹریم پالیٹکس کے ذریعے سیاسی، معاشی، قانونی، عدالتی اور سب سے بڑھ کر اقتصادی اصلاحات بھی کی جائیں۔ اس بات کی کوئی تک نہیں بنتی کہ پاکستان کے اس نازک اور خطرناک علاقے کو ایک صدی گزرنے کے باوجود انگریز سرکار کے رائج کردہ کالونیٹل اور یکطرفہ ظالمانہ قوانین یعنی ایف سی آر وغیرہ کے ذریعے چلایا جائے اور اس پر بھی ستم یہ کہ عالمی برادری کو مختلف حربوں سے اپنے ناکام تجربات کے نام پر اندھیرے میں رکھنے

کی پالیسی کو بھی آگے بڑھایا جاتا رہے۔

1901ء کے دوران اعلان کردہ 1860ء کے ظالمانہ قوانین میں ترامیم کے ذریعے فاٹا کو چلانے کی ناقص اور مجرمانہ پالیسیوں ہی کا نتیجہ ہے کہ وہاں کے عوام کو قومی دھارے میں شامل ہی نہیں ہونے دیا گیا۔ انہی پالیسیوں کا نتیجہ ہے کہ فاٹا میں دنیا بھر کے انتہا پسند (ملکی، غیرملکی) آ کر قابض ہو گئے ہیں اور اب حالت یہ ہے کہ سات میں سے چھ ایجنسیاں نہ صرف یہ کہ عملاً ان عناصر کے قبضے میں ہیں بلکہ ان لوگوں نے اسلامی جمہوریہ پاکستان نامی ایٹمی ملک کے اندر اسلامی امارات وزیرستان کے نام سے الگ ''ریاست'' بھی قائم کر رکھی ہے۔ اس امارت کے اندر نہ تو زمین کے راستے پاکستانی ریاست کا کوئی لیڈر، جرنیل اور اہلکار جا سکتا ہے اور نہ ہی اس امارت کی حدود میں کسی کو پاکستان کا نام لینے کی اجازت دی جاتی ہے۔

یہ بہت عجیب کہانی ہے کہ ان علاقوں میں حکمران پارٹیوں سمیت دوسری کسی پارٹی کو جھنڈا لگانے، جلسہ کرنے اور الیکشن لڑنے کی اجازت نہیں۔ اس کے برعکس جہادی اور عسکری تنظیموں کو نہ صرف سب کچھ کرنے کی کھلی چھٹی ہے بلکہ وہ یہاں بیٹھ کر خطے اور کسی حد تک پوری دنیا پر قبضہ کرنے کی منصوبہ بندیاں بھی کرتی ہیں۔ بدقسمتی تو یہ بھی ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو اور بے نظیر بھٹو شہید سمیت کسی سیاسی شخصیت یا ان کی حکومت کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ چالیس لاکھ سے زائد قبائل کو دوسرے حقوق تو کیا ووٹ دینے کا حق دے دیتیں۔ یہ نیک کام بھی فاروق لغاری کی ایک نگران حکومت کے دور میں ہوا۔ (1997ء) لاکھوں قبائل کو اگر ایک طرف پاکستان کے بازوئے شمشیر قرار دے کر ان کی بہادری کا مذاق اڑایا گیا تو دوسری طرف ان کو اس پولیٹیکل ایجنٹ کے رحم و کرم پر چھوڑا گیا جس کے پاس مقننہ، عدلیہ اور جرگہ سمیت تمام اختیارات بیک وقت تھے۔ اسی پالیسی کا نتیجہ ہے کہ آج بھی سینکڑوں قبائلی پشاور، ڈی آئی خان اور بنوں کی جیلوں میں محض اس وجہ سے 30-35 سالوں پڑے ہوئے ہیں کہ ان کو ایف سی آر کے ظالمانہ قوانین کے تحت وہ سزائیں دی گئیں جن کو کسی دوسری عدالت یں چیلنج بھی نہیں کیا جا سکتا۔ صرف پشاور جیل میں بارہ سے زائد کم عمر بچے ان کے والدین یا رشتہ داروں کے کیے کی سزا بھگت رہے

ہیں کیونکہ وہ اجتماعی ذمہ داری کی بے رحمانہ چھڑی کے نیچے آگئے تھے۔ درجنوں ایسے افراد جیلوں میں بند ہیں جن کے جرائم کی نوعیت عام طریقہ کار اور قانون کے تحت ہفتوں یا دنوں کی سزا کا تقاضا کرتی ہے مگر یہ بیچارے برسوں کی سزا پانے کے باوجود رحم کی اپیل بھی نہیں کر سکتے۔ شاید یہ دنیا کے وہ واحد بدقسمت لوگ ہیں جن کے نظام (سیٹ اپ) میں کسی عام جرم یا غلطی کی سزا عمر قید سے بھی بڑھ کر ہے۔ (1954ء تک یہ قوانین صوبہ سرحد اور بلوچستان میں بھی لاگو ہوا کرتے تھے)

دیکھا جائے تو پاکستان کے سیاستدانوں، حکمرانوں اور اداروں نے ایسی ہی پالیسیوں کے باعث اتنی بڑی آبادی کو جان بوجھ کر وحشت، پسماندگی اور اب انتہاپسندی کے ایسے نرغے میں دے دیا ہے جس سے اسے نکالنا اب پاکستان تو کیا عالمی برادری اور سپر پاورز کے لیے بھی مشکلات کا باعث بنا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دینے کا مستحسن فیصلہ اس وقت تک قابل عمل نہیں ہو سکتا جب تک فاٹا کو انتہاپسندوں کے قبضے سے نہیں چھڑالیا جاتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جن علاقوں میں پاکستان کی فوج زمین کے راستے گھسنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی وہاں کے عوام اور سیاسی تنظیموں کو کہا جائے کہ اپنے نظریئے کی بنیاد پر سیاست کرنا اور پارٹیاں چلانا شروع کر دیں۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اگر ایف سی آر میں بنیادی ترامیم کی گئیں یا اہم نکات درمیان میں سے ہٹائے گئے تو متبادل کے طور پر کیا چیزیں شامل کی جائیں گی۔ متبادل نظام یا نکات کے خدوخال تاحال واضح نہیں بلکہ عملاً موجود بھی نہیں ہیں۔ چنانچہ یہ خطرہ بھی موجود ہے کہ ہمارے ادارے ملاکنڈ ڈویژن کا تجربہ پھر سے دہرانے لگ جائیں جہاں قانونی خلاء پیدا ہوا تو متبادل کی تلاش کے نام پر پورے ڈویژن کو خون کی وادی میں تبدیل کر دیا گیا۔ بظاہر یوں لگتا ہے کہ ہمارے ریاستی ادارے ایسا ہی ایک اور تجربہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ صدر زرداری اور ان کی ٹیم کو یا تو فاٹا کی پیچیدگیوں کا اندازہ نہیں یا وہ عجلت میں ایسے فیصلے کرنے پر تلے ہوئے ہیں جو کہ علاقے اور خطے کو ایک اور سیاسی، انتظامی عدم استحکام کی طرف لے جانے کا سبب بن سکتا ہے۔ اگر حکومت نے فاٹا میں تبدیلی اور بہتری لانے کا واقعتاً ارادہ کیا ہوا ہے تو اس کے لیے محض یہ دونوں اقدامات

کافی نہیں ہوں گے۔ ایسا کرنے کے لیے جو دوسرے اقدامات ناگزیر ہیں وہ کیا ہو سکتے ہیں اس سلسلے میں مختلف صاحب الرائے افراد اور طبقوں سے بات چیت کے ذریعے سامنے آئے، وہ یہ ہیں۔

1- ایف سی آر کے خاتمے (یا ترامیم) سے قبل تمام سیاسی قوتوں، تنظیموں، ملکان، وکلاء، طلباء اور تعلیم یافتہ طبقے غرض زندگی کے تمام شعبوں سے وابستہ افراد (جن کا تعلق فاٹا سے ہو) کو ایک تیز ترین ریاستی انتظام کے تحت اعتماد میں بلکہ نظام میں موجود نقائص اور ان کے خاتمے، متبادل کے ایشوز پر ایک مکمل ہوم ورک کیا جائے۔

2- اکیسویں صدی میں اس بات کا کوئی جواز نہیں کہ ایک ہی ملک میں مختلف قوانین نافذ کیے جائیں۔ چنانچہ اس امکان کا جائزہ لیا جائے کہ اگر پاکستان کے مروجہ قوانین کو فاٹا میں لاگو کیا جائے تو اس کی کامیابی کے کتنے امکانات ہیں اور کتنے نہیں۔

3- پولیٹیکل ایجنٹ کے انتظامی اختیارات اور ان سے متعلقہ موجود خامیوں کا جائزہ لے کر مقننہ اور عدلیہ کو الگ کیا جائے۔ اگر قبائلی عوام صوبے کے دوسرے علاقوں میں عام پاکستانی قوانین پر عمل کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ فاٹا کے موجودہ فرسودہ نظام کا دفاع کریں۔

4- اس امکان کا بھی سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے کہ کیا فاٹا کو صوبہ پختونخواہ کی اسمبلی میں نمائندگی دینی چاہیے یا نہیں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ فاٹا اور صوبہ پختونخواہ کے باشندوں کو نہ صرف ایک دوسرے کے قریب لایا جائے بلکہ ایسا کرنے کے باعث قبائل کا اسلام آباد پر انحصار کم کرنے میں مدد ملے گی اور قبائل کا پشتون عوام اور اپنی حکومت کے ساتھ رابطہ بھی مضبوط ہوگا۔ فاٹا پر مشتمل الگ صوبے کے قیام پر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔

5- فاٹا میں جرگہ نظام کو اعتماد سازی کے بعد ہنگامی بنیادوں پر پھر سے موثر بنایا جائے۔ ایسا ہونے سے انتہا پسندوں کی قوت اور شدت میں خود بخود کمی واقع ہو جائے گی۔

6- سیاسی پارٹیوں (خصوصاً سیکولر پارٹیوں) کو مضبوط بنا کر انہیں تحفظ فراہم کرتے ہوئے اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ حکومتی اداروں کے تعاون سے عوام کی قربت

حاصل کرنے کے لیے بتدریج میدان میں اتریں گی۔ اس ضمن میں مقامی سیاسی رہنماؤں کی حفاظت کو ممکن بنایا جانا بہت ضروری ہے۔

-7 ان علاقوں میں قومی لشکروں کی بھرپور حوصلہ افزائی کر کے ان کی مالی معاونت کی جائے جبکہ ایک موثر بلدیاتی نظام کے تحت عوام کے عام مسائل کو حل کرنے کے فوری اور موثر اقدامات کیے جائیں۔

-8 فاٹا میں موجود بے حساب قدرتی وسائل کا مکمل سروے کر کے عوام کو پرکشش ترغیبات دے کر ان وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے ملک اور اس سے بڑھ کر قبائلی علاقوں کی ترقی کے لیے بروئے کار لایا جائے۔ سب سے پہلا اور فوری کام یہ ہونا چاہیے کہ فاٹا کو این ایف سی ایوارڈ میں شامل کیا جائے۔

-9 اقتصادی اور معاشی ترقی کے لیے خصوصی فنڈز مختص کیے جائیں۔ غیر مقامی کاروباری حلقوں اور سرمایہ داروں کو تحفظ فراہم کر کے علاقے میں کاروبار کرنے اور سرمایہ لگانے پر راغب کیا جائے۔

-10 ملکان کو میسر غیر ضروری مراعات واپس لے کر ان کو عام آدمی کی بہبود پر خرچ کرنے کے اقدامات کیے جائیں۔ علاقے میں بینکوں کا نظام قائم کیا جائے اور قبائل کے لیے روزگار، ملازمتوں کے مواقع پیدا کیے جائیں۔

قبائلی وزراء اور ممبران اسمبلی طالبان کے ہاتھوں یرغمال

فاٹا کی سات ایجنسیاں اور نیم قبائلی علاقے (ایف آر ز) 2004ء کے بعد عملاً طالبان اور دوسری عسکری تنظیموں کے رحم و کرم پر تھے اور ان علاقوں پر طالبان کی حکمرانی قائم ہوگئی تھی۔ طالبان تحریک نے 2002ء کے بعد جب وزیرستان میں قدم جماتے ہوئے ان علاقوں کو اپنے ٹھکانوں میں تبدیل کرنا شروع کیا تو ان لوگوں نے ایک حکمت عملی کے تحت ان قبائلی ملکان، شخصیات اور افراد کو ایک ایک کر کے قتل کرنا شروع کر دیا جو ان کے عزائم کی راہ میں مزاحمت کر رہے تھے یا ان کے مخالف تھے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق صرف وزیرستان میں 110 اہم شخصیات کو ٹارگٹ کر کے قتل کر دیا گیا۔ وزیرستان کے علاوہ باجوڑ، اورکزئی، مہمند، خیبر اور کرم کی ایجنسیوں میں بھی یہی پالیسی اپنائی گئی اور آخر میں سوات، دیر اور بونیر میں بھی مخالفین کو راستے سے ہٹایا گیا۔ صرف سوات میں اے این پی کے 210 کارکنوں اور عہدیداروں کو قتل کیا گیا۔ اس پالیسی کا یہ نتیجہ نکلا کہ طالبان کے مخالفین حوصلہ ہار کر یا تو ان کے ہمنوا بن گئے یا علاقہ چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔

درحقیقت طالبان اور ایسی دوسری تنظیموں کی یہ حکمت عملی محض سیاسی عہدیداروں یا اہم شخصیات (مخالفین) تک محدود نہیں رہی۔ ان لوگوں نے منتخب ارکان، مراعات یافتہ ملکان اور دوسرے اہم عوامی نمائندگی کے حامل افراد کو بھی انہی حربوں سے دبانا شروع کیا تو یہ لوگ اسمبلی میں بیٹھ کر عملاً اپنے اپنے علاقوں کے طالبان کمانڈروں کی ہدایات پر عمل کرنے لگے۔ گزشتہ اسمبلی میں مولانا معراج الدین، شاہ عبدالعزیز اور متعدد دوسرے ایم این ایز نہ صرف

طالبان کے احکامات پر چلتے رہے بلکہ وہ طالبان پر ریاستی دباؤ بڑھانے کی صورت میں ان کے حق میں کھل کر آواز بھی بلند کرتے رہے۔ شاہ عبدالعزیز تو لال مسجد کے واقعہ پر بھی ان کی حمایت کرتے رہے تھے لیکن جب طالبان کا مسئلہ سامنے آیا تو وہ مختلف چینلز پر بھی ان کی حمایت کرتے رہے۔ کوہاٹ سے تعلق رکھنے والے سابق ایم این اے جاوید ابراہیم پراچہ نے تو کرم اور اورکزئی ایجنسیوں کے طالبان کو پناہ دینے، حکومتی سپورٹ فراہم کرنے اور ان کا سیاسی دفاع کرنے کے لیے ایک باقاعدہ تنظیم بھی بنائی تھی۔

2008ء کے الیکشن سے قبل تمام ایجنسیوں کے طالبان کمانڈروں نے الیکشن میں حصہ لینے والے تمام امیدواروں کے لیے شرائط نامہ یا ضابطہ اخلاق متعارف کرایا۔ اس سلسلے میں وزیرستان، کرم، اورکزئی، باجوڑ اور خیبر کی ایجنسیوں میں تمام امیدواروں کے باقاعدہ انٹرویوز کر کے ان سے اس شرائط نامہ یا ضابطہ اخلاق پر دستخط بھی لیے گئے۔ اس معاہدے کے تحت تمام ممبران یا امیدواروں سے باقاعدہ ضمانتیں بھی لی گئیں اور بعد میں خلاف ورزی کرنے پر ان کے خلاف کارروائیاں بھی کی گئیں۔

اس ضمن میں پشاور سے ملحقہ ایجنسی خیبر کی مثال دی جا سکتی ہے جہاں پر 2008ء کے الیکشن کے دوران حلقہ این اے 46 کے لیے 18 امیدوار میدان میں آئے تو لشکر اسلام کے سربراہ منگل باغ نے سب کو باڑہ کے اپنے دفتر میں بلا کر ان کو اپنی شرائط اور متعین ضابطہ اخلاق سے آگاہ کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ جو بھی امیدوار ان شرائط سے انکار کرے گا۔ اس کو الیکشن لڑنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اے این پی، پی پی پی اور تحریک انصاف کے امیدواروں سمیت تمام 18 امیدواروں نے وہ شرائط مان کر اس دستاویز پر دستخط کر دیئے۔ ان میں الیکشن کے دوران نعرے بازی اور جھنڈہ بازی سے ممانعت، زیادہ گاڑیوں کے استعمال، سیاسی پارٹیوں سے وابستگی پر پابندی، کسی بھی آپریشن کی صورت میں ریاست کے بجائے لشکر اسلام کا ساتھ دینا، منگل باغ کے کہنے پر اسمبلی سے استعفے دینا، ترقیاتی فنڈز کو منگل باغ کی مرضی سے استعمال کرنا اور ایم این اے یا سینیٹر کے مخصوص فنڈز اور مراعات میں سے لشکر اسلام کو مناسب حصہ دینے جیسی شرائط شامل تھیں۔ اے این پی کے حمایت یافتہ امیدوار قومی اسمبلی سعید خان آفریدی کے مطابق شرائط ماننے والوں میں وہ بھی شامل تھے

کیونکہ ان پر لشکر اسلام اور عوام کا بہت دباؤ تھا۔

این اے 46 سے موجودہ وفاقی وزیر ماحولیات حمید اللہ جان آفریدی کامیاب ہوگئے تو وہ کامیابی کے فوراً بعد باڑہ جا کر منگل باغ سے ملے تھے۔ اسی روز انہوں نے ایک قیمتی گاڑی بھی ان کو بطور تحفہ پیش کی تھی۔ ایسی ہی شرائط یا فارمولے کو دوسری قبائلی ایجنسیوں میں بھی لاگو کر دیا گیا۔ دسمبر 2008ء کے دوران منگل باغ حمید اللہ آفریدی سے ناراض ہوگئے تو انہوں نے باقاعدہ طور پر ان کو نوٹس جاری کیا۔ جرگہ اور خوانین بٹھائے گئے جنہوں نے وفاقی وزیر پر باقاعدہ جرمانہ لگایا اور جرمانے کے طور پر ان سے نقد رقم اور گاڑیاں لی گئیں۔ کچھ عرصہ بعد فورسز نے خیبر ایجنسی خصوصاً باڑہ تحصیل میں محدود پیمانے پر کارروائیاں شروع کیں تو حمید اللہ آفریدی کو پھر طلب کیا گیا۔ ان سے 75 لاکھ بطور جرمانہ لیے گئے۔ آپریشن بند کرنے کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالنے کا حکم دیا گیا اور یہ بھی کہا گیا کہ اگر آئندہ کبھی ایسی کارروائی کی گئی تو وفاقی وزیر کو اسمبلی اور وزارت دونوں سے استعفےٰ دینا پڑے گا۔ جولائی 2009ء کے آخر میں خیبر ایجنسی میں پھر ''بیا در غلم'' کے نام سے کارروائی کا آغاز ہوا تو فورسز اور حکومت نے دوسری ایجنسیوں خصوصاً وزیرستان میں متوقع آپریشن کی باتیں شروع کیں تو طالبان کمانڈروں نے ایک دوسرے سے رابطے کر کے تمام سینیٹرز اور ممبران اسمبلی پر دباؤ بڑھایا کہ اگر انہوں نے مزاحمت نہیں کی تو ان کے خلاف عسکری کارروائی سمیت تمام ممکنہ اقدامات کیے جائیں گے۔ اس ضمن میں تھوڑی سی مزاحمت کرنے والے وفاقی وزیر نورالحق قادری (خیبر ایجنسی) کو دھمکیاں بھی دی گئیں۔ حمید اللہ آفریدی نے اس دباؤ کو کم کرنے کے لیے 12 اگست کو گورنر سرحد اویس غنی سے ملاقات کی اور ان کو صورتحال سے آگاہ کر کے کارروائی روکنے کے لیے کہا۔ تاہم گورنر نے تعاون کرنے سے معذرت کر لی جس کے بعد موصوف نے دوسرے قبائلی ایم این ایز اور سینیٹرز سے رابطے کر کے حکومت پر دباؤ بڑھانے اور اپنی ممبری، وزارت بچانے کے لیے دوسرے حربے استعمال کرنے شروع کیے اور فنڈز کی عدم فراہمی اور دوسری شکایات کی آڑ میں استعفیٰ دینے کی دھمکیاں بھی دیں۔ لشکر اسلام کے ترجمان کے مطابق حمید اللہ آفریدی سمیت دوسروں کے لیے تنظیم کی اجازت کے بغیر الیکشن لڑنا ممکن نہیں تھا کیونکہ لشکر کو اس علاقے میں 70 فیصد عوام کی حمایت حاصل تھی۔

IETY.COM

ایسے میں موصوف کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ووٹروں کی خواہشات کا احترام کریں۔ دوسری طرف حمید اللہ آفریدی ایک وفاقی وزیر ہوتے ہوئے نہ صرف یہ کہ اپنے گروپ کے ہمراہ فورسز کی کارروائیوں کی مخالفت کرتے رہے بلکہ وہ یہ بھی کھلے عام کہتے رہے کہ لشکر اسلام اصلاح عامہ کے لیے ایک پرامن تنظیم ہے اور اس کا جرائم یا ریاست مخالف کارروائیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان چند مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ انتہا پسندوں کا دوسروں کے علاوہ ممبران اسمبلی، وزراء اور سیاسی عہدیداروں پر کتنا گہرا دباؤ تھا۔

✿ ✿ ✿ ✿

بیت اللہ محسود کی ہلاکت اور نئی قیادت

جون 2004ء سے پاکستان کے قبائلی علاقہ جات میں جاری ڈرون حملوں کے نتیجے میں دستیاب معلومات یا امریکی دعووں کے مطابق اب تک (2009ء تک) القاعدہ اور اس قسم کی دوسری تنظیموں سے تعلق رکھنے والے ایک درجن سے زائد اہم کمانڈروں سمیت سینکڑوں افراد کو نشانہ بنایا جا چکا ہے۔ تاہم اگست 2009ء کا مہینہ اس حوالے سے انتہائی اہم ثابت ہوا کہ اس ماہ کیے گئے ایک ڈرون حملے میں تحریک طالبان پاکستان کے سربراہ اور امریکہ اور پاکستان کو انتہائی مطلوب شخص بیت اللہ محسود کو ان کے سسر اکرام الدین محسود کی رائش گاہ پر نشانہ بنا کر ہلاک کر دیا گیا۔ حملے میں دوسرں کے علاوہ ان کی دوسری اہلیہ اور دو اہم باڈی گارڈز بھی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ 8 اگست کے روز کیے گئے اس ڈرون حملے کے نتیجے میں بیت اللہ محسود ہی نشانہ بنے لیکن اس کی تصدیق میں سرکاری اور غیر ملکی اداروں کو کئی روز لگ گئے کیونکہ وزیرستان سے اطلاعات کا آنا اور انٹیلی جنس کا تصدیق کرنا ایک ناممکن کام بن گیا تھا۔ طالبان کے رہنما اور ان کے حامی (بعض ایم این ایز سمیت) بیت اللہ کی ہلاکت سے انکار کرتے رہے۔ پھر دو تین روز بعد یہ اطلاع آئی کہ موصوف واقعتاً اس حملے کا نشانہ بنے تھے۔ تاہم وہ ہلاک نہیں ہوئے بلکہ زخمی ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ ان کی ہلاکت کی اطلاع ایک خاص منصوبے کا حصہ تھی تاکہ ان کے بقول بیت اللہ اور اس کے گروپ کے خلاف سوات آپریشن کے بعد متوقع فوجی کارروائی کا راستہ روکا جائے۔ پاکستانی میڈیا کو اطلاعات کے حصول اور موت کی تصدیق میں بہت سی مشکلات کا سامنا تھا۔ تاہم

15 اگست کو اس خبر کی تصدیق ہو ہی گئی کہ بیت اللہ اب اس دنیا میں نہیں۔ بعد کے دنوں میں تحریک طالبان کے مرکزی ترجمان مولوی عمر کو باجوڑ سے گرفتار کیا گیا تو انہوں نے بھی بیت اللہ کی موت کی تصدیق کر دی کیونکہ اطلاعات کے مطابق ان کو وزیرستان سے ٹی ٹی پی کے ایک اجلاس میں شرکت کے بعد آتے وقت گھیر لیا گیا تھا اور اس اجلاس میں اس کی شمولیت کا مقصد بیت اللہ محسود کے جانشین کے انتخاب کے لیے مشاورت کرنا تھا۔

34 سالہ بیت اللہ محسود ضلع بنوں کے ایک علاقے دادو شاہ میں ایک امام مسجد ہارون محسود کے ہاں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا تعلق محسود قبیلے کی شاخ شوبی خیل سے بتایا جاتا تھا۔ ان کے والد کا انتقال ہو چکا جبکہ ان کی والدہ زندہ ہیں۔ ان کے پانچ دوسرے بھائی بھی ہیں جبکہ ان کے ایک بھائی یحییٰ محسود کو سال 2008ء کو بنوں میں پراسرار طریقے سے قتل کر دیا گیا تھا۔ بیت اللہ محسود نے نیک محمد اور عبداللہ محسود کی ہلاکتوں کے بعد وزیرستانی طالبان کی قیادت سنبھالی تھی۔ تاہم ان کو شہرت اس وقت ملی جب انہوں نے 2007ء کو تحریک طالبان پاکستان نامی خطرناک مگر فعال تنظیم کی بنیاد رکھ دی۔ وہ سال 2004ء سے پاکستانی فورسز اور حکومتوں کے لیے ایک بڑا مسئلہ بنے ہوئے تھے۔ اس دوران ان کا پاکستانی حکومت کے ساتھ ساراروغہ کے نام سے معاہدہ بھی ہوا تھا جو کہ بعد میں ٹوٹ گیا۔ بیت اللہ محسود نے کمال مہارت سے نہ صرف یہ کہ قبائلی اور پشتون طالبان گروپوں کو ایک منظم نیٹ ورک کی شکل دے دی بلکہ انہوں نے پنجابی اور کشمیری جہادی تنظیموں کے علاوہ غیر ملکی جہادیوں کو بھی وزیرستان میں محفوظ ٹھکانے فراہم کیے۔ اس حکمت عملی کے باعث وہ امریکہ اور پاکستان کے لیے خطرناک ترین افراد کی فہرست میں شامل ہوگئے۔ سال 2006ء کے بعد اس کی کارروائیوں میں بہت زیادہ اضافہ ہونے لگا تو ٹائم میگزین نے اس کو دنیا کے دس بڑے اثر ورسوخ والے افراد کی فہرست میں شامل کر دیا جبکہ نیوز وزیر نے اپنی ایک رپورٹ میں ان کو اسامہ بن لادن سے بھی زیادہ خطرناک قرار دیا۔

امریکہ نے اس کی جاسوسی یا خبر دینے والے کے لیے 50 ملین ڈالر کی خطیر رقم کے انعام کا اعلان کر رکھا تھا جبکہ حکومت پاکستان نے بھی اس کے سر کی قیمت 50 ملین روپے مقرر کر دی تھی۔ بیت اللہ محسود پر 200 سے زائد سکیورٹی اہلکاروں اور سینکڑوں مخالفین کو

ہلاک کرنے کے علاوہ سابق وزیراعظم بینظیر بھٹو کو قتل کرنے کے الزامات تھے۔ بے نظیر بھٹو کو 27 دسمبر 2007ء کو راولپنڈی میں شہید کر دیا گیا تو پاکستانی اداروں کے علاوہ امریکی اداروں نے بھی اس واقعہ کا ذمہ دار بیت اللہ محسود ہی کو قرار دیا۔ بعدازاں ان کے ایک سابقہ ساتھی حاجی ترکستان نے بھی انکشاف کیا کہ بیت اللہ ہی بے نظیر بھٹو کے قتل کے ذمہ دار تھے۔

ان کی موت سے قبل وزیرستان میں ان کے مخالفین کے ذریعے ان کی قوت کم کرنے کی کوششیں بھی کی گئیں، تاہم ان کوششوں کو اس وقت سخت دھچکا لگا جب ان کے ایک مخالف کمانڈر قاری زین الدین محسود کو ڈیرہ اسماعیل خان میں ہلاک کر دیا گیا اور بیت اللہ گروپ نے اس واقعہ کی ذمہ داری قبول کر لی۔

بیت اللہ محسود کی ہلاکت نفسیاتی طور پر طالبان اور جہادی گروپوں کے علاوہ القاعدہ جیسی تنظیم کے لیے بھی ایک بڑا دھچکا اور نقصان باعث ہوا۔ اس سے قبل جب سال 2009ء کے ابتدائی مہینوں میں پاکستانی اداروں کے حمایت یافتہ طالبان گروپ بیت اللہ کے خلاف متحد ہو کر میدان میں نکل آئے تو ملا عمر (افغانستان) سمیت القاعدہ کے بعض اہم لیڈروں نے ایک تین رکنی وفد فاٹا بھیج کر ملا نذیر، حاجی گل بہادر اور بعض دوسرے کمانڈروں کے ذریعے واضح پیغام دیا کہ افغانستان کی القاعدہ اور طالبان لیڈرشپ بیت اللہ اور اس کے گروپ کو ہر صورت میں زندہ اور قائم دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ بیت اللہ محسود ہی وہ واحد لیڈر تھے جنہوں نے سال 2002ء کے بعد القاعدہ سمیت سنٹرل ایشین اور دوسری جہادی تنظیموں کو وزیرستان اور بعض دوسری ایجنسیوں میں محفوظ ٹھکانے فراہم کیے ہوئے تھے۔ بعض تجزیہ نگار افغانی طالبان اور بیت اللہ کے درمیان پاکستان میں کارروائیوں کی پالیسی کے حوالے سے اختلافات کی بات بھی کرتے رہے۔ تاہم باخبر حلقے ایسی اطلاعات اور تجزیوں کو رد کر کے یہی بتاتے رہے کہ القاعدہ رہنما اور افغانی طالبان بیت اللہ کی طاقت اور ان کی بالادستی کی وجہ سے ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بیت اللہ محسود زمانہ طالب علمی میں جے یو آئی (ف) کے سرگرم کارکن تھے اور یہی وجہ ہے کہ وہ مولانا فضل الرحمان کی بہت قدر کرتے تھے جبکہ دونوں کے درمیان ملاقاتیں بھی

ہوتی رہی ہیں۔

بیت اللہ کی موت کے بعد طالبان میں قیادت کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اس ضمن میں ان کے جانشین کے طور پر حکیم اللہ محسود، قاری حسین اور ولی الرحمان محسود کے نام لیے جانے لگے۔ ان تینوں کا شمار نہ صرف یہ کہ بیت اللہ کے قریب ترین ساتھیوں میں ہوتا تھا بلکہ اول الذکر دو کمانڈروں کو خودکش حملوں اور مخالفین کو ذبح کرنے کی مہارت کے حوالے سے پوری دنیا میں شہرت حاصل تھی۔ پاکستانی اداروں خصوصاً وزیر داخلہ رحمان ملک نے اطلاع دی کہ جانشینی کے لیے بلائے گئے ایک اجلاس کے دوران حکیم اللہ اور ولی الرحمان محسود کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ بھی ہوا ہے جس کے نتیجے میں یہ دونوں یا ان میں سے ایک یقینی طور پر ہلاک ہو چکا ہے جبکہ آزاد ذرائع بھی جانشینی کے معاملے پر فریقین کے درمیان اختلافات اور جھڑپ کی اطلاعات دیتے رہے تھے۔ تاہم یہ اطلاعات تصدیق اور حقائق کے مراحل طے نہ کر سکیں اور حکیم اللہ محسود کو ٹی ٹی پی کا نیا سربراہ بنا دیا گیا۔ بعض حلقوں کے خیال میں باہمی مشاورت سے تنظیم کے انتظامی معاملات ولی الرحمان کو جبکہ عسکری معاملات حکیم اللہ کو سونپ دیے جانے کے فارمولے پر اتفاق رائے ہو گیا جس کے بعد تحریک طالبان کی جانب سے کچھ عرصہ تک کارروائیوں میں تعطل پیدا ہوا لیکن اس کے بعد کچھ اس انداز سے شدت واقع ہوئی کہ پورا پاکستان طالبان کے حملوں اور دھماکوں کی زد میں آ گیا۔

طالبان کی جانب سے کارروائیوں میں شدت کی وجہ یہ بتائی جاتی رہی کہ بیت اللہ کے مقابلے میں حکیم اللہ اور قاری حسین کچھ زیادہ ہی تشدد پسند اور سخت گیر ہیں کیونکہ ان کو تنظیمی اور نظریاتی معاملات کے بجائے عسکری کارروائیوں کا تجربہ رہا ہے اور یہی خصوصیت ان دونوں کی وجہ شہرت بھی ہے۔ اس طرح کارروائیوں میں اضافے کی ایک اور وجہ یہ بھی بتائی جاتی رہی کہ وہ اپنے حامیوں، کمانڈروں اور اہلکاروں کو جنگ میں مصروف رکھ کر تحریک کے اندر موجود بعض اختلافات اور دوسری کمزوریوں کو چھپانا چاہتے ہیں۔ حکیم اللہ محسود اور قاری حسین آپس میں قریبی رشتہ دار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ولی الرحمان کے مقابلے میں ان کی قوت اور گروپ بندی زیادہ موثر اور اہم ہو کر سامنے آئی۔

ان دو کمانڈروں نے قیادت سنبھالنے کے بعد نہ صرف یہ کہ فورسز اور مخالفین کے

خلاف خطرناک حملے کیے بلکہ تنظیم کے اندر بھی بعض مخالفین کو راستے سے ہٹا دیا۔ انہوں نے بیت اللہ محسود کے سسر اکرام الدین محسود اور ان کے بیٹوں اور بھائیوں کو اٹھا کر جاسوسی کے الزام میں عبرت کا نشانہ بنانے سے بھی گریز نہیں کیا کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اکرام الدین بیت اللہ کے خلاف مخبری کر کے انعام کے لالچ میں آ گئے تھے لیکن بعض حلقوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اکرام الدین کو جاسوسی کے علاوہ بیت اللہ کی دولت کے لین دین کے معاملے میں اٹھایا گیا تھا کیونکہ ان کمانڈروں کا خیال تھا کہ بیت اللہ کی دولت کا ایک بڑا حصہ اس کے سسر کے قبضے میں ہے۔ اس وقت بیت اللہ کی دولت کا تخمینہ تین ارب روپے لگایا جاتا تھا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ اکرم الدین محسود کو اس لیے بھی انتقام کا نشانہ بنایا گیا کہ وہ بیت اللہ کی موت سے قبل ایک مذہبی جماعت کے ذریعے حکومت پاکستان اور اعلیٰ عسکری حکام کے ساتھ بیت اللہ کی مصالحت کے ایک فارمولے پر کام کر رہے تھے اور اس سلسلے میں کافی پیش رفت بھی ہو چکی تھی۔ دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا رہا کہ بیت اللہ اور حکومت کے درمیان مبینہ مفاہمت کی اطلاعات ہی موصوف کی موت کا سبب بنی تھیں کیونکہ امریکہ کسی صورت نہیں چاہتا تھا کہ اب کی بار بیت اللہ محسود یا اس کے ساتھیوں کو ماضی کی طرح رعایت دے کر افغانستان میں امریکی اور نیٹو فورسز کی مشکلات میں اضافہ کرنے کا کوئی موقع پیدا ہو۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سال 2008ء تک امریکہ اپنے ڈرون حملوں کے دوران جنوبی وزیرستان کے بجائے شمالی وزیرستان ہی کو زیادہ نشانہ بنانے کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ اس پالیسی سے یہ تاثر بھی ابھرا کہ چونکہ امریکہ بیت اللہ اور بعض دوسرے پاکستان مخالف کمانڈروں کو پاکستان کے خلاف استعمال کرتا ہے، اس لیے وہ بیت اللہ کو نشانہ بنانے سے گریز کرتا ہے حالانکہ اس موقف کو دلائل اور واقعات کی روشنی میں زیادہ مقبولیت اور اہمیت حاصل نہیں ہو سکی کیونکہ بیت اللہ کو مارنے کا کریڈٹ پاکستان کے بجائے امریکہ ہی کے حصے میں آیا۔ اس حملے یا کریڈٹ کا نتیجہ ہے کہ پاکستانی حکومت کی طرف سے امریکی ڈرون حملوں کی مخالفت کا سلسلہ کئی روز تک دم توڑتے نظر آیا کیونکہ پاکستانیوں کی نظر میں بیت اللہ محسود کو مارنا پاکستان کی سلامتی کے لیے ناگزیر ہو گیا تھا اور یہ نیک کام ڈرون حملے

کے ذریعے امریکہ ہی نے ممکن بنایا تھا۔ بہرحال ان کی جگہ تحریک طالبان کی قیادت سنبھالنے والے حکیم اللہ محسود اس سے قبل ٹی ٹی پی کی جانب سے کرم، اورکزئی اور کسی حد تک خیبر کی قبائلی ایجنسیوں کے کمانڈر کی حیثیت سے فرائض سرانجام دے چکے ہیں۔ 33 سالہ حکیم اللہ محسود ٹی ٹی پی کے ذبح کرنے والے سکواڈ کے کمانڈر اور ٹرینر بھی رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اس عرصہ کے دوران بے شمار مخالفین کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کیا ہے۔ ابتداء میں وہ ذوالفقار کے نام سے ٹی ٹی پی کے ترجمان کا فریضہ بھی انجام دے چکے ہیں جبکہ بعض لوگ اس کا اصلی نام جمشید محسود بتاتے ہیں اور وہ فرقہ ورانہ تشدد اور کارروائیوں کے بڑے حامی اور فریق رہے ہیں۔

دوسرے اہم لیڈر قاری حسین محسود بھی انتہائی پرتشدد اور سخت گیر شہرت کے حامل ہیں۔ حکیم اللہ اور قاری حسین آپس میں کزن بھی ہیں۔ قاری حسین (خودکش سکواڈ) کے لیڈر ہیں اور انہوں نے اپنے منصوبوں سے بے شمار افراد کو خودکش حملوں کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے القاعدہ اور دوسری تنظیموں بھی قریبی رابطے رہے ہیں جبکہ وہ کشمیر اور افغانستان میں بھی جہاد کر چکے ہیں۔ نظریاتی طور پر وہ ابتداء میں ایک فرقہ پرست کشمیری تنظیم سے وابستہ تھے، تاہم بعد میں وہ ٹی ٹی پی کی ناگزیر ضرورت بن گئے۔

ٹی ٹی پی کے تیسرے اہم لیڈر ولی الرحمان کو فکری اور تنظیمی طور پر سنجیدہ شخص کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ وہ دوسروں کی نسبت کافی پرسکون، سادہ طبع اور خاموش شخص سمجھے جاتے ہیں۔ بعض حلقے ان کو بیت اللہ محسود کا رشتہ دار قرار دیتے ہیں اور ان حلقوں کا کہنا ہے کہ موصوف ہر مسئلے پر غور کے دوران ولی الرحمان سے مشاورت کرتے تھے۔ ان حلقوں کا دعویٰ ہے کہ بیت اللہ محسود نے شوریٰ کے اجلاسوں سمیت متعدد بار یہ بھی کہا تھا کہ ان کی غیر موجودگی میں ولی الرحمان محسود ہی تنظیم کی قیادت سنبھالیں گے۔

خطرناک مقدمہ کمزور وکیل

ستمبر 2001ء کے بعد پاکستانی میڈیا، اس میں موجود مخصوص تجزیہ نگاروں اور بعض سیاستدانوں نے ایک مستقبل پالیسی کے تحت اپنی توجہ یہ ثابت کرنے پر مرکوز کیے رکھی کہ طالبان کو ہر صورت میں محض پشتونوں کی کوئی جہادی تحریک قرار دے کر اس کو ملکی، علاقائی اور عالمی سطح پر انتہا پسند، جنونی اور شدت پسند قوم کے اعزاز سے نوازا جائے۔ بدقسمتی سے پشتون اہل فہم و دانش سیاسی پارٹیوں اور دوسرے باشعور طبقوں نے اس تاثر کو غلط قرار دینے کے حوالے سے 10 فیصدی کام بھی نہیں کیا۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ رہی کہ پشتون قوم پرست قوتوں نے عالمی اور علاقائی سازشوں کے باوجود پشتون آبادی میں انٹیلی جنس کی سطح پر کسی فورم، تنظیم یا گروہ کی نہ تو کوئی حوصلہ افزائی کی اور نہ ہی دور جدید کے علمی، سیاسی اور صحافتی حلقوں کے ذریعے اپنی آواز کو موثر انداز میں پیش کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش کی۔ عوامی نیشنل پارٹی اور اس کی قیادت نے بھی پشتونوں کی نمائندہ قوت کا مدعی ہونے کے باوجود عالمی سطح پر اس صف بندی کو نظرانداز کیے رکھا جو ایسے حالات سے نمٹنے کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اس پارٹی میں ممتاز دانشور افراسیاب خٹک کی شمولیت کے بعد یہ توقع پیدا ہوئی تھی کہ میڈیا، سیمینارز اور عالمی فورمز کے ذریعے پشتون قوم کی صحیح تصویر کشی کا عمل شروع ہو سکے گا۔ تاہم یہ توقع اس وجہ سے پوری نہیں ہوئی کہ افراسیاب خٹک کو بھی دوسروں کی طرح پارٹی عہدوں کے چکر میں پھنسا دیا گیا اور ان کو محض ایک منتظم، نگران یا مقرر کی حیثیت دے دی گئی۔ پارٹی کی صوبائی صدارت حاصل کرنے کے بعد ان کے کردار کو محض اعلیٰ پارٹی قیادت کے ساتھ معاملات نمٹانے، مشاورت کرنے اور چند مروجہ بیانات دینے تک محدود رکھا گیا۔ اس پالیسی

کا نتیجہ یہ نکلا کہ باشعور قوم پرست حلقوں، سنجیدہ سیاسی کارکنوں اور افراسیاب خٹک کے درمیان رابطوں کا سلسلہ بڑھنے کے بجائے کٹ کر رہ گیا اور وہ سٹیٹس کو کا شکار ہو گئے۔

سال 2008ء میں ہونے والے الیکشن کے دوران صوبہ پختونخواہ کے عوام کی اکثریت نے محض اس نعرے کی بنیاد پر اے این پی کو اسمبلیوں میں پہنچایا کہ اس پارٹی نے خطے میں امن کے قیام اور ترقی کے عمل کی ابتداء کے وعدے سے انتخابی مہم چلائی تھی۔ اس پارٹی نے پاکستان کی تاریخ میں دوسری بار وزارت اعلیٰ کا عہدہ حاصل کرنے کے علاوہ اپنے وزراء کو وفاقی حکومت بلکہ سندھ اور بلوچستان کی حکومتوں کا حصہ بھی بنایا۔ تاہم کرسیٔ اقتدار کے حصول کے بعد اے این پی کی قیادت عملاً پارٹی کے کارکنوں، ووٹروں اور عوام سے کٹ کر رہ گئی۔ اس عمل یا تاثر کے نتیجے میں اے این پی کی صوبائی حکومت یا پارٹی پالیسی کے وہ کام اور اقدامات بھی عوام کی نظروں سے اوجھل رہے جن کا اے این پی کو کریڈٹ ملنا چاہیے تھا۔ اے این پی نے طالبانائزیشن اور انتہاپسندی سے متعلق معاملات کی آڑ میں دوسرے سیاسی معاملات کو موثر انداز میں چلانے اور صوبے میں بڑی سیاسی، معاشرتی اور معاشی تبدیلی لانے کے عمل کو بری طرح نظرانداز کیا جس کے سبب اس پارٹی کا شمار بھی اس کے دعوؤں کے برعکس روایتی اقتدار پسند پارٹیوں میں ہونے لگا۔ اے این پی کی قیادت سکیورٹی کے نام پر اپنے بنگلوں اور دفاتر میں قلعہ بند ہو کر رہ گئی اور کارکنوں اور عوام کا ان تک اپنی بات، رائے یا شکایت پہنچانا ایک مشکل کام بن گیا۔ پارٹی کے مرکزی صدر اسفندیار ولی خان پر 2008ء میں عید کے روز ولی باغ چارسدہ میں حملہ کیا گیا تو وہ اپنے خوف یا نادان دوستوں کے مشورے سے اسی روز اپنے شہید باڈی گارڈ یارزمین سمیت دوسرے شہدا کا جنازہ پڑھے بغیر ہیلی کاپٹر میں سوار ہو کر اپنی فیملی کے ہمراہ کچھ اس انداز سے اسلام آباد منتقل ہو گئے کہ علاقے کے عوام تو ایک طرف صوبے کے عوام بھی کئی ہفتوں تک ان کی شکل دیکھنے کو ترس گئے۔ ان کی اس حرکت نے پارٹی کے کارکنوں، عہدیداروں اور ووٹروں کے علاوہ مجموعی پشتون معاشرے میں اسفندیار ولی خان کے علاوہ اے این پی کی ساکھ کو بھی بڑا نقصان پہنچایا کیونکہ پشتون معاشرے میں ایسی کسی حرکت کو ہضم کرنے کی بہت کم گنجائش پائی جاتی ہے۔

اسفندیار ہی کی تقلید کرتے ہوئے پارٹی کے صوبائی صدر افراسیاب خٹک نے بھی

خود کو سرکاری رہائش گاہ اور دفتر کے اندر تالہ بند کر لیا۔ ان کی سکیورٹی کا یہ عالم تھا کہ دوسروں کے برعکس ان کی سرکاری رہائش گاہ کو باہر سے تالے لگائے گئے اور ان کی نقل و حرکت کو کچھ ایسے انداز سے پراسرار بنانے کی کوشش کی گئی کہ گویا ان کی زندگی کو دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ ہی خطرات لاحق ہیں۔ موصوف اس دوران چپکے سے دوسرے ممالک کے دوروں پر جانے لگے تو ان کے مخالفین نجی محفلوں کے ان کے دوروں کو پشتونوں اور صوبے کی سودے بازی کا نام دے کر انتہائی موثر اور مخالف مہم چلاتے نظر آئے۔ اے این پی حکومت میں ہونے کے باوجود میڈیا، دانشوروں اور دوسرے ہم خیال فورمز پر کوئی توجہ نہ دے سکی جس سے ایک بار پھر یہ بات حقیقت بن کر سامنے آ گئی کہ یہ پارٹی کسی تیاری اور وژن کے بغیر محض اقتدار کا مزہ لینے حکومت میں آئی ہے۔

اے این پی نے حکومت میں آنے کے بعد طالبان کی مخالفت کا سلسلہ ایک پالیسی کے طور پر نہیں اپنایا بلکہ ان کو ایسا کرنے پر مجبور کیا گیا۔ بعض اطلاعات یا بقول اے این پی کے بعض لیڈروں کے الزامات تو ایسے بھی آئے تھے کہ اس پارٹی نے جان بوجھ کر سوات کے حالات سے ابتداء میں خود کو عملاً الگ تھلگ رکھا۔ پارٹی کے مخالفین اور بعض تجزیہ نگاروں کا کہنا تھا کہ پارٹی نے الیکشن کے دوران مقتدر قوتوں کو یہاں تک یقین دہانی کرائی تھی کہ اس کی قیادت میں بننے والی حکومت ملاکنڈ ڈویژن اور فاٹا کے بارے میں جاری کشیدگی، فوجی کارروائیوں اور دوسرے معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی اور برسراقتدار آنے کے بعد پارٹی عملاً اسی پالیسی ہی پر چلتی دکھائی بھی دی۔ تاہم طالبان کے ہاتھوں اے این پی کو مسلسل ٹارگٹ بنائے جانے کے سلسلے اور بڑھتی ہوئی طالبانائزیشن پر ملکی اور عالمی تشویش اور ردعمل نے اس پارٹی کو انتہا پسندوں کے خلاف میدان میں نکلنے پر مجبور کر دیا۔ اے این پی کی لیڈرشپ نے حکومت میں آنے کے بعد پارٹی کے دفاتر (باچا خان مرکز وغیرہ) کے بجائے وزیراعلیٰ ہاؤس، پارلیمنٹ لاجز اور ایوان صدر جیسے مقامات کو اپنی توجہ، قیام اور سرگرمیوں کا مرکز بنایا جبکہ پارٹی کے صوبائی عہدے فعال اور صاحب بصیرت افراد کے بجائے ان عناصر میں بانٹ دیئے گئے جن کو نہ تو پارٹی کے اندر خاطر خواہ شہرت حاصل تھی اور نہ ہی وہ کسی بڑی قربانی، وژن یا سٹینڈ کا پس منظر رکھتے تھے۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ بھی

نکلا کہ پارٹی کا نظریاتی، سیاسی اور سب سے بڑھ کر تنظیمی ڈھانچہ بری طرح متاثر ہو کر رہ گیا۔ پارٹی قیادت کی حواس باختگی، وزراء کی ناقص کارکردگی اور تنظیمی کمزوریوں پر مشتمل نتائج نے اس پارٹی کو مزید متحرک اور فعال کرنے کے بجائے زوال کے راستے پر گامزن کر کے اس کے سیاسی مستقبل کو سوالیہ نشان بنا دیا۔ پارٹی کے اعلیٰ عہدیداروں، وزراء اور ممبران اسمبلی کی فیملیز نہ صرف بیرون ملک منتقل ہونا شروع ہو گئیں بلکہ اسفند یار ولی سمیت متعدد دوسرے لیڈروں کے صاحبزادے اور دوسرے رشتہ داروں کے بیرون ملک وسیع کاروبار کی خبریں بھی سیاسی اور عوامی حلقوں میں اس پارٹی کی کردار کشی کا سبب بنتی گئیں۔

افسوسناک امر یہ تھا کہ یہ پارٹی ان تمام تر واقعات اور الزامات کے باوجود محض اقتدار کی وہ بدمزگی سمیٹنے میں مصروف عمل رہی جو کہ وقتاً فوقتاً عسکریت پسندوں کی جانب سے عملی شکل میں ایک نہ ایک بڑے واقعے کی صورت میں سامنے آ کر خوف اور بدحواسی کا سبب بنتی رہی۔ پارٹی کی قیادت اور وزراء نے سیاسی، عملی اور حکومتی سطح پر اپنے بارے میں روز بروز پھیلتے منفی تاثر ختم کرنے کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جس سے یہ تاثر عام ہونے لگا کہ اے این پی خطے کے امن، ترقی اور استحکام سے زیادہ شخصیات کے مفادات اور ترجیحات کو زیادہ اولیت اور اہمیت دینے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ پارٹی اقتدار میں آنے کے بعد پشتونوں کا کیس تیار کرنے اور اس کو ملکی اور عالمی سطح پر موثر انداز میں پیش کرنے کے دعوے سے گویا مکر کر اقتدار کی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ گئی۔ پارٹی نے انتہا پسندی یا طالبانائزیشن کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی اسباب اور ان کا حل ڈھونڈنے کی ضرورت سے صرف نظر کرتے ہوئے دوسری عام پارٹیوں کی طرح فوج کشی، جوڑ توڑ اور الزام تراشی جیسے فارمولوں پر عمل کیا جس کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ فوجی کارروائیوں کے باوجود انتہا پسندوں کے ساتھ عوام کے ایک بڑے حصے کی ہمدردی حسب معمول برقرار رہی۔ پشتونوں کے مزاج کو سمجھے بغیر راولپنڈی اور اسلام آباد کی مقتدر قوتوں کی پالیسیوں کا مختلف اوقات میں مختلف اشکال میں اے این پی جیسی قوم پرست پارٹی نے جس انداز سے دفاع کیا اور خود کو جس طریقے سے فرنٹ لائن پر لا کھڑا کیا اس سے جہاں کئی لوگوں کو حیرت ہوئی وہاں متعدد بہت تشویش کی صورتحال سے بھی دوچار ہو گئے۔ البتہ پارٹی کی جرأت بعض مواقع پر انفرادی

صورت میں تو سامنے آتی گئی تاہم پارٹی کی مجموعی پالیسیاں شکوک وشبہات، الزامات اور ابہام کا شکار ہی رہیں۔ اسفندیار ولی خان، افراسیاب خٹک اور حکومت میں شامل وزراء، ممبران اسمبلی سے پارٹی کے کارکنوں اور ووٹروں کے علاوہ ان کے ہمدردوں نے جو توقعات وابستہ کی تھیں، وہ اقتدار کے دو سال گزرنے کے بعد مایوسی اور مخالفت میں تبدیل ہونا شروع ہوگئیں۔ اس صورتحال کا خطرناک پہلو یہ بھی نظر آیا کہ پارٹی کے ورکرز اور ہمدرد مایوس ہو کر پارٹی کا مقدمہ لڑنے اور اس کی وکالت کرنے کے عمل سے الگ ہو کر رہ گئے اور اے این پی کے مخالفین یہاں تک کہ جہادیوں کی مقبولیت میں بھی اضافے کا سلسلہ چل نکلا۔

مجموعی طور پر اس قوم پرست پارٹی کی پالیسیاں ابہام کا شکار ہوئیں اور جب عوام اور لیڈر شپ کے درمیان فاصلے بڑھنے شروع ہوئے تو پشتونوں کو امن پسند اور ترقی پسند ثابت کرنے کا مقدمہ ایک بار پھر کھٹائی کا شکار ہو کر رہ گیا۔ پارٹی کے تنظیمی اور حکومتی ذرائع ابلاغ کی بے خبری اور عدم تیاری کا یہ عالم تھا کہ 2009ء کے وسط میں جب صدر آصف علی زرداری امریکہ کے دورے پر جا رہے تھے تو وہ اسلام آباد سے اے این پی کے سربراہ اسفند یار ولی خان کو بھی اپنی ٹیم میں شامل کر کے لے گئے۔ تاہم صوبائی حکومت کی بے خبری اور نااہلی کا یہ عالم تھا کہ جس شام کو پاکستانی وفد نے اسفند یار ولی سمیت اعلیٰ امریکی حکام سے ملاقات کرنی تھی، اسی روز صوبائی وزیر اطلاعات میاں افتخار حسین مقامی میڈیا کو کہتے نظر آئے کہ ان کے پارٹی سربراہ فلاں تاریخ سے یورپ اور امریکہ کا دورہ کریں گے۔ لیکن اسی روز شام کو ان کے لیڈر کو امریکی حکام سے ملاقات کرتے میڈیا پر براہ راست دکھایا گیا۔ اس ایک مثال کے علاوہ اس پارٹی کے عرصۂ اقتدار کے دوران متعدد دوسرے لطیفے بھی سننے کو ملتے رہے۔ تاہم پارٹی نے ایک نمائندہ اور موثر نظریاتی قوت کے طور پر خود کو منوانے کے مواقع بڑی بے دردی سے گنوا دیئے اور اس کا مجموعی امیج اس قسم کی پالیسیوں، غلطیوں اور حکومتی ناتجربہ کاریوں کے باعث بری طرح متاثر ہونے لگا۔

پارٹی پر ملاکنڈ آپریشن کے بعد کرپشن کے الزامات لگنے شروع ہوگئے تو اس کا دفاع کرنے کی بھی کوئی حکومت عملی تیار نہیں کی گئی۔ اسفند یار ولی خان نے خود پر ہونے والے خودکش حملے کے بعد بیرونی دنیا کے متعدد اور طویل دورے کیے۔ ان کی غیر موجودگی

میں سیکنڈ لیڈر شپ میڈیا اور عوام کو بتاتی رہی کہ موصوف ملاکنڈ ڈویژن کے متاثرین کے لیے فنڈز اکٹھا کرنے کی مہم پر ہیں۔ متاثرین تو واپس چلے گئے مگر کئی ماہ گزرنے کے بعد بھی اسفندیار ولی کے اکٹھے کیئے ہوئے فنڈز منظر عام اور ریکارڈ پر نہیں آئے۔ حکومت سازی کے بعد اسفند یار ولی خان کو قومی اسمبلی کی خارجہ امور کی سٹینڈنگ کمیٹی کا سربراہ بنایا گیا۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ اس تمام عرصہ کے دوران نہ صرف یہ کہ وہ کمیٹی کے اجلاسوں سے بذات خود غائب رہے بلکہ انہوں نے اس کمیٹی کے سربراہ کی حیثیت سے کسی بھی ملک کا دورہ کیا نہ کسی غیر ملکی وفد یا مشن سے کوئی ملاقات کی۔ حالانکہ پشتونوں کا امیج، مسائل اور کیس کے حوالے سے عالمی برادری کے ساتھ بات چیت کرنے کے حوالے سے سٹینڈنگ کمیٹی کا عہدہ ان کے لیے ایک موثر پلیٹ فارم ثابت ہوسکتا تھا۔

متاثرین ملاکنڈ کی بحالی اور واپسی کے حوالے سے اے این پی کا زیادہ تر انحصار وفاقی حکومت ہی پر رہا۔ اس دوران صوبائی حکومت یا اے این پی نے دنیا بھر کے بارسوخ اور باثروت پشتونوں، دوست ممالک اور عالمی امدادی اداروں سے براہ راست کوئی موثر یا قابل ذکر رابطہ قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ حالانکہ مرکز کی جانب سے اس پارٹی اور اس کی حکومت کو مکمل سپورٹ فراہم کی جارہی تھی۔ دوسرے رابطے اور اقدامات تو درکنار اے این پی کے وزراء اور بے شمار ممبران اسمبلی عین ملاکنڈ آپریشن کے آغاز پر پارٹی کے نومنتخب سینیٹر عبدالنبی بنگش (دبئی میں رہتے ہیں اور کاروبار کرتے ہیں) کی دعوت پر کئی روز تک دبئی میں ان کی دعوتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے جبکہ ان حضرات نے متحدہ عرب امارات میں موجود پشتون کمیٹی سے امداد کے حصول کے لیے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا۔ وہ تحفے تحائف لے کر صوبے کو کئی روز تک وزراء کی عدم موجودگی کے باعث یتیم چھوڑنے کے بعد واپس آئے تو متاثرین کے لیے ان کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔

ایک اور تلخ بات یہ ہے کہ دو سال سے زائد کے عرصہ کے دوران پارٹی کے رہنماؤں اور وزراء نے دوسرے صوبوں کے پشتونوں سے کوئی رابطہ نہیں رکھا۔ وزراء محض پشاور اور اسلام آباد تک محدود رہے۔ حالانکہ پشتونوں نے اس پارٹی کے پلیٹ فارم سے سندھ اور بلوچستان میں بھی نمائندے کامیاب کروائے تھے۔ اس کے برعکس 2004ء کے بعد

صوبہ پختونخواہ میں بننے والی ایم ایم اے کی حکومت نے سندھ اور بلوچستان کے اپنے ووٹروں اور پشتون آبادی سے رابطے پر پوری توجہ دی تھی۔ سینئر صوبائی وزیر اور جماعت اسلامی کے صوبائی امیر سراج الحق کئی کئی روز تک کراچی میں قیام کر کے پشتون آبادی کو اپنی پارٹی کی طرف نہ صرف راغب کرتے رہتے بلکہ وہ ایک حکومتی عہدیدار کی حیثیت سے ان کے کام بھی نمٹاتے رہے۔ پاکستانی طالبان کے عروج کے دور میں پارٹی کے عہدیدار اور کارکن بدترین عدم تحفظ اور مایوسی کی صورتحال سے دوچار رہے تو ان کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی کے لیے میدان میں کوئی لیڈر یا عوامی نمائندہ نہیں تھا۔ ایک وقت میں (2009ء کے اوائل میں) صورتحال اس قدر مایوس کن تھی کہ پارٹی کے مرکزی لیڈر اور وزیراعلیٰ کے والد اعظم ہوتی سے اگر کوئی پارٹی عہدیدار یا ووٹر کوئی شکایت کرتا تو وہ اس کو دوسری پارٹیوں خصوصاً مسلم لیگ (ن) میں جانے کا مشورہ دے کر فارغ کر دیتے۔ سینئر لیڈروں مثلاً اجمل خٹک، افضل خان لالہ، لطیف آفریدی اور متعدد کو عملاً پارٹی کے معاملات یہاں تک کہ مشاورت سے بھی الگ رکھا گیا۔ ان کے مقابلے میں حکومت کے ایوانوں میں ایسے افراد کو پروٹوکول دیا جاتا رہا جن کا پارٹی کی نظریاتی اساس اور کارکنوں سے شاید دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ ایوان اقتدار کی بھول بھلیوں میں غیر منتخب مشیروں کو اختیارات دیئے گئے اور عوام کی حکمرانوں تک رسائی مشکل بنا دی گئی۔ صوبے کو بجلی کی ناروا لوڈشیڈنگ، آٹے کے بدترین بحران، قیمتوں کے بے تحاشا اضافے، کرپشن کی شرح میں بے حد اضافے، انتظامی ڈھانچے کے غیر موثر ہونے، اقربا پروری کے بے شمار واقعات اور بعض دوسرے بنیادی مسائل نے ہلا کر رکھ دیا۔ تاہم اے این پی عوام کو ریلیف دینے میں عملاً ناکام رہی۔ یوں اس پارٹی کی سیاست، طریقہ کار، طرز حکمرانی یہاں تک کہ سیاسی وژن کے بارے میں متعدد بنیادی سوالات اور خدشات جنم لینے لگے۔ اے این پی اس تمام عرصے میں پشتونوں کے سیاسی مقدمے سمیت دوسرے ایشوز کو ملکی اور عالمی سطح پر اجاگر کرنے میں اس حقیقت کے باوجود ناکام رہی کہ عالمی، علاقائی قوتوں کی آپس کی جنگیں پشتون سرزمین پر لڑی جا رہی تھیں اور خود اس پارٹی کا سیاسی مستقبل بھی ایک سوالیہ نشان بنتے جا رہا تھا۔

✿ ✿ ✿ ✿

دہشت گردی اور اقتصادی بدحالی

معاشی اور کاروباری سرگرمیاں ہی مجموعی معاشرتی ترقی میں بنیادی اور اہم کردار ادا کرتی ہیں جن سے وسائل روزگار میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ لوگوں کے معیار زندگی پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ افغانستان کی طویل بدامنی نے پاکستان کے اس حساس علاقے کو گزشتہ تیس سال سے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا لیکن نائن الیون کے بعد افغانستان پر امریکی قبضہ اور دہشت گردی اور انتہا پسندی کے لیے اس علاقے کے مرکز بن جانے اور پھر دہشت گردی کے خاتمہ کے لیے شروع ہونے والی جنگ نے اس کی تباہی کے تمام امکانات پیدا کر دیئے خصوصاً ملاکنڈ ڈویژن میں جب طالبان کا قبضہ ہوا تو جہاں بہت سارے مقامی وسائل مفلوج ہو کر رہ گئے۔ بہت سارے شعبوں کا معاشی ارتقا رک گیا تو ہاں اس قبضہ کو چھڑوانے کے لیے شروع ہونے والے آپریشن راہ راست نے بھی اس خطہ کی حیثیت کو تباہی کے دہانے تک پہنچا دیا۔ کاروباری سرگرمیاں معدوم ہوئیں، وسائل روزگار ختم ہوئے تو یہاں کے لوگ دوہرے نفسیاتی مسائل کا شکار ہو گئے ایک طرف تو ایٹمی جنگ اور اُس کے اثرات کا سامنا تھا تو دوسری طرف اپنے مالی اور معاشی تحفظ کی فکر لاحق ہو گئی۔ یہ وہ صورتحال تھی جس میں اس خطے کے لوگ بدترین مایوسی کا شکار ہو گئے مزید بدقسمتی یہ کہ حکومت اور بین الاقوامی امدادی اداروں کا رویہ بھی ایسا متاثر کن نظر نہیں آیا اور اُن کے خلاف بددلی میں اضافہ ہوا۔ حالانکہ اس خطے کے لوگ یہ بھی سمجھتے تھے کہ وہ نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا میں اس جنگ میں براہِ راست متاثر ہو رہے ہیں لیکن ان کی طرف وہ توجہ نہیں دی جا

رہی جس کے وہ مستحق ہیں ......کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ صوبہ سرحد میں دہشت گردی کی خوفناک لہر اور قبائلی علاقہ جات میں جاری مزاحمتی کارروائیوں نے اس خطے کی معیشت، اقتصادیات اور عام کاروباری سرگرمیوں کو بدترین صورتحال سے دوچار کر دیا۔ اقتصادی ماہرین خدشہ ظاہر کر رہے تھے کہ اگر معاشی بدحالی کی موجودہ حالت اسی طرح برقرار رہی تو صوبہ سرحد اور فاٹا کے مختلف علاقے تاریخ کی بدترین اقتصادی مشکلات، بے روزگاری اور اُس سے جنم لینے والے نفسیاتی مسائل سے دوچار ہو جائیں گے۔ اعداد و شمار کے مطابق صوبہ سرحد میں 12 سو کے قریب بڑے صنعتی یونٹ جبکہ اتنی ہی تعداد میں چھوٹے یونٹس موجود ہیں تاہم ایک سال کے دوران بجلی کی لوڈشیڈنگ اور اس کے ساتھ ساتھ دہشت گردی کے پے در پے واقعات نے ان صنعتی اداروں کے مستقبل کو سوالیہ نشان بنا دیا۔ حیات آباد انڈسٹریل سٹیٹ میں موجود آٹھ سو کے لگ بھگ یونٹس کے سٹاف میں بجلی کی لوڈشیڈنگ کے باعث 2009ء کے دوران 30 فیصدی کٹوتی کی گئی۔ دوسرے مرحلے کے دوران جب افغانستان سے ملحقہ خیبر ایجنسی میں فوجی کارروائیوں کی ابتداء کی گئی تو اس صورتحال نے رہی سہی کسر بھی پور کر دی کیونکہ کارخانہ داروں کو میٹریل کی دستیابی اور مال کی سپلائی کا سنگین مسئلہ درپیش ہوا۔

اسی عرصہ کے دوران پشاور کے اس علاقے کے علاوہ پورے پشاور سے صنعت کاروں، کارخانہ داروں اور سرکاری افسران کے اغواء کا سلسلہ بھی اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ ان لوگوں کو جان بچانے کی فکر لاحق ہو گئی تو زیادہ تر لوگوں نے اپنا سرمایہ اور کاروبار دوسرے علاقوں خصوصاً پنجاب کے شہروں میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ ورکرز ویلفیئر بورڈ صوبہ سرحد کے ایک اعلیٰ عہدیدار کے مطابق اس عرصہ کے دوران صرف حیات آباد انڈسٹریل سٹیٹ میں 600 کے قریب یونٹس یا تو باہر منتقل کیے گئے یا بند ہوئے۔ پشاور کے علاوہ نوشہرہ صوابی (گدون آزمائی انڈسٹریل سٹیٹ) اور سوات کی انڈسٹریل سٹیٹ کے 500 سے زائد چھوٹے بڑے یونٹس بھی ایسی ہی صورتحال سے دوچار ہو کر رہ گئے۔ صوبائی لیبر ڈیپارٹمنٹ کے حکام کے ایک محتاط اندازے کے مطابق گزشتہ 18 مہینے کے دوران صنعتی زوال کے باعث صوبہ سرحد کو 50 سے 70 ارب روپے تک کے ناقابل برداشت مالی نقصان

کا سامنا کرنا پڑا جبکہ اس تمام صورتحال کے نتیجے میں 30 سے 40 ہزار تک لوگ بے روزگار ہو گئے۔ اغواء کے بڑھتے واقعات اور افغانستان کو مال کی عدم فراہمی جیسی صورتحال نے صوبہ سرحد کی محدود انڈسٹری کا مستقبل تاریک بنا دیا جبکہ حکومت کارخانہ داروں اور کاروباری حلقوں کے مسلسل مطالبات کے باوجود ان لوگوں کے لیے کسی قسم کی رعایت یا مراعات کا اعلان کرنے میں ناکام رہی ہے۔ سرحد چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے عہدیداروں نے رابطے پر بتایا کہ وہ عرصہ 3 سال سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ صوبہ سرحد کو جنگ زدہ علاقہ قرار دے کر اس کی صنعتوں کو قائم رکھنے کے لیے ٹیکسوں کی چھوٹ یا کمی کا کوئی فارمولا وضع کیا جائے تاہم ایسا کچھ نہیں کیا گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ سوات میں ڈیڑھ سو سے زائد کارخانوں کو طالبان اور اس کے بعد فوجی آپریشن کے دوران نقصان پہنچا۔ تاہم حکومت نے اس ضمن میں تمام تر درخواستوں اور رابطوں کے باوجود کوئی مدد نہیں کی یہی وجہ ہے کہ پنجاب سے آئے کارخانہ داروں اور کاروباری حضرات نے مایوس ہو کر اپنا سرمایہ نکالنے ہی میں عافیت سمجھی۔ یہی صورتحال پشاور اور گدون آزمائی (صوابی) سمیت دوسرے علاقوں میں بھی دیکھی گئی۔

اعداد و شمار کے مطابق مارچ 2008ء سے لے کر جولائی 2009ء تک کے عرصہ کے دوران صرف پشاور سے 395 افراد کو اغواء کیا گیا ان میں 200 کے قریب افراد کا تعلق کاروباری حلقوں سے تھا۔ اس صورتحال میں بڑے چھوٹے تاجروں اور صنعتکاروں کے لیے واحد راستہ یہ رہ گیا کہ وہ جان اور سرمایہ بچانے کے لیے دوسرے شہروں کا رُخ کریں۔ پشاور کے صنعتی یونٹس اور دوسری کاروباری سرگرمیوں کی مارکیٹنگ ویلیو کا ستر فیصد انحصار افغانستان پر ہوتا ہے تاہم شرپسندوں کی جانب سے سپلائی لائنز پر مسلسل حملوں اور سرحدی رکاوٹوں کے سلسلے نے اس نیٹ ورک کو درہم برہم کر کے رکھ دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ کاروبار 70 فیصد تک بری طرح متاثر ہوا۔

پشاور سے اشیائے خورد و نوش (Food Stuf) کی مد میں امن کی حالت میں روزانہ 200 سے لے کر 300 تک گاڑیاں طورخم بارڈر پار کر کے افغانستان اور وہاں سے وسط ایشیائی ریاستوں تک جایا کرتی تھیں۔ اس کاروبار سے پورے پاکستان خصوصاً پنجاب اور صوبہ سرحد کے تاجروں، صنعت کاروں اور عام لوگوں کو روزانہ کروڑوں کا منافع ہوتا تھا جبکہ

اس کاروبار سے جو عام مزدور، ڈرائیور اور دوسرے لوگوں کا کاروبار وابستہ تھا اُن کی تعداد ہزاروں میں تھی تاہم دہشت گردی کے واقعات کے باعث جہاں پنجاب کے کاروباری حلقوں نے میٹریل کی فراہمی سے ہاتھ روک دیا وہاں سرمایہ پھنس جانے یا ڈوب جانے کے خدشے نے مقامی کاروباری لوگوں کو بھی لاتعلقی پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ ایک ایسا موقع کا بھی آیا کہ صوبہ سرحد کی 75 فلور ملیں بند ہوگئیں اور عام لوگ بھی آٹے کو ترستے نظر آئے۔

افغانستان کے ساتھ 2001ء سے اشیائے خورد و نوش کی تجارت کرنے والے حاجی نیاز محمد کے مطابق پاکستان سے 2007ء تک روزانہ 300 سے 600 تک ٹرک غلام خان (میران شاہ) اور طورخم کے راستے افغانستان جایا کرتے تھے۔ اس کاروبار سے جہاں عام لوگوں اور تاجروں کو اربوں کا فائدہ ہو رہا تھا وہاں حکومت پاکستان کو ایکسپورٹ ڈویلپمنٹ سرچارج کی صورت میں غیر معمولی سرمایہ بھی مل رہا تھا تاہم 2008ء کے بعد یہ سلسلہ بری طرح متاثر ہوگیا۔ اُن کے مطابق صرف پشاور کے نوے دروازے (نیا دروازہ) اشرف روڈ، کارخانو مارکیٹ اور بعض دوسرے مراکز میں اس کاروبار سے تقریباً 5 ہزار افراد وابستہ تھے تاہم اب حالت یہ ہے کہ نہ صرف بڑے یونٹس بند ہو گئے ہیں بلکہ یہ ہزاروں افراد ہاتھ پر ہاتھ دھرے بے روزگار بیٹھے ہوئے ہیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ اس صورتحال کی بنیادی وجہ دہشت گردی کے بڑھتے واقعات، بجلی کی لوڈشیڈنگ، پنجابی کارخانہ داروں کا احساس عدم تحفظ، اغواء کی بڑھتی ہوئی وارداتوں اور پاک افغان تعلقات کی سرد مہری ہی کہلائی جا سکتی ہے۔ صوبہ سرحد اور فاٹا میں دہشت گردی کی بڑھتی ہوئی وارداتوں نے اس خطے کے لوگوں کا امیج اس قدر تباہی سے دوچار کر دیا کہ سال 2009ء کے دوران 40 سے زائد ممالک (متعدد اسلامی ممالک بھی) نے غیر اعلانیہ طور پر اس خطے کے لوگ یہاں تک کہ کاروباری حلقوں کو بھی ویزے دینے کا سلسلہ ترک کر کے ایک طرح سے ان پر پابندی لگا دی۔ بڑے تاجروں، کارخانہ داروں اور کاروباری حلقوں کے علاوہ دہشت گردی کی جاری لہر نے پشاور کے عام کاروبار اور معاشی سرگرمیوں کو بھی بدترین حالات سے دوچار کر کے رکھ دیا۔ دکانداروں میں عدم تحفظ کے احساس نے کاروبار سے مکمل لاتعلقی کی مجبوری کو جنم دینا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ معلوم ہوا کہ پشاور صدر، یونیورسٹی روڈ، خیبر بازار اور حیات آباد کے زیادہ تر بڑے دکاندار

دھماکوں کے بعد دن کے اوقات میں اپنی دکانیں کھولتے ہی نہیں تھے۔ ان علاقوں کی 50 فیصد دکانیں گزشتہ کئی ماہ سے (خیبر بازار دھماکہ کے بعد) دن کے وقت بند پڑی رہتی تھیں۔ شام کے بعد اگر دکانیں کھل جائیں تو پھر گاہک نہیں ہوتے تھے یا بجلی کے باعث اندھیرے سے نمٹنا پڑتا تھا۔

پشاور صدر میں گارمنٹس کا کاروبار کرنے والے توقیر احمد کے مطابق وہ اپنی دکان کا 80 ہزار ماہانہ کرایہ دیتے ہیں۔ تین ان کے ساتھ معاونین ہیں جن کی پانچ سے آٹھ ہزار تک تنخواہ بنتی ہے۔ چار، پانچ سو روپے کا وہ جنریٹر میں پٹرول ڈالتا ہے جبکہ کاروبار کی حالت یہ ہے کہ وہ پورے دن کے دوران 2000 کا سودا بھی فروخت نہیں کرسکتا۔ اُن کا کہنا تھا کہ وہ گزشتہ 8 ماہ سے کمانے کی بجائے دکان برقرار رکھنے کے لیے جیب ہی سے پیسہ لگاتا رہا ہے جس کے بعد حالت یہ ہوگئی کہ فیصل آباد اور لاہور کے اُن کے سپلائرز سامان دینے سے بھی گریزاں ہیں کیونکہ اُن کو بروقت ادائیگی نہیں ہو رہی تھی۔

ایک مشہور جیولر کے مطابق گاہک کی آمد میں 80 فیصد کمی واقع ہوگئی۔ حالانکہ اس کاروبار سے عام لوگ پیسہ لے کر دکان پر آنے کا رسک لے سکتے تھے اور نہ ہی سودا لے کر بحفاظت گھر جانے کی ہمت کرسکتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ وہ گزشتہ 25 سال سے اس کاروبار سے وابستہ ہیں تاہم انہوں نے اس سے قبل ایسی صورتحال حال اور کساد بازاری پہلے نہ تو کبھی سنی اور نہ ہی دیکھی تھی۔ دوسرے دکانداروں کے مطابق پولیس کی ناکہ بندیوں، بدترین چیکنگ اور کسی بھی وقت دہشت گردی کی واردات کے خوف نے گاہکوں کو گھروں تک محدود کر دیا ہے۔ گاہک نہ ہونے کے باعث دکاندار بھی گھر بیٹھنے پر مجبور ہیں۔ شام ہوتے ہی پولیس والے آ کر دکانیں بند کرنے کا حکم دے دیتے۔ حالانکہ شام کے بعد گاہک تھوڑی سی تعداد میں آنا شروع ہو جاتے تھے۔

ارباب روڈ پشاور پر کپڑے کا کاروبار کرنے والی ایک مشہور کاروباری شخصیت کو اغواء کرنے اور بات نہ ماننے کی صورت میں بم سے اُڑانے کی دھمکیاں دی گئیں تو اُس نے دس روز تک اُس کاروباری سنٹر کو بند رکھا جہاں ایک اندازے کے مطابق روزانہ 20 سے 30 لاکھ تک کی خریداری ہوتی تھی۔ کیونکہ نامعلوم افراد نے ان سے 15 کروڑ روپے طلب کیے

تھے جبکہ شرپسندوں نے یہ کہہ کر سنٹر کو اُڑانے کی دھمکی دی تھی کہ وہاں خواتین خریداری کرنے آتی تھیں۔ اس شخص نے 5 کروڑ دے کر اپنی سلامتی کو ممکن بنایا جس کے بعد لوگ اس سنٹر میں 12 بندوق برداروں کی موجودگی میں خریداری کرنے آتے رہے ادھر ایک اور حقیقت تو یہ ہے کہ صرف ملاکنڈ کے آپریشن اور اس سے قبل طالبان کی کاروائیوں کے نتیجے میں پرائیویٹ سیکٹر میں لوگوں کو 100 ارب یعنی ایک کھرب سے زائد کا نقصان پہنچا۔ جو صوبہ پختونخواہ کے سال 9-2008ء کے مجموعی بجٹ کے برابر تھا۔ جن شعبوں میں اس ناقابل برداشت نقصان تقسیم کیا گیا۔ ان میں سیاحت، صنعت، زراعت، باغبانی، لوکل بیسڈ انڈسٹریز، پرائیویٹ عمارتوں اور املاک کی تباہی، ٹرانسپورٹ، ووڈ اینڈ وولن انڈسٹری، معدنیات، ترقیاتی کاموں اور عام کاروبار کی بندش، سرمایہ کا ارتکاز (Blockage) بدترین بے روزگاری، مہنگائی کی لہر، جنگلات کی طالبان کے ہاتھوں کٹائی، کنسٹرکشن کے کاروبار کی منتقلی سے پیدا شدہ صورتحال وغیرہ اور کچھ دوسرے شعبے شامل تھے یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ٹیکس ریلیف یا ٹیکس فری علاقہ ہونے کے باعث سوات اور دوسرے اضلاع (خصوصاً سوات) میں نہ صرف مقامی اور ملکی سرمایہ داروں نے بے شمار کارخانے لگائے تھے بلکہ درجنوں ملٹی نیشنل کمپنیز بھی یہاں قائم کی گئی تھیں۔

دوسری طرف صوبائی وزارت داخلہ کی ایک رپورٹ میں (3 نومبر 2009ء) پبلک سیکٹر کی مد میں صوبہ سرحد کو سال 9-2008ء کے دوران جو اقتصادی نقصان پہنچا اُس کی مالیت کا تخمینہ ناقابل تصور حد تک 306 ارب اور 40 کروڑ کی خطیر رقم کی صورت میں لگایا گیا۔ ان اعداد و شمار کو اکتوبر 2009ء کے دوران کوئٹہ، اسلام آباد اور پشاور میں ہونے والے قومی مالیاتی کمیشن کے اجلاسوں میں بھی پیش کیا گیا اور یہی وجہ تھی کہ وزیراعظم گیلانی نے پشاور میں ہونے والے اجلاس کے بعد بجلی کے خالص آمدن کی مد میں وفاق اور واپڈا کے ذمے صوبے کی واجب الادا 2 کھرب کے لگ بھگ رقم میں سے 110 ارب روپے دینے کا اعلان کیا۔ اس رقم میں 10 ارب روپے ایک ہفتہ کے اندر ادا کرنے کے احکامات بھی جاری کر دیئے گئے تاہم کئی ہفتے گزرنے کے باوجود یہ 10 ارب روپے ادا نہیں کیے گئے تھے۔ وزارت داخلہ کی جس رپورٹ میں تین سو ارب روپے سے زائد کے نقصان کی تفصیلات

فراہم کی گئی تھیں وہ کچھ اس طرح تھیں۔

O نقل مکانی کرنے والے افراد کی بحالی اور واپسی	9.4ارب روپے
O اضافی پالیسی ساز اخراجات و دیگر	37.4ارب روپے
O شہداء اور زخمیوں کی امداد اور طبی سہولیات	13.2ارب روپے
O سیکٹر وائز ادارہ جاتی نقصان	109ارب روپے
O وفاقی آمدن کی مد میں نقصان	7.8ارب روپے
O مجموعی ضائع ہونے والی ریونیو کا نقصان	2.5ارب روپے
O ڈونرز کی امداد میں تاخیر اور زیرِ التواء منصوبے	9.8ارب روپے
O انسٹی ٹیوشنل سروسز کی بحالی کے لیے درکار رقم	48ارب روپے
O سماجی سروسز کے شعبوں میں نقصان اور ان کی بحالی	54ارب روپے

اگر ان اعداد و شمار کو درست مانا جائے تو بہت بھیانک صورتحال بنتے دکھائی دے رہی تھی۔ ان رقوم کا انتظام کرنا اور پہلے سے تباہ شدہ انفراسٹرکچر کو بحال کرانا ایک ایسے صوبے کے لیے یقیناً ناممکن ٹاسک ثابت تھا جو کہ ریٹنگ کے لحاظ سے پہلے ہی سے پنجاب اور سندھ کے مقابلے میں بہت پیچھے تھا اور جہاں ملاکنڈ آپریشن کے بعد بھی جنگ کا دائرہ دوسرے علاقوں تک پھیلتا چلا گیا۔

✿ ✿ ✿ ✿

جی ایچ کیو پر حملہ سے صف بندی کی ابتداء

10/10 یعنی دس اکتوبر 2009ء کو دہشت گردی سے متعلق جاری جنگ کے حوالے سے یہ اہمیت حاصل ہے کہ اس روز افواج پاکستان کے سب سے بڑے مرکز یعنی جنرل ہیڈ کوارٹر (جی ایچ کیو) پر دہشت گردوں کے ایک انتہائی تربیت یافتہ گروپ نے دن کی روشنی میں حملہ کر دیا۔ دہشت گردی کی اس واردات کے نتیجے میں ایک درجن کے قریب سرکاری اہلکار اور سویلین کے علاوہ ایک بریگیڈیئر اور ایک کرنل کو بھی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اس واقعے نے پورے پاکستان کے عوام اور ریاستی اداروں کو ایک طرح سے نہ صرف یہ کہ بدترین تشویش سے دوچار کر دیا بلکہ اس سے انتہا پسندوں کی قوت' عزائم اور نیٹ ورک کے بارے میں بھی ایک نئی بحث کی ابتدا ہوگئی۔ دہشت گردوں نے 24 گھنٹے سے زائد تک ایک درجن سے زیادہ سکیورٹی اہلکاروں اور سویلین کو یرغمال بنا کر جی ایچ کیو کے اندر خود کو محفوظ رکھتے ہوئے ایک طرح سے ریاستی قوتوں کو ایک بڑی آزمائش سے دوچار کر دیا۔

2002ء سے لے کر 2009ء کے درمیان راولپنڈی شہر میں دہشت گردوں کی یہ انیسویں بڑی کارروائی تھی۔ اس شہر میں اب تک کیے گئے حملوں کے دوران سابق صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف اور محترمہ بے نظیر بھٹو سمیت آرمی اور خفیہ اداروں کے متعدد اعلیٰ افسران اور اہلکاروں کو مختلف اوقات میں نشانہ بنایا۔ اگرچہ راولپنڈی میں عام لوگوں کو بھی نشانہ بنایا گیا' تاہم اعلیٰ شخصیات یا اہم ادارے ہی زیادہ تر دہشت گردوں کا نشانہ بنائے گئے۔ 25 دسمبر 2003ء میں پرویز مشرف کے فوجی قافلے پر اس وقت حملے کیے گئے جب وہ

راولپنڈی سے اسلام آباد جا رہے تھے۔ ان پر ایک سے زائد خودکش حملے کیے گئے جس کے نتیجے میں صدر پاکستان کی گاڑی کو نقصان پہنچنے کے علاوہ 15 سکیورٹی اہلکار اور متعدد سویلین زندگی سے محروم کر دیئے گئے۔ 4 ستمبر 2007ء کو ایک بار پھر جی ایچ کیو کے ایک علاقے کو نشانہ بنایا گیا جس کے نتیجے میں 20 سے زائد ہلاکتیں ہوئیں۔ اس کے دو روز بعد یعنی 6 ستمبر کو ایف سی پر حملے میں چھ افراد جاں بحق ہو گئے۔ 30 اکتوبر 2007ء کو پولیس کو نشانہ بناتے ہوئے سات افراد کو شہید کر دیا گیا۔ 24 نومبر 2007ء کو ایک بار پھر ایف سی پر ہونے والے حملے میں 33 جبکہ اسی روز ایک اور مقام پر حملے میں دو ایف سی اہلکاروں کو ٹارگٹ بنایا گیا۔

اور پھر 27 دسمبر 2007ء کا وہ افسوسناک واقعہ تو تاریخ کا بدترین سانحہ ثابت ہوا جب سابق وزیراعظم اور پی پی پی کی چیئرپرسن بےنظیر بھٹو دہشت گردی کا شکار ہوگئیں۔ اس واقعے میں ان کے علاوہ 20 سے زائد افراد زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے جبکہ پاکستان ایک جرأت مند اور عوامی لیڈر سے محروم ہو گیا۔ 25 فروری 2009ء کو اسی شہر میں ایک حملے کے دوران جنرل مشتاق سمیت سات افراد کو دہشت گردی کا نشانہ بننا پڑا۔ اس طرح حساس اداروں کی گاڑیوں پر بھی متعدد حملے کیے گئے۔ یاد رہے کہ اہم واقعات کی یہ تفصیل اکتوبر 2009ء تک کی کارروائیوں پر مشتمل ہے۔

16 مارچ 2009ء کو عام سویلین کو نشانہ بناتے ہوئے 15 قیمتی جانیں لے لی گئیں جبکہ مارچ کے بعد 10 اکتوبر کے جی ایچ کیو والے واقعے کے درمیان بھی متعدد سرکاری افسران اور سرکاری گاڑیوں کو نشانہ بنایا گیا جن کے نتیجے میں ایک رپورٹ کے مطابق 38 سے زائد افراد کو شہید کر دیا گیا۔ اس عرصے میں مساجد اور امام بارگاہوں پر بھی حملے کیے گئے۔ تاہم سرکاری اہلکار خصوصی سکیورٹی فورسز کے لوگ ہی زیادہ تر دہشت گردی کا نشانہ بنائے جاتے رہے۔

10 اکتوبر کے حملے نے پاکستان کی سلامتی اور سکیورٹی سے متعلقہ حلقوں اور عوام کی تشویش میں بے حد اضافے کا راستہ ہموار کر دیا کیونکہ یہ سوال ذہن میں پیدا ہونا لازمی اور فطری امر تھا کہ اگر جی ایچ کیو جیسے مقام کو نشانہ بنا کر دو اعلیٰ ترین افسران سمیت متعدد افراد کو شہید کرنے کے علاوہ کئی دوسروں کو چوبیس گھنٹے تک یرغمال بنایا جا سکتا ہے تو عام مقامات یا

عام لوگوں کی حفاظت کو کیونکر یقینی یا ممکن بنایا جا سکتا ہے۔

جس وقت جی ایچ کیو پر حملہ کیا گیا اس وقت دوسروں کے علاوہ چیف آف آرمی سٹاف جنرل اشفاق پرویز کیانی بھی جی ایچ کیو میں موجود تھے۔ وہ تمام تر صورتحال کا خود جائزہ لیتے رہے اور آپریشن سے متعلق اقدامات میں خود بھی دلچسپی کا اظہار کرتے رہے۔ فورسز کے لیے دہشت گردوں کے داخلے کے وقت اپنے ساتھیوں اور دہشت گردوں کے درمیان فرق کرنا ایک مشکل کام بن گیا تھا کیونکہ حملہ آوروں نے بھی فوجی وردیاں پہنی ہوئی تھیں۔ اسی کنفیوژن ہی کا نتیجہ تھا کہ ایک بریگیڈیئر اور ایک کرنل بھی غلط فہمی کے باعث اپنی حفاظت کے لیے کوئی قدم نہ اٹھا سکے۔ فورسز کے لیے دوسرا مسئلہ یرغمالیوں کی باحفاظت بازیابی کو ممکن بنانا تھا کیونکہ جن افراد نے ان کو یرغمال بنایا تھا ان کے پاس نہ صرف یہ کہ جدید ترین ہتھیار تھے بلکہ ان میں ایک یا دو نے خودکش جیکٹ بھی پہن رکھی تھی۔ جی ایچ کیو کی اہمیت اور دہشت گردوں سے نمٹنے کی غیر روایتی پلاننگ کے تناظر میں کی جانے والی ممکنہ حد تک محفوظ کارروائی نے فورسز کو واقعتاً ایک بڑی آزمائش سے دوچار کیا۔ یہی وجہ تھی کہ فورسز نے واقعے کے بعد کسی بھی ایسے اقدام سے گریز کیا جس سے زیادہ جانی نقصان کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ فورسز نے رات کے آخری پہر یعنی صبح (پانچ یا چھ بجے) کمانڈو ایکشن کر کے ممکنہ حد تک یرغمالیوں کو رہا کرا لیا۔ تاہم اس کارروائی کے دوران متعدد کمانڈوز سمیت بعض یرغمالی بھی نشانہ بن گئے۔ تمام دہشت گرد مارے گئے تاہم ان کے سربراہ یا کمانڈر ڈاکٹر عثمان کو انتہائی زخمی حالت میں گرفتار کر لیا گیا۔

ڈاکٹر عثمان راولپنڈی کے نواحی علاقہ کہوٹہ سے تعلق رکھنے والے جہادی کمانڈر تھے۔ وہ ماضی میں پاکستان آرمی کی میڈیکل کور سے بھی وابستہ رہ چکے تھے۔ بعد میں وہ ایک انتہا پسند جہادی تنظیم کے رکن بن گئے۔ انہوں نے وزیرستان میں بھی لمبے عرصے تک قیام کر کے نہ صرف یہ کہ گوریلا لڑائی کی تربیت حاصل کی بلکہ انہوں نے اعلیٰ طالبان قیادت اور بعض القاعدہ کمانڈروں سے بھی روابط قائم کر لیے۔ دوسرے حملہ آوروں میں سے (جن کو ہلاک کیا گیا) تین یا چار کا تعلق وزیرستان سے تھا۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ مذکورہ حملے کے بعد مال روڈ کی تمام تر سکیورٹی کے باوجود نومبر 2009ء کے آخری ہفتے کے دوران ایک اور

خودکش حملہ کے دوران مزید 34 افراد کو مارا گیا جن میں اکثریت حاضر سروس اور ان ریٹائرڈ فوجیوں کی تھی جو کہ تنخواہ یا پنشن لینے ایک بینک میں آئے تھے۔ جی ایچ کیو پر کیے گئے حملے کو فوری طور پر وزیرستان میں آپریشن کے ردعمل کے علاوہ بیت اللہ محسود کی ہلاکت کے تناظر میں بھی دیکھا جانے لگا۔ بعض مبصرین نے حسب روایت اس حملے کو ایک بار پھر بھارت کے کھاتے میں بھی ڈال دیا' تاہم آئی ایس پی آر اور حکومت کے اعلیٰ حکام اپنے ردعمل میں دوسروں کے برعکس انتہائی احتیاط کا مظاہرہ کرتے رہے۔

ڈی جی آئی ایس پی آر میجر جنرل اطہر عباس میڈیا خصوصاً ٹیلی ویژن چینلز کو نہ صرف ممکنہ اطلاعات کی فراہمی میں مسلسل لگے رہے بلکہ وہ میڈیا کو بھی غیر ذمہ داری کی کسی حرکت کرنے یا اطلاع دینے سے گریز کا بھی مشورہ دیتے رہے۔ آپریشن کی کامیابی یا اختتام کے بعد ڈی جی آئی ایس پی آر نے واقعات کی تمام تر تفصیلات میڈیا کو فراہم کیں اور یوں یہ واقعہ متعدد سوالات اور مستقبل کے خدشات ذہنوں میں چھوڑتے ہوئے اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

جی ایچ کیو کے حملے سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ کچھ تجزیہ نگار اور حکمران سوات آپریشن کی کامیابی کے بعد طالبان کے خاتمے کے جو دعوے کر رہے تھے' وہ شاید درست نہیں تھے کیونکہ طالبان نہ صرف یہ کہ بیت اللہ کی موت کے بعد انتہائی متشدد ہو کر پورے ملک پر حملہ آور ہو گئے تھے بلکہ اب انہوں نے بڑے تواتر سے سکیورٹی فورسز اور سکیورٹی سے متعلق اداروں کو یکے بعد دیگرے انتہائی کامیابی سے نشانہ بنانے کا سلسلہ بھی بڑھا دیا تھا۔ جی ایچ کیو کے حملے سے یہ تاثر لینا ایک فطری عمل تھا کہ یہ لوگ اتنے طاقتور اور منظم ہیں کہ اگر جی ایچ کیو جیسے مقام کو نشانہ بنا سکتے ہیں تو ان کے لیے کہیں پر بھی پہنچنا ناممکن نہیں۔ جی ایچ کیو پر حملے کے دوران بعض غیر ملکی میڈیا اداروں اور پاکستان کے مخالفین کو ایک بار پھر یہ کہتے سنا گیا کہ یہ واقعہ اس خدشے کو تقویت پہنچا رہا ہے کہ طالبان پاکستان کی حکومت اور فورسز کو نہ صرف مفلوج بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ وہ پاکستان کے ایٹمی اثاثوں پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

جی ایچ کیو حملہ کے بعد ایوان صدر میں منعقدہ ایک اعلیٰ سطحی اجلاس کے دوران

دوسرے اقدامات کے علاوہ وزیرستان میں متوقع آپریشن کے باقاعدہ آغاز کا بھی فیصلہ کیا گیا کیونکہ اب طالبان نے اپنے لیے اقتدار کے تمام مراکز میں سے کہیں پر بھی ہمدردی یا مصالحت کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔ اسی اجلاس میں وزیرستان آپریشن کے لیے غیر اعلانیہ طریقے سے 17 اکتوبر 2009ء کی تاریخ کا فیصلہ کیا گیا اور پھر اسی روز فورسز کی باقاعدہ پیش قدمی کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ آپریشن سے متعلق باقاعدہ پیش قدمی سے قبل حکومتی عہدیداران اور فوجی حکام خصوصاً ڈی جی آئی ایس پی آر بڑے تواتر سے میڈیا کے ذریعے وزیرستان ہی کو دہشت گردوں کا ہیڈ کوارٹر قرار دے کر آپریشن کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے لگے جبکہ ان کے علاوہ دوسرے حلقوں کی جانب سے بھی وزیرستان پر حملہ آور ہونے کی ضرورت کی وکالت کر کے اس کارروائی کو ناگزیر قرار دیا جانے لگا کیونکہ اب اس مرکز کو ٹارگٹ بنایا گیا تھا جس کو پاکستانی ریاست کے اندر اقتدار کے حقیقی مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

جی ایچ کیو پر حملے کے بعد اعلیٰ عسکری قیادت کی سرگرمیوں کو اور بعض حکومتی فیصلوں اور معاملات میں غیر معمولی دلچسپی لینے کی پالیسی کو عمل شکل میں دیکھنے یا محسوس کرنے کا سلسلہ تیز ہو گیا جس کو بعض زیرک لوگوں نے ماضی کے تجربات کے تناظر میں سول سیٹ اپ سے متعلق اب تک کی پالیسی کے تناظر میں ایک اہم تبدیلی کا نام دیا۔ اس تناظر میں متوقع تبدیلیوں کی باتیں بھی بڑی تیزی سے چلنے لگیں کیونکہ حکومت کے قیام کے بعد سیاسی معاملات سے فوجی قیادت کی ممکنہ حد تک لاتعلقی اور سول حکومت کے فیصلوں کا احترام کرنے کے باوجود ایک عام تاثر یہ تھا کہ حکومتی اور سیاسی قیادت ملکی معاملات خصوصاً دہشت گردی کے نازک ایشو پر عالمی برادری اور اتحادیوں کے ساتھ برابر طریقے سے ڈیلنگ کرنے میں زیادہ سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کر رہی۔

سوات آپریشن کے دوران فوج اور دوسرے اداروں کے بے شمار جوان اور افسران زندگی ہار گئے۔ تاہم سویلین صدر یعنی آصف علی زرداری کی دلچسپی یا کارکردگی محض بیانات تک ہی محدود رہی۔ سال 2009ء کے دوران امریکہ اور برطانیہ کے سربراہان مملکت سمیت دوسری اعلیٰ شخصیات نے افغانستان میں طالبان کے خلاف لڑنے والے اپنے

سپاہیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ایک رپورٹ کے مطابق 32 بار افغانستان کے دورے کیے۔ تاہم پاکستانی سیاسی قیادت اس معاملے میں اپنے دفاتر اور ڈرینگ رومز تک ہی محدود رہی۔ صدر زرداری اور ان کے وزراء نے فوجی جوانوں سے ملنا تو درکنار آئی ڈی پیز کے کیمپوں کا دورہ کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔ یہاں تک کہ سرحد کابینہ میں شامل پی پی کے وزراء بھی اس تمام آزمائش اور تکلیف کے دوران متاثرین کی حوصلہ افزائی کے لیے اپنے دفاتر سے باہر نہیں نکلے۔ دوسری طرف سویلین حکومت نے حکومتی اداروں کی بحالی یا فعالیت کے بنیادی مسئلے پر بھی اس سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا جس کی قوم اور فورسز کو توقع تھی۔ اعلیٰ عسکری قیادت کو قدم قدم پر محسوس ہونے لگا کہ سویلین حکمران اور دوسرے سیاستدانوں سے وہ سپورٹ نہیں مل رہی جس کی کسی فوج کو حالت جنگ میں ضرورت ہوتی ہے۔

حکمران جماعتوں کے درمیان دہشت گردی سمیت ملکی سلامتی سے متعلق دوسرے امور کو سنجیدگی سے لینے اور ان معاملات پر عوام کی سطح پر اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوششوں کے حوالے سے کوئی کوآرڈی نیشن سامنے نہیں آ رہی تھی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فوجی حلقوں میں یہ تاثر تیزی سے پھیلنے لگا کہ لاشیں تو فوجی جوانوں کی گر رہی ہیں اور حکمران اپنے دوروں، تقریبات اور نان ایشوز میں الجھے ہوئے ہیں۔ اسی دوران کیری لوگر بل کے معاملے پر جب میڈیا میں یہ خبریں آنے لگیں کہ اس بل کے اندر فورسز سے متعلق بعض شرائط ریاستی حکمرانوں خصوصاً حسین حقانی کی ایک مہم کے نتیجے میں ڈال دی گئی ہیں تو عسکری قیادت کے لیے خاموش رہنا ممکن نہیں رہا اور کور کمانڈروں کے اجلاس کے دوران نومبر 2009ء کے وسط میں ان تمام معاملات پر بحث کرنے کے بعد شدید ردعمل کا اظہار کیا گیا۔

سیاسی اور حکومتی قوتوں کے غیر سنجیدہ ردعمل کا محض عسکری قیادت نے نوٹس نہیں لیا بلکہ عوام یہاں تک کہ سیاسی پارٹیوں کے کارکنوں اور حامیوں میں بھی ان کی غیر سنجیدگی اور نااہلی کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ مسلم لیگ (ن) جیسی پارٹی نے بھی اس تمام معاملے میں اس فوج کا کھل کر ساتھ نہیں دیا جس نے اس پارٹی کو ایک بڑی قوت بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ عسکری قیادت میں یہ بحث پھر سے چل نکلی کہ اگر سیاسی قوتیں محض اقتدار کے مزے لوٹنے ہی کے لیے قلعہ نما محلات میں مورچہ بند ہو کر دہشت گردی کے

معاملے کو سنجیدہ نہیں لے رہی ہیں تو پھر فوج کی مجموعی پالیسی کیا ہونی چاہیے۔ مجموعی صورتحال کچھ اس طرح کی بنتی دکھائی دینے لگی کہ شاید موجودہ حکمرانوں کو مکمل آزادی کے ساتھ حکمرانی انجوائے کرنے کی گنجائش وقت گزرنے کے ساتھ کم ہوتی جائے گی۔ سیاستدانوں اور حکمرانوں کی جانب سے جنگ زدہ علاقوں کے عوام اور برسرپیکار فورسز کے ساتھ بڑھتی ہوئی دوری نے نہ صرف عسکری قیادت کو نوٹس لینے پر مجبور کیا بلکہ عوام اور میڈیا کے حلقوں میں بھی سیاسی قوتوں کی نااہلی' غیر سنجیدگی اور بزدلی کا تاثر تیزی سے پھیلنے لگا۔

❁ ❁ ❁ ❁

پنجابی طالبان اور ان کی تنظیمیں

پاکستان کی پنجابی اور عسکری قیادت تمام تر ٹھوس اطلاعات اور حقائق کے باوجود یہ ماننے کو تیار نظر نہیں آتی کہ پنجاب خصوصاً اس کے جنوبی علاقوں میں طالبان اور انتہا پسند ایک بڑی قوت کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ دس اکتوبر کو جی ایچ کیو پر حملہ کیا گیا تو پنجابی طالبان نے ایک گھنٹہ کے اندر نجی ٹی وی چینلز کو فون کر کے اس واقعے کی ذمہ داری قبول کر لی۔ تاہم پنجابی اشرافیہ (بشمول پنجابی میڈیا) نے ذمہ داری لینے کے اس اعتراف کو نہ تو نمایاں کیا اور نہ ہی روایتی مبصرین نے اپنے تاثرات میں پنجابی طالبان پر رائے دینے کی کوئی خاص ضرورت محسوس کی۔ اس مخصوص طبقے کو صرف پشتون طالبان ہی نظر آئے جو عرصہ دراز سے اس مہم کا ایک باقاعدہ حصہ بنے ہوئے تھے۔

آپریشن جانباز کی تکمیل کے دوسرے روز ڈی جی آئی ایس پی آر میجر جنرل اطہر عباس تفصیلی بریفنگ دیتے ہوئے اس بات پر بار بار تکرار کرتے نظر آئے کہ ملک میں انتہا پسندی اور دہشت گردی کے جتنے بھی واقعات رونما ہوتے ہیں اس کی تمام تر منصوبہ بندی وزیرستان میں کی جاتی ہے۔ وہ عالمی میڈیا کے ان سوالات کو مسلسل نظر انداز کرتے رہے جس میں اس بات پر زور دیا جا رہا تھا کہ کیا پنجابی طالبان مضبوط ہو رہے ہیں؟

تاریخی حقائق کو مدنظر رکھا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ پنجاب ماضی میں مضبوط سیاسی قیادت کے سامنے نہ آنے کے باعث ہمیشہ فرقہ وارانہ تنظیموں کا گڑھ رہا ہے۔ جنہیں ریاستی ادارے اپنے مخصوص مقاصد کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ کشمیر کے جہاد

کی جو پالیسی ریاست کی چھتری کے نیچے کئی دہائیوں سے چلتی آرہی ہے اس کا مرکز پنجاب ہی تھا اور اب بھی ہے۔ اسی پالیسی کا نتیجہ ہے کہ حافظ محمد سعید' مولانا مسعود اظہر' الیاس کشمیری اور متعدد دوسرے جہادی لیڈروں کو ایک پالیسی کے تحت رعایتیں بھی دی جاتی رہیں اور ان کو ریاستی پروٹوکول سے بھی نوازا جاتا رہا۔ جیش محمد' لشکر جھنگوی' سپاہ صحابہ اور اس مزاج کی دوسری خطرناک تنظیموں نے پنجابی اسٹیبلشمنٹ کی سرپرستی میں ہی جنم لے کر فرقہ واریت کے نام پر سینکڑوں عام لوگوں اور مخالفین کو نشانہ بنایا۔ جی ایچ کیو پر حملہ کرنے والے عناصر اور ان کے لیڈر کا تعلق بھی پنجاب ہی سے تھا۔ یہ الگ بات کہ ریاستی اداروں نے ایک منصوبے کے تحت دوسرے ذمہ داران کو ممکنہ حد تک نظر انداز کر کے ان پانچ دہشت گردوں کو بہت نمایاں کرنے کی کوشش کی جن کا تعلق محسود قبیلے سے بتایا جا رہا تھا۔ دیکھا جائے تو یہ تاثر اب ایک حقیقت کی شکل اختیار کر چکا ہے کہ پاکستان کا ایک مخصوص طبقہ یہ ماننے کو تیار ہی نہیں کہ ان کی سرزمین پر طالبان یا ان کے دوسرے فکری اتحادی جنم لے سکتے ہیں یا لے چکے ہیں۔ پاکستانی طبقہ اشرافیہ اور میڈیا کے برعکس عالمی میڈیا نے اس ایشو کو فوکس کیا کہ پنجاب نہ صرف یہ کہ طالبان کا مضبوط گڑھ بنتا جا رہا ہے بلکہ اس صوبے میں ان عناصر کے موثر نیٹ ورک بھی موجود ہیں۔ بی بی سی نے ایک نمائندہ کو اس کام کے لیے بطور خاص پنجاب بھیج کر متعدد خصوصی رپورٹس نشر کیں اور دوسرے معتبر ادارے بھی اس کام پر تحقیق کرتے نظر آئے۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق پاکستان میں اس وقت 25 ہزار کے لگ بھگ رجسٹرڈ مدارس ہیں۔ ان مدارس میں سے 13 ہزار پنجاب میں واقع ہیں۔ یہ مدارس محض درس و تدریس تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان میں سے اکثر فرقہ پرست مذہبی گروپوں کے ساتھ کھلے عام وابستگی رکھتے اور ان کے فنڈز سے چلتے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق سولہ سو سے زائد ایسے مدارس سامنے آچکے ہیں جہاں پر طلباء کو جہاد کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے اور حکومت اس تمام صورتحال کو خاموش تماشائی کی طرح دیکھ رہی ہے۔ اس وقت پاکستان میں 42 جہادی اور فرقہ پرست تنظیمیں موجود ہیں۔ ان میں سے اکثریت کی قیادت اور دفاتر پنجاب خصوصاً ملتان' بہاولپور' ڈی جی خان' فیصل آباد اور دوسرے شہروں میں موجود ہیں۔ ماضی میں

دوسروں کے علاوہ القاعدہ اور دوسری جہادی تنظیموں کے لیڈروں اور کارکنوں کی جتنی بھی گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں ان کا مرکز بھی پنجاب کے یہی علاقے تھے۔ اس صورتحال کا بغور جائزہ لیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ پنجابی اشرافیہ یا ان کا ایک بالادست طبقہ اس بات کو ماننے پر تیار ہی نہیں کہ پنجاب میں بھی طالبان قوت پکڑ سکتے ہیں۔ اس وقت عالمی میڈیا اور اداروں میں کوئٹہ کے طالبان شوریٰ کے ساتھ ساتھ پنجابی طالبان کا ذکر بھی تواتر سے سننے اور پڑھنے کو مل رہا ہے۔ تاہم پاکستان کے تجزیہ نگار پنجابی طالبان کو نظرانداز کر کے فاٹا کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اس مہم کا واضح مقصد تو یہی تھا کہ پنجاب اور اس کی قیادت کو عالمی اور علاقائی دباؤ سے بچایا جا سکے اور عالمی سطح پر اس تاثر کو اور بھی پختہ کیا جائے کہ پشتونوں کے علاوہ دوسری کوئی قوم طالبان سے ہمدردی یا وابستگی نہیں رکھتی۔ حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر پشتون بحیثیت قوم طالبان یا انتہاپسندوں کے حامی ہوتے تو وہ گزشتہ الیکشن میں اے این پی اور پی پی پی جیسی روشن خیال اور جمہوریت پسند سیاسی قوتوں کو ووٹ نہ دیتے۔ دوسری طرف پشتونخواہ صوبے کے برعکس پنجاب کے لوگوں نے مسلم لیگ (ن) جیسی اس پارٹی کو ووٹ دے کر اقتدار پر فائز کیا جس نے جہادی اسٹیبلشمنٹ کی کوکھ سے جنم لے کر ہر دور میں جہاد اور افغانستان میں مسلسل مداخلت جیسے ایشوز کو اپنی پالیسی کی بنیاد بنا کر آگے بڑھایا۔

پنجاب میں رجسٹرڈ دینی مدارس کی ضلع وار تعداد

لاہور میں دینی مدارس---1096	خوشاب---218
قصور---413	میانوالی---145
اوکاڑہ---363	ملتان---1118
شیخوپورہ---187	وہاڑی---218
ننکانہ صاحب---116	ساہیوال---308
گوجرانوالہ---320	پاکپتن---271
گجرات---267	لودھراں---294
منڈی بہاؤالدین---196	خانیوال---444
سیالکوٹ---360	بہاولپور---450

حافظ آباد---56	بہاولنگر---366
نارووال---177	رحیم یار خان---809
راولپنڈی---292	ڈیرہ غازی خان---680
چکوال---48	لیہ---148
جہلم---192	مظفر گڑھ---879
اٹک---185	راجن پور---130
فیصل آباد---479	بھکر---247
ٹوبہ ٹیک سنگھ---234	جھنگ---386
سرگودھا---433	

(نوٹ) اگر ان مدارس کے طلباء کی اوسط تعداد 50 بھی ہو تو یہ کل تعداد 60لاکھ سے اوپر بن جاتی ہے۔

حقائق بتاتے ہیں کہ پنجاب ہی کی جہادی شخصیات اس سلسلے کو علمی اور عملی طور پر فاٹا اور افغانستان اور کشمیر تک پھیلانے میں پیش پیش ہیں کیونکہ وہ علمی' فکری اور ابلاغ کے شعبوں میں پشتون یا دوسرے جہادیوں کے مقابلے میں زیادہ متحرک اور فعال تھے۔ اول الذکر تین رہنماؤں نے خوست میں جس جہادی تنظیم کی بنیاد رکھی تھی' بعد میں اس کے متعدد گروپ قائم ہوئے۔ ان گروپوں کے اہلکاروں کو فوٹا' افغانستان اور کشمیر کے علاوہ عراق' سوڈان' مصر' بنگلہ دیش' سری لنکا' چین اور متعدد دوسرے ممالک کے علاوہ یورپ اور امریکہ میں بھی اپنے نظریاتی مخالفین کے خلاف استعمال کیا گیا۔ یہاں ہم ان تنظیموں (قابل ذکر) کا ترتیب وار دوبارہ ذکر کرتے ہیں جو کہ پنجابی شخصیات اور کمانڈروں کی قیادت میں برسرپیکار رہیں۔

1-حزب المجاہدین	2- مسلم جانباز فورس
3- تحریک جہاد	4-البدر
5-حرکت المجاہدین	6-حرکت الجہاد اسلامی
7-جمعیت المجاہدین	8- تحریک المجاہدین

9-البرق مجاہدین
10- مظفر کشمیری گروپ
11- لشکر طیبہ
12- سپاہ صحابہ
13- لشکر جھنگوی
14- جیش محمد

یہ تمام تنظیمیں پاکستان کی مختلف دینی' سیاسی جماعتوں اور گروپوں کے ساتھ منسلک رہی ہیں۔ ان کے ارکان کی تعداد لاکھوں میں بنتی ہے۔ پاکستان نے کشمیر کے بارے میں مشرف کے دور میں اپنی پالیسی تبدیل کر دی تو ان تنظیموں نے فاٹا اور افغانستان کو اپنی سرگرمیوں اور قیام کا مرکز بنا دیا۔ پنجابی طالبان کی اہمیت کو اس حوالے سے نظر انداز کرنا ممکن نہیں کہ بڑے صوبے سے تعلق رکھنے والے یہ لوگ پشتون طالبان کے برعکس نہ صرف یہ کہ بہت زیادہ منظم اور بالغ نظر ہیں بلکہ وہ نظریاتی طور پر بھی انتہائی سنجیدہ رویئے کے حامل ہیں۔ حال ہی میں شائع ہونے والی تحقیقی کتاب ''پنجابی طالبان'' کے مصنف مجاہد حسین نے اعداد وشمار اور حقائق کی بنیاد پر جو نتائج اخذ کیے ہیں ان کے مطابق سرحد اور فاٹا میں مصروف جنگی گروہوں کو سب سے زیادہ افرادی اور مالی قوت پنجاب ہی مہیا کرتا آیا ہے۔ ان کے مطابق مذکورہ علاقوں میں لڑنے والے گروہوں میں پنجاب سے تعلق رکھنے والے انتہا پسندوں کا تناسب 50 فیصد ہے۔ انہوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ان تمام گروپوں کو آئی ایس آئی اور دوسری بااثر قوتوں نے نہ صرف یہ کہ پروان چڑھایا بلکہ ان کو کشمیر میں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے بے انتہا مالی وسائل بھی فراہم کیے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ پنجاب سے تعلق رکھنے والی ایک فرقہ پرست جہادی تنظیم کے پاس نقدی کے علاوہ اربوں کے اثاثے ہیں اور مذکورہ تنظیم آئی ایس آئی کی چھتری کے نیچے رہ کر متعدد بڑی سیاسی جماعتوں سے زیادہ قوت اور اہمیت رکھتی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ وسطی اور جنوبی پنجاب میں جنگجوؤں کی تعداد (رجسٹرڈ) ڈیڑھ لاکھ سے زائد ہے۔ یہ لوگ انتہائی تربیت یافتہ اور کمیٹڈ ہونے کے باعث پشتون طالبان سے زیادہ خطرناک اور بااثر ہیں۔ مجاہد حسین مختلف رپورٹس اور واقعات کی بنیاد پر ثابت کرتے ہیں کہ پاکستان کی مقتدر قوتیں نائن الیون اور ممبئی حملوں کے بعد بھی محض اس جذبے کے باعث پنجابی طالبان کے لیے نرم گوشہ رکھتی ہیں کہ ان کو محفوظ رکھ کر بوقت ضرورت بھارت کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے ایک درجن کے قریب

ان اضلاع کی نشاندہی کی ہے جہاں پر ان لوگوں کے مراکز' کمانڈرز' دفاتر اور جنگجو موجود ہیں۔ وہ یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ القاعدہ اور پنجابی عسکری تنظیموں کے درمیان براہ راست رابطے اور تعلقات کار موجود ہیں اور یہی وجہ ہے کہ القاعدہ کے متعدد ٹاپ لیڈر پنجاب کے مختلف شہروں سے گرفتار کیے جا چکے ہیں۔

دیکھا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ انتہا پسندوں کا اگلا ہدف پنجاب ہی ہوگا کیونکہ اس صوبے میں نہ صرف ان کے فعال نیٹ ورک موجود ہیں بلکہ یہاں پر ریاستی اداروں اور حکمرانوں کے درمیان بھی ان عناصر کے ساتھ نمٹنے کے معاملے پر کوئی ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ پنجاب میں چونکہ یہ گروپ فرقہ ورانہ فسادات اور اختلافات کے حساس ایشو پر بھی اپنی سیاست کرتے آئے ہیں اور بے شمار وارداتیں کر چکے ہیں اس لیے اگر یہاں پر ان قوتوں نے اپنی سرگرمیوں کو وسعت دے دی تو نہ صرف یہ کہ ہزاروں ہلاکتیں واقع ہوں گی بلکہ ناتجربہ کار انتظامیہ کے لیے ان کو اتنے بڑے صوبے میں قابو کرنا بھی ناممکن ہو جائے گا۔

اگر صوبہ پختونخواہ اور فاٹا کو طالبان اور ان کے اتحادی بدترین صورتحال سے دوچار کر سکتے ہیں اور ریاست کو گھٹنے ٹیکنے پر عملاً مجبور کیا گیا ہے تو پنجاب جیسے صوبے میں ان کے لیے اپنے اہداف کا حصول اس حوالے سے بہت آسان ثابت ہوگا کہ وہاں پر نہ تو پشتون علاقوں کی طرح قبائلی معاشرہ موجود ہے اور نہ ہی اس صوبے میں اے این پی جیسی کوئی ایسی قوت ہے جو طالبان کے سامنے بعض کمزوریوں کے باوجود ڈٹ کر کھڑی ہو جائے۔ پنجاب کے پرامن لوگ کسی طرح بھی پشتونوں کی طرح اس مزاحمت کا مظاہرہ نہیں کر پائیں گے جس کی ضرورت ہوگی جبکہ پنجاب میں طالبان کی سرگرمیوں کی صورت میں پختونخواہ اور فاٹا کے مقابلے میں زیادہ تباہی سامنے آنے کا امکان اس لیے بھی زیادہ ہے کہ پشتونوں کے برعکس اس صوبے میں مسالک اور مذاہب کے اختلافات کی بنیاد پر جنگجوؤں کے لیے جہاد سے متعلق دوسرے آپشنز (امکانات) بھی موجود ہیں جبکہ صوبائی اداروں کے پاس ان سے نمٹنے کے لیے وہ تجربہ بھی موجود نہیں جو کہ پختونخواہ یا سندھ کے اداروں کو حاصل ہے۔

سابق وزیر داخلہ آفتاب احمد خان شیر پاؤ نے پنجابی طالبان کے بارے میں رابطے پر بتایا کہ ان کا ظہور کوئی اتفاقیہ بات یا عمل نہیں بلکہ یہ لوگ کئی دہائیوں سے مدارس میں نہ صرف یہ کہ جہاد کا درس دیتے رہے ہیں بلکہ بعض علاقوں میں ان کے تربیتی مراکز بھی موجود تھے جہاں پر طلباء کو باقاعدہ جنگ کی تربیت دی جا رہی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ بنیادی طور پر پنجاب ہی سے جہاد کے علمی اور عملی تصور نے جنم لیا چونکہ فاٹا اور افغانستان میں ان کے لڑنے کے میدان فراہم کیے گئے اس لیے ان عناصر نے موقع سے فائدہ اٹھا کر وہاں کا رخ کیا۔ اب چونکہ یہ سلسلہ پاکستان میں شروع ہوا ہے۔ اس لیے اب یہ قوتیں پاکستان ہی پر توجہ دینے لگی ہیں اور ظاہری بات ہے کہ یہ لوگ پنجاب کے شہروں کو اپنا ٹارگٹ بنانے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

شیر پاؤ کے مطابق پنجاب کے سیاستدان اور دوسری متعلقہ قوتیں اب بھی یہ ماننے کو تیار نہیں کہ اس صوبے میں عسکریت پسند موجود ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ بعض قوتیں ان عناصر کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتی ہیں اور وہ چاہتی ہیں کہ ان عناصر کو ماضی کی طرح ایک بار پھر بوقت ضرورت بھارت کے خلاف استعمال کیا جا سکے۔

پنجابی میڈیا اور اسٹیبلشمنٹ کے یکطرفہ موقف اور تجزیوں کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں جہاد اور فرقہ پرستی کی ابتداء پنجاب ہی سے کی گئی تھی۔ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان میں جس شخصیت نے سب سے پہلے جہادی تعلیم اور تربیت کا سلسلہ شروع کیا ان کا نام مولانا مسعود علوی ہے اور وہ جامعہ خیر المدارس ملتان میں طلباء کو اسی مدرسے کے اندر ہی تربیت دیا کرتے تھے۔ روس' افغانستان میں داخل ہو گیا تو پنجابی زعماء ہی تھے جو کہ اپنے شاگردوں کے قافلے لے کر افغانستان پہنچ گئے۔ ان میں جو نمایاں افراد پیش پیش تھے' ان میں مسعود علوی کے علاوہ مولانا ارشاد احمد' فضل الرحمان خلیل اور قاری سیف اللہ اختر نمایاں تھے۔

اسی گروپ نے خوست میں حرکت الجہاد اسلامی کے نام سے جہادی تنظیم کی بنیاد رکھی اور مولانا مسعود علوی کو اس تنظیم کا سربراہ بنا دیا گیا۔ اسی تنظیم سے بعد میں دوسری تنظیموں حرکت المجاہدین اور جمعیت المجاہدین العالمی نے جنم لے کر اور بچے دینے شروع کر

دیئے۔ انہی لوگوں کے رابطوں پر پاکستانی اور غیر ملکی بڑی تعداد میں افغانستان پہنچنا شروع ہوئے تھے اور ان کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ صوبہ خوست کے ایک مقام ژخور پر ان کی تربیت کے لیے البدروں اور البدرٹو کے نام سے ٹریننگ سنٹر قائم کیے گئے۔

یہی وہ دور تھا جب فلسطینی نژاد جہادی لیڈر عبداللہ عزام نے عالمی اسلامی جہاد کا تصور پیش کر کے اسامہ بن لادن سمیت دوسرے غیر ملکیوں کو اس مقدس جہاد کا حصہ بنایا اور پشاور کے یونیورسٹی ٹاؤن میں دنیا کی سب سے خطرناک عسکری تنظیم القاعدہ کی بنیاد رکھی۔

القاعدہ اور افغانی طالبان کی پاکستان دشمنی

2004-05ء کے بعد جب پاکستانی طالبان، پنجابی، کشمیری جہادی گروپوں اور غیر ملکی عسکری گروہوں نے انفرادی اور اجتماعی سطح پر پاکستانی فورسز، سول اداروں، سیاستدانوں کے علاوہ مسلکی اور فکری مخالفین کے خلاف پرتشدد کارروائیاں تیز کر دیں تو بڑی شدت سے یہ سوال سامنے آیا کہ جو جہادی قوتیں فاٹا میں افغانستان پر قابض امریکی اور اتحادی فورسز کے خلاف جمع ہو کر پاکستانی علاقوں کو بطور بیس کیمپ استعمال کر رہی ہیں آیا وہ پاکستان کے خلاف بھی جنگ لڑنا چاہتی ہیں؟ اس سوال کے ہاں اور ناں کے سلسلے میں مختلف آراء سامنے آتی رہیں لیکن ادھر انتہاپسند کسی مخالفت کی پرواہ کیے بغیر نہ صرف یہ کہ پاکستان کے ریاستی اداروں کو نشانہ بناتے گئے بلکہ ان کے اقدامات میں تیزی بھی آتی گئی۔

یہ تمام قوتیں اس ریاست کو کیوں برباد اور کمزور کرنے پر تلی ہوئی ہیں جس نے نہ صرف ان کی کئی دہائیوں تک آبیاری کی بلکہ امریکہ اور یورپ کی مخالفت مول لے کر بھی ایک ممکنہ حد تک ان کو فاٹا خصوصاً وزیرستان میں محفوظ ماحول بھی فراہم کیا۔ اس سوال کے جواب میں مختلف لوگ مختلف تھیوریاں پیش کرتے رہے۔ سب سے اہم تھیوری طالبان یا ان کے حامیوں کو وہ سمجھنی چاہیے کہ جس کی بنیاد پر وہ اتنی بڑی لڑائی لڑنے میدان میں نکل آئے تھے۔

طالبان اور ان کے حامیوں کا اس ضمن میں موقف ہے کہ وہ ایسا اس لیے کر رہے ہیں کہ پاکستان کے حکمران اور فوجی جرنیل امریکہ کے اتحادی بن کر نہ صرف افغانستان کے

طالبان کے خلاف جاری جنگ میں فریق بن گئے ہیں بلکہ ڈالر لے کر معصوم لوگوں کو مطلوب قرار دے کر ایف بی آئی اور سی آئی اے کے بھی حوالے کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ڈرون حملوں کی سہولتیں فراہم کرنے سمیت پاکستان نے 02-2001ء سے لے کر اب تک امریکیوں کو دوسری بے شمار سہولتیں دی گئی ہیں۔ اس لیے پاکستان کے خلاف کارروائیاں نہ صرف جہاد کے نقطہ نظر سے جائز ہیں بلکہ ضروری بھی ہیں۔ یہ لوگ اپنی پالیسی کے حق میں یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ جو مسلمان عوام اور حکمران کسی اور مسلمان ملک یا کمیونٹی کے خلاف کفار کا ساتھ دیتے ہیں' ان کے خلاف کسی ابہام کے بغیر جنگی کارروائی جائز بلکہ فرض ہو جاتی ہے۔ ان کا یہ بھی نظریہ ہے کہ ایک کافر دشمن کے مقابلے میں اس کے دشمن کافر کی حمایت لی جاسکتی ہے اور اس ضمن میں وہ روس کے خلاف لڑے جانے والے جہاد کی مثال دیتے ہیں جس کے دوران مجاہدین دوسروں کے علاوہ امریکہ سمیت متعدد دیگر کافر ممالک سے امداد اور اسلحہ لے کر جنگ لڑتے رہے تھے۔ چنانچہ اگر اس جہاد کے دوران روس کے حامی مسلمانوں کے خلاف لڑنا جائز تھا تو آج کی موجودہ جنگ میں پاکستان کے ان حکمرانوں اور فورسز کے خلاف جنگ کرنا کیسے جائز نہیں جو کہ امریکہ کے اتحادی بن کر ان کو ہر قسم کی سہولت فراہم کر رہے ہیں۔ عام لوگوں کے خلاف پرتشدد کارروائیوں اور حملوں کے معاملوں پر ان کا موقف ہے کہ یہ لوگ مروجہ سیاسی اور جمہوری نظام کا حصہ بن کر کفار کے حامیوں کو اقتدار میں لانے کا سبب بنتے ہیں جبکہ وہ ظالم اور اسلام دشمن مسلمان حکمرانوں کے خلاف ان ایشوز پر مزاحمت یا احتجاج بھی نہیں کرتے۔ اس لیے ان کو ٹارگٹ بنانا بھی جائز ہے۔

جب ان سے سوال کیا جاتا ہے کہ اگر آپ کے کسی حملے یا دھماکے میں آپ یا جہاد کا کوئی حامی جاں بحق ہو جاتا ہے تو ان کا ردعمل کیا ہوتا ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ وہ جنت میں جائے گا اور اس کے خاندان کو اس کی موت پر خوش ہونا چاہیے۔ پاکستان کے خلاف کارروائیوں کے حق میں طالبان یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ چونکہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا تھا اور یہاں اسلام نافذ نہیں ہوا' اس لیے حکمرانوں کو دباؤ کا شکار بنانے اور ان کو غیر اسلامی اقدامات سے باز رکھنے کے لیے بھی ان کے خلاف تشدد سمیت مزاحمت کا ہر اقدام جائز ہے۔ وہ اس بات پر بھی ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں کہ پاکستان کے ریاستی اداروں نے

کشمیر کے جہاد پر یہ جاننے کے باوجود سودے بازی کر لی ہے کہ اس کاز کے لیے کشمیریوں کے علاوہ پاکستانی جہادیوں نے بھی بے پناہ قربانیاں دی ہیں۔ وہ وزیرستان سمیت قبائلی علاقوں میں فوجی کارروائیوں اور لال مسجد جیسے واقعات کو بھی موجودہ مزاحمت کی ایک وجہ بتاتے ہیں جبکہ پاکستانیوں کو امریکہ کے حوالے کرنے کی پالیسی پر بھی شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔

طالبان کے ان بڑے اور نمایاں دلائل کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان کی اس پالیسی کو ان کے استادوں یعنی افغانی طالبان اور القاعدہ کی تائید بھی حاصل ہے یا نہیں؟ اس اہم سوال کے جواب میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں بی بی سی کے پشاور کے نمائندہ عبدالحئی کاکڑ نے جیو نیوز کے پروگرام ''جرگہ'' میں دعویٰ کیا کہ سول آپریشن کے دوران جب ان کا ملا عمر کے ترجمان ذبیح اللہ مجاہد کے ساتھ رابطہ ہوا تو موصوف نے پاکستانی فورسز کے خلاف طالبان کی کارروائیوں پر سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے یہاں تک کہا کہ پاکستانی طالبان پاگل ہو گئے ہیں۔ اسی پروگرام میں شریک القاعدہ کے ساتھ گہرے مراسم رکھنے والے حافظ محمد طاہر اشرفی نے کہا کہ ان کی معلومات کے مطابق القاعدہ لیڈرز اور افغانان طالبان ایک پالیسی کے تحت پاکستان کے خلاف مقامی طالبان کی کارروائیوں کی حمایت نہیں کر رہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ تین سال قبل اسامہ بن لادن نے ایک پیغام کے ذریعے اپنے ساتھیوں کو پاکستان سے نکل کر دوسرے ممالک میں جانے کی ہدایت کی تھی جو کہ اس جانب اشارہ تھا کہ القاعدہ موجودہ طالبان مزاحمت کا حصہ نہیں بننا چاہتی۔ اشرفی صاحب نے یہ بھی کہا کہ ملا عمر نے سوات مزاحمت کے دوران عبدالقیوم ذاکر نامی شخص کے ہاتھ بیت اللہ محسود اور دوسرے کمانڈروں کے نام باقاعدہ ایک خط بھیجا تھا جس میں ان کو مزاحمت اور لڑائی سے منع کیا تھا بلکہ یہاں تک کہا تھا کہ پاکستانی طالبان اپنا نام تبدیل کر دیں۔ انہوں نے واضح کہا کہ القاعدہ افغانستان میں امریکہ اور نیٹو کے خلاف طالبان کا جنگ میں ساتھ دے رہی ہے تاہم ابھی تک ان کی طرف سے پاکستانی طالبان کے ساتھ اس سطح پر مدد یا عملی شرکت کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔

اس تمام بحث اور دعوؤں کے برعکس ایک طبقہ فکر کا نظریہ یہ بھی ہے کہ القاعدہ اگر

طالبان کو سپورٹ نہیں کر رہی تو فاٹا میں القاعدہ کے کمانڈروں اور اہلکاروں کی موجودگی کے علاوہ کرم ایجنسی اور سوات میں لڑائی کا باقاعدہ حصہ بننے کے عمل اور اطلاعات کو کیونکر نظرانداز کیا جائے۔ اس طبقہ فکر کی دلیل ہے کہ القاعدہ نے جس گلوبل جہاد آئیڈیا کی بنیاد پر ایک انفراسٹرکچر اور نظریاتی ڈھانچہ تشکیل دیا ہے اس کے اندر طالبان سمیت وہ تمام قوتیں القاعدہ کا باقاعدہ حصہ ہیں جو کہ جہادی کاز کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ ان حلقوں کا دعویٰ ہے کہ بیت اللہ محسود سمیت متعدد دوسرے پاکستانی طالبان کمانڈر نہ صرف القاعدہ کے ساتھ رابطے میں رہے بلکہ بعض کو تنظیمی ذمہ داریاں بھی سونپی گئی تھیں۔ اس ضمن میں وہ دوسروں کے علاوہ الیاس کشمیری کی مثال دیتے ہیں جو کہ القاعدہ کا باقاعدہ حصہ تھے یا ہیں۔ ایک اور نقطہ نظر کے خیال میں ایمن الظواہری اور اسامہ بن لادن اس سے قبل جنرل پرویز مشرف کو پاکستان کی پالیسی کے حوالے سے براہ راست دھمکیاں دے چکے ہیں۔ ایسے میں یہ دلیل دینا کہ القاعدہ یا افغانی طالبان پاکستانی مزاحمت کاروں کا ساتھ نہیں دے رہے حقیقتاً کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ بعض مبصرین کا خیال ہے کہ افغان طالبان اس حد تک پاکستان کے بعض اداروں خصوصاً انٹیلی جنس کے ساتھ بہتر تعلقات رکھتے ہیں کہ ان کی مدد سے فاٹا میں اور القاعدہ اور دوسرے جنگجوؤں کو دستیاب ٹھکانے برقرار رکھے تاکہ ان ٹھکانوں یا سہولتوں کو امریکی دباؤ یا حملوں کی صورت میں بطور پناہ گاہ زیر استعمال لایا جائے، تاہم وہ پاکستانی طالبان کی مخالفت یا ناراضگی مول لینے کا رسک بھی نہیں لے سکتے کیونکہ ان کی اصل قوت یہی طالبان اور جہادی ہی ہیں۔

ان بنیادی ایشوز کے علاوہ اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ آیا پاکستانی اداروں میں موجود بعض عناصر پہلے یا اب القاعدہ جیسی عالمگیر تنظیم کے ساتھ کس نوعیت کی ہمدردی رکھتے ہیں کیونکہ بے شمار لوگ اب بھی سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے خفیہ ادارے یا ان کے بعض لوگ القاعدہ کے ساتھ رابطوں میں ہیں۔ یہ الزامات امریکی اور بعض دوسرے اتحادی بھی تواتر کے ساتھ لگاتے آئے ہیں۔ امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے اس کی تقلید میں 29 اکتوبر 2009ء کے دورہ پاکستان کے دوران کھلے عام الزام لگایا کہ القاعدہ کی ٹاپ لیڈرشپ ان کی معلومات کے مطابق پاکستان ہی میں ہے اور یہ وہ اس بات پر یقین کرنے کو

تیار ہی نہیں کہ پاکستانی اداروں کو ان کی موجودگی کا علم نہیں۔ اس سے قبل کوئٹہ شوریٰ کی موجودگی کے حوالے سے بھی ایسے ہی دعوے کیے جاتے رہے۔ اگر واقعی پاکستانی ادارے القاعدہ اور افغانی طالبان کے ساتھ محدود یا مکمل رابطوں میں ہیں تو یہ اس لحاظ سے اور بھی تشویش کی بات بن جاتی ہے کہ پاکستانی طالبان یا ان کے غیر ملکی جنگجو (مصدقہ) پاکستان کی سلامتی کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ اس قسم کی صورتحال اور اطلاعات کا جب تجزیہ کیا جاتا ہے تو نتائج نکالنے کا عمل اور بھی پیچیدہ بن جاتا ہے اور اسی پیچیدگی نے کروڑوں عوام کو موجودہ جنگ کی سمت کے حوالے سے پریشانی سے دوچار کر دیا ہے۔

اس تناظر میں ہم اسامہ بن لادن کے ساتھ متعدد بار ملاقاتیں کرنے اور ان کے انٹرویوز لینے والے پاکستان کے ممتاز صحافی اور تجزیہ نگار حامد میر کے اس بیان کردہ واقعہ کو نظر انداز نہیں کر سکتے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ اسامہ بن لادن آئی ایس آئی کو نہ صرف یہ کہ پسند نہیں کرتے تھے بلکہ انہوں نے جناب حامد میر کو خود کہا تھا کہ ان کی سیکریسی کا سب سے بڑا راز یہ بھی ہے کہ وہ (اسامہ بن لادن) آئی ایس آئی کو اپنے قریب آنے نہیں دیتے تھے۔ حالانکہ یہ ان ادوار کی بات ہے جب اسامہ بن لادن اتنے مطلوب ترین شخص بھی نہیں تھے۔ جناب حامد میر کے مطابق پاکستانی اسٹیبلشمنٹ نے ان کی اطلاعات کے مطابق کبھی اسامہ بن لادن کی کوئی عملی مدد نہیں کی۔ ایک سوال کے جواب میں ان کا کہنا تھا کہ جب 1989ء کو بھارت کا طیارہ قندھار میں اتارا گیا اور پاکستان کے بعض جہادیوں کو ایک ڈیل کے بعد رہائی مل گئی تو اسامہ بن لادن نے ان جہادی لیڈروں کی خواہش کے باوجود ان سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ جناب حامد میر کا دعویٰ تھا کہ مقبول عام رائے کے برعکس افغان طالبان کو نائن الیون کے واقعہ کی بھی مخالفت کرتے پایا گیا تھا۔ اگر حامد میر کے اس تجزیے اور معلومات کا جائزہ لیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ نائن الیون کے واقعہ اور امریکہ کی جانب سے افغانستان پر حملے سے قبل اسامہ بن لادن پڑوسی ملک کے جہادی لیڈروں اور ان کے اقدامات کے حوالے سے بہت محتاط رہا کرتے تھے۔

یہاں سینئر صحافی رحیم اللہ یوسفزئی کی معلومات کو بھی اس تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے جن کا کہنا ہے کہ 1996ء تک اسامہ بن لادن یا القاعدہ کے دوسرے لیڈروں

کے افغان طالبان لیڈرشپ کے ساتھ بھی بہت محدود تعلقات اور رابطے تھے۔ ان کے بقول 12 ستمبر 1996ء کو جب طالبان نے صوبہ ننگرہار کے شہر جلال آباد کو فتح کیا تو طالبان لیڈروں نے سابق گورنر حاجی قدیر کی رہائش گاہ پر منعقدہ ایک اجلاس کے دوران فیصلہ کرتے ہوئے مولانا صادق کی سربراہی میں اسامہ بن لادن کے پاس ایک وفد بھیجا جس کے بعد فریقین کے درمیان ایک نئی انڈرسٹینڈنگ اور مفاہمت عمل میں لائی گئی۔ اگر اس تجزیہ کا اندازہ لگایا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ القاعدہ، افغانی طالبان اور پاکستانی جہادیوں کے درمیان مشترکہ حکمت عملی پر اتفاق رائے کا عمل نائن الیون کے بعد شروع ہوا تھا۔ اگر ایسا ہے تو پھر یہ بات کافی حد تک سمجھ میں آہی جاتی ہے کہ فریقین کے درمیان بعض اختلافات کے باوجود کم از کم اس بات پر اتفاق رائے ہے کہ جب تک امریکہ اور دوسرے اتحادی افغانستان سے نکل نہیں جاتے تب تک امریکہ اور پاکستان سمیت اس کے دوسرے اتحادیوں کو ہر محاذ پر ٹف ٹائم دیا جائے۔

''افغانستان'' نامی کتاب کے مصنف اور معروف صحافی سلیم صافی کے مطابق اسامہ بن لادن کو چونکہ مولوی محمد یونس خالص اور گلبدین حکمت یار کے لوگ (انجینئر محمود، سعدنور، فضل حق مجاہد وغیرہ) آمادہ کر کے افغانستان لائے تھے اس لیے ابتداء میں اسامہ بن لادن نہ صرف یہ کہ طالبان سے بڑی حد تک دور رہے بلکہ وہ طالبان کو امریکہ اور پاکستان کے حامی قرار دے کر شک کی نظر سے بھی دیکھ رہے تھے۔ تاہم فتح جلال آباد کے بعد بھیجے گئے وفد کے علاوہ بعض دوسرے خیرخواہوں کی خواہش پر القاعدہ اور طالبان کے درمیان ایک موثر اتحاد قائم ہوا۔ اور اس اتحاد میں نائن الیون کے بعد اور بھی استحکام آ گیا جو کہ بعد میں دنیا بھر کے جہادیوں کے اتحاد کا بھی سبب بن گیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ پاکستانی طالبان (سواتی کمانڈروں سمیت) نہ صرف القاعدہ کی لیڈرشپ کے ساتھ افغانستان اور کئی دوسرے ممالک میں اس کی قیادت کے نیچے لڑتے رہے ہیں بلکہ عام طالبان بھی تربیت کے دوران ایک طریقہ کار کے مطابق شیخ اسامہ کے ساتھ وابستگی اور وفاداری کا باقاعدہ حلف بھی اٹھایا کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسامہ بن لادن ہی عملی طور پر دنیا بھر کے نظریاتی جہادیوں کے آئیڈیل اور رہبر

ہیں۔ ایسے میں یہ سوال اٹھنا فطری سی بات ہے کہ القاعدہ پاکستانی طالبان کے پاکستان مخالف کارروائیوں سے الگ تھلگ یا لاتعلق کیسے رہ سکتی ہے؟ اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ اگر القاعدہ اور افغانی طالبان کا پاکستانی طالبان پر اعتماد اور ہولڈ نہ ہوتا تو وہ القاعدہ کی سکینڈ ٹاپ لیڈرشپ کو (مصدقہ اطلاعات کے مطابق) اس بیت اللہ محسود کے پاس قیام کرنے کیوں بھیجتے جن کو پاکستان کے متعدد تبصرہ نگار اور ریاستی عہدیدار متعدد مواقع پر اسے امریکہ اور بھارت کا ایجنٹ قرار دے چکے تھے جن کو القاعدہ مسلمانوں کے دشمن قرار دیتی ہے۔ دوسری طرف اگر بیت اللہ محسود، الیاس کشمیری اور ایسے دوسرے پاکستانی کمانڈروں کو القاعدہ سے عقیدت اور وابستگی نہ ہوتی تو وہ پاکستانی فورسز کی کارروائیوں کے علاوہ امریکی ڈرون حملوں کا نشانہ کیوں بنتے؟

ان تمام امکانات اور جائزوں سے بڑی حد تک یہ صورتحال اس تناظر میں واضح ہو جاتی ہے کہ القاعدہ، افغانی طالبان اور پاکستانی طالبان کے درمیان طریقہ کار سے متعلق بعض اختلافات کے باوجود اپنے دشمنوں اور مخالفین سے نمٹنے کے معاملے پر کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ تینوں فریق بعض معاملات پر پاکستان کے لیے شاید کہ نرم گوشہ رکھتے ہوں مگر بنیادی مقاصد اور اہداف کے معاملے میں ان کے درمیان مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ایسے میں یہ کہنا کہ پاکستانی طالبان کو القاعدہ یا افغان طالبان کی حمایت اور مینڈیٹ حاصل نہیں، زیادہ قرین قیاس نہیں لگتا۔

طالبانائزیشن پر سیاسی پارٹیوں کا ابہام

پاکستان اور افغانستان کی حکومتوں اور فورسز کے خلاف جتنی بھی طالبان سمیت جہادی تنظیمیں ایک باقاعدہ جنگ لڑ رہی ہیں' ان میں سے تقریباً ہر ایک جہادی تنظیم کی نہ صرف یہ کہ پاکستان میں بنیاد رکھی گئی بلکہ پاکستان کی مذہبی جماعتوں اور پاکستانی انٹیلی جنس اداروں ہی نے ان تنظیموں کو مالی' تنظیمی' سیاسی اور افرادی قوت مہیا کر کے انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دی۔ اس حقیقت سے کوئی انکار ممکن نہیں کہ ایک منظم منصوبہ بندی اور طریقہ کار کے مطابق پڑوسی ملک اور سیاسی مخالفین کو دباؤ سے دوچار کرنے کے لیے ان تنظیموں کو بنا کر بوقت ضرورت اپنے اپنے ایجنڈے کی تکمیل کے لیے زیراستعمال لایا گیا۔ زیادہ تر تنظیموں کے نام سے ہی دینی یا مذہبی جماعتوں کے ساتھ ان کی وابستگی کو بہت آسانی کے ساتھ ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم ان جہادی تنظیموں کو دینی جماعتوں کی ذیلی یا مسلح شاخوں کا نام دیں تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ حقیقت کا ادراک کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تنظیموں کے قیام کا مقصد اس سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا کہ پاکستانی ریاست کے معتبر حلقوں کے جہادی ایجنڈے کو آگے بڑھاتے ہوئے بھارت' افغانستان اور یہاں تک کہ امریکہ جیسے ممالک کو ان کے ذریعے سیاسی دباؤ میں لایا جائے اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ جو سیاسی قوتیں ملک کے اندر جمہوریت' پارلیمنٹ اور آزاد اور لبرل سوسائٹی کی بات کرتی ہیں' ان تنظیموں کے ذریعے ان کے کردار کو بھی محدود رکھا جائے۔

جتنی بھی مذہبی جماعتیں اس ملک میں سیاست کر رہی ہیں' ان کو پاکستان میں اب

تک ہونے والے تمام انتخابات کے دوران تمام تر وسائل اور دوسرے ذرائع کے ہوتے ہوئے بھی کبھی سات فیصد سے زائد ووٹ نہیں ملے حالانکہ ان جماعتوں کو خفیہ اداروں عالمی جہادی امدادی اداروں اور بعض بااثر گروپوں کی آشیرباد بھی ہر دور میں حاصل رہی۔ اس وقت افغانستان اور پاکستان کے اندر جتنی بھی عسکری تنظیمیں مزاحمت کر رہی ہیں ان میں سے اکثر کی جماعت اسلامی جے یو آئی (متعدد شاخ) تحریک نفاذ فقہ جعفریہ سمیت دوسری دینی جماعتوں کی نہ صرف حمایت حاصل ہے بلکہ ان تنظیموں کو ایسے ہی جماعتوں کی ذیلی شاخیں قرار دینا غلط بیانی نہیں ہوگا۔ پاکستان میں 2002ء خصوصاً 2004ء کے بعد جب پاکستانی قیادت فوجی کمانڈروں اور عوام پر حملوں کا سلسلہ شروع کیا گیا اور اس کے نتیجے میں اب تک ہزاروں افراد کو نہ صرف یہ کہ گولیوں دھماکوں اور خودکش حملوں کے ذریعے مارا گیا بلکہ ظلم کی انتہا کرتے ہوئے فوجی جوانوں اور سیاسی مخالفین کو بے دردی سے ذبح کرنے سے بھی گریز نہیں کیا گیا لیکن اس دوران ایک تلخ حقیقت اور سنگدلی یہ کھل کر سامنے آ گئی کہ مذہبی جماعتوں نے نہ صرف یہ کہ ایسے واقعات کی کھل کر کبھی مذمت نہیں کی بلکہ وہ عملاً طالبان اور دوسری انتہا پسند تنظیموں کے ان اقدامات کے حق میں دلائل دینے کے علاوہ ان کی کھل کر حمایت بھی کرتی رہیں۔ زیادہ تر عسکری قیادت اور ان کے اہلکاروں کی نامزدگیاں ابتدائی ادوار میں دینی جماعتیں ہی کرتی تھیں اور اس مقصد کے لیے ان جماعتوں نے باقاعدہ عسکری ونگز یا شعبے قائم کیے ہوئے تھے۔ ان کی بھرتیوں اور تربیت کے تمام مراحل انٹیلی جنس اداروں کی ناک اور آنکھ کے نیچے ہوا کرتے تھے مگر ادارے نہ صرف خاموش رہے بلکہ وہ ایسے لوگوں کی معاونت بھی کرتے تھے۔ چنانچہ اگر ہم جماعت اسلامی اور جے یو آئی کو ان عسکری تنظیموں کی نرسریاں قرار دیں تو غلط نہیں ہوگا۔ ایک وقت تو وہ تھا جب طالبان کے عروج کے ادوار میں مولانا فضل الرحمان مولانا سمیع الحق اور دوسرے مولویوں کے درمیان باقاعدہ مقابلہ بازی ہوا کرتی تھی۔ صوابی کے پنج پیر مدرسے کے علاوہ صوابی ہی میں ڈاگئی کے مقام پر قائم مدرسے کے مہتمم مولانا حمد اللہ جان سمیت بے شمار علماء اور ان کے ادارے طالبان کا کریڈٹ لینے میں ایک دوسرے سے بازی لینے میں مصروف تھے۔ چونکہ پاکستان میں 60فیصد مدارس دیوبندی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے زیادہ تر جہادی یا طالبان انہی

مدارس کے تربیت یافتہ ہونے کے باعث جے یو آئی کی مختلف شاخوں سے وابستہ رہے۔

پاکستانی حکومتوں اور فورسز کو دیوار سے لگانے والے ٹی ٹی پی کے سربراہ بیت اللہ محسود زمانہ طالب العلمی میں جے یو آئی (ف) کی طلباء تنظیم جے ٹی آئی کے ساتھ ایک متحرک کارکن کے طور پر وابستہ تھے اور کافی متحرک تھے۔ ان کے علاوہ متعدد دوسرے کمانڈروں کی مثالیں بھی دی جا سکتی ہیں۔ جے یو آئی اور جماعت اسلامی سمیت دوسرے مذہبی گروپوں کی قیادت میں سال 2004ء کے انتخابات کے نتیجے میں امریکہ مخالف جذبات اور خفیہ اداروں کی آشیر باد سے صوبہ پختونخواہ میں جو حکومت قائم ہوئی اس نے ریاستی اختیارات سے تجاوز کر کے طالبان کو تمام ممکن سہولتیں اور رعایتیں فراہم کیں۔ اس دور حکومت کے دوران وزیرستان کے طالبان کو ملحقہ اضلاع خصوصاً بنوں، ڈی آئی خان، لکی مروت اور سرائے نورنگ میں آزادانہ طریقے سے تنظیمی طور پر کام کرنے کے بہترین مواقع فراہم کیے گئے۔ اس عرصہ میں ٹانک اور ڈی آئی خان کے سکولوں کی حالت یہ تھی کہ وہاں طالبان کمانڈوز سکولوں میں آ کر خودکش حملوں اور دوسری کارروائیوں کے لیے کم عمر لڑکوں کا باقاعدہ انتخاب کیا کرتے تھے۔ متعدد ایسی مثالیں موجود ہیں کہ جن والدین نے بچے دینے سے انکار کیا' ان کو بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ایم ایم اے کی حکومت میں ان اضلاع میں طالبان گویا ایک طرح سے صوبائی حکومت کے حصہ دار بنے ہوئے تھے۔ قبائلی علاقوں سے تعلق رکھنے والے 70 فیصد ایم این ایز اور سینیٹرز کا تعلق چونکہ جے یو آئی سے تھا اس لیے وہ اسمبلی کے علاوہ مختلف فورمز پر عملاً نہ صرف طالبان کے ترجمانوں کا فریضہ سرانجام دیا کرتے تھے بلکہ وہ اس تمام گیمز میں بطور فریق بھی شریک تھے اور ملاکنڈ ڈویژن میں جماعت اسلامی کا یہی کردار تھا جو کہ جے یو آئی کا جنوبی اضلاع میں تھا۔ ایسی ہی پالیسی ہمیں بلوچستان میں دیکھنے کو ملی جہاں پر صوبائی حکومت میں شامل متعدد وزراء اور ارکان اسمبلی (محمد خان شیرانی کو چھوڑ کر) طالبان کی معاونت کرتے رہے۔

سال 2008ء کے الیکشن کے بعد جب صوبہ سرحد میں اے این پی اور پی پی پی کی حکومت قائم ہوئی اور مرکز میں بھی ان کی مخلوط حکومت بنی تو بے شمار ایسے لوگوں کو مختلف علاقوں سے گرفتار کیا گیا جو کہ کھل کر عسکریت پسندوں کی حمایت کرنے کے علاوہ اس گیم میں

باقاعدہ فریق بنے ہوئے تھے۔ وزارت داخلہ کی ایک دستاویز کے مطابق سال 2008-09ء کے دوران ایسے جتنے افراد کو گرفتار کیا گیا ان کی تعداد 100 سے زائد ہے۔ یہ الگ بات کہ پالیسی تبدیل ہوتی دیکھ کر مذکورہ دونوں جماعتیں گرفتار افراد کے ساتھ اپنی وابستگی سے انکار کرتے پائی گئیں۔ حالانکہ گرفتار شدگان میں سے تو بعض ایسے تھے جن کے القاعدہ کے ساتھ بھی تعلقات تھے۔ یہی وہ صورتحال تھی جس پر دوسروں کے علاوہ چین اور ایران جیسے دوست ممالک نے بھی تشویش کا اظہار کیا اور یکے بعد دیگرے دونوں جماعتوں کے وفود نے بیجنگ اور تہران جا کر ان ممالک کی تشویش دور کرنے کے لیے ایسے افراد سے لاتعلقی کا اظہار کیا۔

کون نہیں جانتا کہ ٹی این ایس ایم کے سربراہ مولانا صوفی محمد اور ان کے متعدد دوسرے ساتھی ماضی میں جماعت اسلامی میں مختلف بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ اس صورتحال کو سمجھنے کے لیے ہمیں ان انتہائی پرتشدد جنگی کمانڈروں کی پروفائل کو دیکھنا پڑے گا جنھوں نے فاٹا' ملاکنڈ اور پنجاب میں حکومت اور فورسز کو اپنی کارروائیوں کے ذریعے چکرا کر رکھ دیا۔ ایک سروے کے مطابق یہ تمام کمانڈوز ماضی میں جماعت اسلامی' جے یو آئی' تحریک اسلامی' تحریک جعفریہ اور دوسری تنظیموں سے وابستہ رہے ہیں۔ یہ لوگ نائن الیون کے بعد جب اپنی اپنی قیادت کو امریکہ کے ساتھ اتحاد کے معاملے پر پاکستان کے خلاف کھل کر میدان میں نکلنے پر آمادہ کرنے کی کوشش میں ناکام ہوگئے تو خود بغاوت کے راستے پر نکل آئے اور انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ رابطے قائم کر کے القاعدہ اور افغانی طالبان کی آئیڈیالوجی کی بنیاد پر پاکستانی ریاست کے خلاف جنگ کی باقاعدہ ابتداء کر لی۔ بیت اللہ محسود اور متعدد دوسرے کمانڈروں کے ساتھ جے یو آئی کی اعلیٰ قیادت کے رابطے ان کی ہلاکتوں تک نہ صرف قائم رہے بلکہ مولانا فضل الرحمان اور ٹاپ لیڈرشپ کے دوسرے لوگوں نے سال 2009ء کے دوران فورسز' حکومت اور بیت اللہ محسود کے درمیان مصالحت اور مذاکرات کی ابتداء کرنے اور کامیابی کے لیے دن رات ایک کر کے زبردست مہم چلائی۔ مولانا فضل الرحمٰن تو بیت اللہ محسود کے حوالے سے اتنے بااختیار اور پرامید تھے کہ انہوں نے پاکستان اور افغانستان کے لیے امریکہ کے خصوصی ایلچی رچرڈ ہالبروک کے ساتھ 2009ء کے

وسط میں کی گئی ایک باضابطہ ملاقات کے دوران ان کو بھی اس قسم کے ایک فارمولے کی پیشکش کی تھی۔ مولانا نے اس ملاقات کے دوران ہالبروک پر واضح کیا تھا کہ اگر امریکہ فاٹا اور افغانستان کے طالبان کے ساتھ معاملات سلجھانا چاہتا ہے تو اس کام کے لیے اے این پی کے بجائے جے یو آئی پر انحصار کر کے ہی نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

جے یو آئی ہی نے قبائلی ممبران اسمبلی اور سینیٹرز کو اسلام آباد میں ان علاقوں کے نمائندوں کے طور پر طالبان کے حامی بنا کر پیش کر کے بعض اہم مقاصد حاصل کیے۔ اس تمام عرصہ کے دوران طالبان یا دوسری جہادی تنظیموں کی جانب سے اس پارٹی کو دباؤ کا شکار بنانے کے لیے اس کے بعض ان لیڈروں کو راستے سے ہٹا کر شہید کر دیا جو کہ اپنی فکر کی بنیاد پر بعض جہادی کارروائیوں خصوصاً خودکش حملوں کی مخالفت کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں پشاور میں شہید کیے گئے مولانا حسن جان کی مثال دی جا سکتی ہے۔ حالانکہ وہ اتنی اہم اور بااثر شخصیت تھے کہ انہوں نے خان عبدالولی خان سے بھی چارسدہ میں قومی اسمبلی کی نشست جیت لی تھی۔ وزیرستان' ملاکنڈ ڈویژن اور بلوچستان کے بعض علاقوں کے علاوہ مہمند' باجوڑ' اورکزئی اور کرم کی قبائلی ایجنسیوں اور کسی حد تک جنوبی پنجاب میں بھی متعدد اہم طالبان لیڈروں یا کمانڈروں کی ان دونوں مذہبی جماعتوں کے ساتھ تنظیمی وابستگی رہی ہے۔

اگر غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا جائے تو جن مذہبی جماعتوں اور گروپوں نے کئی برس قبل دفاع افغانستان کونسل کے نام سے ایک پلیٹ فارم قائم کیا تھا وہ تمام جماعتیں' طالبان اور دوسری اتحادی مزاحمت کار تنظیموں کے ساتھ نہ صرف مکمل تعاون کرتی ہیں بلکہ ان جماعتوں کو ہم ذرا سخت لفظوں میں ان عسکری قوتوں کے پولیٹیکل ونگز کا نام دے سکتے ہیں۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ ان دینی جماعتوں کے علاوہ بعض سیاسی جماعتیں بھی ایسی ہیں جو کہ ریاستی حصہ دار بننے کے بعد طالبان کو اثاثہ قرار دے کر ان کی حوصلہ افزائی اور معاونت کرتی آئی ہیں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو ہی کے دور میں نصیر اللہ بابر کے ذریعے گلبدین حکمت یار' احمد شاہ مسعود اور رسول سیاف سمیت متعدد دوسرے جہادیوں کو پشاور بلا کر نہ صرف باقاعدہ بریفنگز دے کر سردار داؤد کے خلاف جہاد کرنے اور تربیت کی سہولتیں فراہم کرنے پر آمادہ کیا گیا بلکہ اس منصوبے کو عملی جامہ بھی پہنایا گیا اور نصیر اللہ بابر

ابھی تک اپنے اس کارنامے پر فخر کر کے اس کا کریڈٹ کسی اور کو دینے پر آمادہ بھی نظر نہیں آتے۔ حالانکہ اس زمانے میں نہ تو افغانستان میں سوشلسٹ انقلاب آیا تھا نہ روس نے مداخلت کی تھی اور نہ ہی افغان حکومت عملاً کسی منصوبے کی شکل میں پاکستان کے مفادات کے خلاف کسی سازش میں مصروف تھی لیکن تاریخ کا سچ یہ بھی ہے کہ گلبدین حکمت یار نے کابل میں بم دھماکہ کیا تھا جس کے بعد سردار داؤد کو پاکستان آ کر کچھ معاملات کی درستگی کے لیے بھٹو صاحب سے مذاکرات کرنا پڑے تھے۔

بہر حال تاریخ نے خود کو دہراتے ہوئے ذوالفقار علی بھٹو کی روشن خیال صاحبزادی بے نظیر بھٹو کو پاکستان کا وزیراعظم بنایا تو ان ہی کی حکومت کے دوران اسی نصیر اللہ بابر کی قیادت میں 90 کی دہائی میں کوئٹہ اور قندھار کے راستے افغانستان میں طالبان کی شکل میں نئے حکمران داخل کرا دیئے گئے اور اس کارنامے پر بھی بابر صاحب ابھی تک فخر کرتے دکھائی دیئے بلکہ وہ طالبان کو اپنے بچے قرار دیتے رہے۔ دہشت گردی کی حالیہ جاری لہر کے دوران بھی یہ بات قدم قدم پر محسوس کی جاتی رہی ہے کہ پیپلز پارٹی صوبہ سرحد کے وزراء اور اس پارٹی کے لیڈر طالبان کے خلاف اس مخالفت یا مزاحمت کا مظاہرہ نہیں کر رہے جو کہ اب اس پارٹی کی پالیسی کے تناظر میں ہونی چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پارٹی کی سیکنڈ یا تھرڈ لیڈرشپ میں ابھی بھی طالبان سے ہمدردی رکھنے والوں کی سوچ موجود ہے۔ پاکستان کے عوام روزانہ کے حساب سے ٹیلی ویژن چینلز پر سابق بیورو کریٹس، ماہرین اور جرنیلوں، کرنلوں کو اب بھی طالبان کی حمایت کرتے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہی وہ طالبان ہیں جن کے بارے میں پی پی پی کا دعویٰ ہے کہ وہ ان کی لیڈر بے نظیر بھٹو کی شہادت میں ملوث رہے ہیں بلکہ ایک طرح سے طالبان پر قتل کی دعویداری بھی کرتے ہیں۔

عین اسی طرح جب ہم ملک کی دوسری بڑی پارٹی مسلم لیگ (ن) کی پالیسی کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ پارٹی بھی طالبان اور دوسری جہادی تنظیموں کے ساتھ ایک مربوط اور دیرینہ پالیسی کے تحت ہمدردی رکھتی ہے۔ ملک میں دہشت گردی کے واقعات کے بعد اس پارٹی نے کبھی بھی ایک پرامن اور موثر قومی پارٹی کی حیثیت سے وہ ردعمل نہیں دکھایا جس کی توقع کی جاتی رہی ہے یا جس سے کھل کر مخالفت کا تاثر ملتا ہو۔

نواز شریف مجاہدین (افغان) کے ساتھ نہ صرف اپنے دور اقتدار میں بہت محبت، ہمدردی اور وابستگی کا اظہار کرتے تھے بلکہ ان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ ایک فریق کے طور پر کابل میں صبغت اللہ مجددی کی سربراہی میں قائم عبوری حکومت کی تشکیل کے بعد بطور پاکستانی وزیراعظم وہاں گئے تو انہوں نے کابل ایئرپورٹ پر شکرانے کے نوافل ادا کیے۔ طالبان کے برسراقتدار آنے سے قبل نواز شریف دوسروں کے علاوہ اسامہ بن لادن سے بھی قریبی رابطے رکھ کر اظہار عقیدت کر چکے تھے۔ مجموعی طور پر مسلم لیگ (ن) طالبان کے معاملے پر افغانستان تو چھوڑیں پاکستان کے مفادات کے معاملات پر کبھی بھی کھل کر ان کی مخالفت کرتے نہیں پائی گئی اور یہی وجہ ہے کہ طالبان اور ان کے اتحادیوں نے کبھی پرتشدد کارروائیوں یا ٹارگٹیڈ کلنگ کے ذریعے جنگ زدہ علاقوں میں ان پارٹیوں کے لیڈروں یا کارکنوں کو نشانہ نہیں بنایا جو کہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ان پارٹیوں اور عسکری قوتوں کے درمیان اندرون خانہ بہت اچھے تعلقات قائم رہے ہیں اور اب بھی یہی صورتحال ہے۔

پشاور اور اسلام آباد کے کئی صحافی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ 28 اکتوبر کے روز پشاور کے علاقے پیپل منڈی میں جب اس شہر کی تاریخ کے بدترین بم دھماکے کے نتیجے میں 115 سے زائد معصوم شہری، بچے اور بوڑھے شہید کر دیئے گئے تو صحافیوں کو مذہبی لیڈروں کے ٹیلی فون اور موبائل فونز بند مل رہے تھے کیونکہ یہ لوگ اس قسم کے دھماکے کی بھی کھل کر مذمت نہیں کرنا چاہتے تھے جو سیکنڈ لیول لیڈر شپ دستیاب ہوئی، وہ اس دھماکے کی ذمہ داری طالبان کے بجائے امریکہ، بھارت اور افغانستان پر ڈالتی رہی۔ ان میں سے کوئی بھی کھل کر مسلمانوں یا معصوم شہریوں کے خلاف طالبان کی جانب سے خودکش حملوں کو اسلام کے نقطہ نظر سے غلط قرار دینے کی ہمت نہ کر سکا۔

اس طرز عمل سے واضح ہوتا ہے کہ مسلم لیگ (ن) تحریک انصاف اور تمام دینی جماعتیں پاکستان میں جاری دہشت گردی کی بدترین کارروائیوں کو امریکہ کے خلاف مزاحمت سے نتھی کر کے پاکستان کی سلامتی اور استحکام کے حوالے سے کوئی واضح موقف اپنانے کے بجائے بالواسطہ انتہاپسندوں کا ساتھ دینے کی غیر اعلانیہ مگر عملی پالیسی پر گامزن ہیں۔ اس صورتحال کا ایک نتیجہ یہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ جو سیاسی اور مذہبی قوتیں، جہادی اور

عسکری تنظیموں کے قیام اور نشو ونما کو محض انٹیلی جنس اداروں یا فوج کے کھاتے میں ڈال کر خودکو اس عمل سے بری الذمہ قرار دینے میں مصروف ہیں وہ کسی نہ کسی حد تک خفیہ اداروں اور فوج کی یوٹرن پالیسی کے سامنے آنے کے باوجود اپنے طور پر اب بھی جہادی اور عسکری قوتوں کے ساتھ ہمدردی اور معاونت کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں جبکہ وفاقی حکومت کی کمزوری یا مصلحت اندیشی کی یہ بھی حالت ہے کہ پی پی پی کے ساتھ حکومت میں اگر اے این پی اور ایم کیو ایم جیسی طالبان مخالف پارٹیاں بیٹھی ہوئی ہیں تو طالبان کے فکری استادوں اور پشت پناہوں کی پارٹی جے یو آئی بھی اس اتحاد کا ایک اہم حصہ ہے۔

✿ ✿ ✿ ✿

تین سال میں 185 خودکش حملے

خودکش حملے مزاحمتی تحریکوں میں باقاعدہ ہتھیار کے طور پر استعمال ہونے لگے ہیں۔ ان کی ابتداء تو فلسطین سے اسرائیل کے مظالم اور ناجائز قبضہ کے خلاف مزاحمتی جنگ میں ہوئی تھی لیکن اس کی اہمیت اس وقت بھی نمایاں ہوئی جب پچھلی صدی کے آخری عشرہ میں بھارت کے وزیراعظم راجیو گاندھی ایک ایسے ہی خودکش حملہ میں ہلاک ہو گئے تھے جس کی ذمہ داری تامل باغیوں نے قبول کی تھی لیکن یہ حملے اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ عراق پر امریکی قبضہ اور پھر افغانستان میں نیٹو افواج کی آمد کے بعد سامنے آئے۔ ستم ظریفی تو یہ بھی ہے کہ افغانستان میں یہ حملے اتنی تعداد میں نہیں ہوئے جتنے پاکستان میں ہوئے شاید افغانی طالبان کا اس بارے نقطہ نظر مختلف تھا یا پھر ان کے پاس خودکش حملہ آوروں کی وہ کھیپ موجود نہیں تھی جو پاکستانی طالبان کے پاس تھی۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ افغانی طالبان بھی بنیادی طور پر پاکستانی مدرسوں کے طالب علم تھے اور انہیں اس سلسلے میں خام مال بھی یہاں سے ہی فراہم ہوتا تھا جو دونوں ملکوں کے درمیان موجود سرحدوں پر نگرانی میں اضافہ کے باعث کسی حد تک رکاوٹ کا شکار ہو گیا۔ تاہم اس تناظر میں ایک اور اہم بات تو یہ بھی ہے کہ ان علاقوں میں ہی حملہ آوروں کی تیاری، تربیت اور برین واشنگ کے مرکز قائم تھے اور جہاں باقاعدہ اس کا انتظام بھی تھا اور یہاں خودکش حملہ آوروں کے سکواڈ بھی تیار تھے۔ چنانچہ جب اس جنگ کا رخ تبدیل ہوا اور تحریک طالبان کی طرف سے فلسفہ جہاد کی نئی توجیحات و ترجیحات سامنے آئیں اور اس میں پاکستان کی حکومت اور فوج کے کردار کو بھی ''جہاد مخالف''

قرار دے دیا گیا تو پھر ان خودکش حملہ آوروں کو بھی سرکاری ملازمین اور فوجی کیمپوں کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا گیا جس میں جہاد مخالفین اور طالبان تحریک کے فکری مخالفوں کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب عوامی حلقوں اور دینی رہنماؤں نے کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا لیکن اس وقت جب ان خودکش حملہ آوروں کے ذریعے معصوم اور بے گناہ لوگوں کو بھی موت کے گھاٹ اتارنے اور انہیں زندگی سے محروم کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو اس پر تنقید کا سلسلہ بھی تیز ہو گیا جس کی طالبان اپنے طور پر تاویل اور دلیل پیش کرتے رہے جس کا تذکرہ ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دشمن کی مدد کرنے والا بھی دشمن ہے اور اس کے خلاف جہاد جائز ہے۔ جہاں تک عوام کی بات ہے تو عوام ''جمہوریت'' کا ساتھ دے کر ان حکمرانوں کی مضبوطی کا باعث بن رہے ہیں جو دشمن کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔

بہرحال پاکستان کے مختلف شہروں میں افغانستان پر امریکی حملے اور دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کی شمولیت کے فیصلے کے بعد خودکش حملوں، بم دھماکوں اور ٹارگیٹڈ کلنگ، اغوا اور دوسری کارروائیوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو گیا جو کہ ہر پہلے سال کی نسبت دوسرے سال بڑھتا گیا اور سال 2009ء ان کارروائیوں کی شرح کے حساب سے بدترین ثابت ہوا۔ اعداد و شمار کے مطابق خودکش حملوں کا سلسلہ 17 مارچ 2002ء کو اسلام آباد کے ایک چرچ پر حملے سے شروع ہوا جس میں پانچ افراد جاں بحق اور 40 زخمی ہوئے۔ اس برس کے دوران جتنی بھی کارروائیاں کی گئیں وہ غیر ملکی باشندوں، غیر ملکی اداروں اور مسیحی برادری کے لوگوں تک محدود رہیں۔ 5 اگست 2002ء کو کراچی میں فرانسیسی کمپنی کو خودکش حملے کا نشانہ بنا کر 14 افراد کو ہلاک کر دیا گیا۔ 8 مئی کو مری میں چرچ کو نشانہ بنا کر چھ افراد کو ہلاک جبکہ 14 جون کو کراچی میں امریکی قونصلیٹ کو ٹارگٹ کر کے 12 افراد کو ہلاک کر دیا گیا۔ اس سال کا سب سے آخری اور قابل ذکر خودکش حملہ ٹیکسلا کے ایک چرچ پر 8 ستمبر کو کیا گیا جس میں متعدد افراد زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ 2002ء سے لے کر 2006ء تک کے دوران کیے جانے والے زیادہ تر حملے غیر ملکیوں، چرچوں، غیر ملکی اداروں، امام بارگاہوں اور سیاسی، مذہبی فرقوں کے خلاف کیے گئے۔ تاہم 2006ء کے بعد کیے گئے حملوں کے دوران

سرکاری اہلکاروں' سکیورٹی فورسز اور سیاسی مخالفین کو خصوصی طور پر ہدف بنایا گیا۔ 2006ء سے لے کر 2009ء تک کے عرصہ کے دوران ایک محتاط اندازے کے مطابق 120 سے زائد بار پولیس' ایف سی اور آرمی کے دستوں کو نشانہ بنایا گیا۔ بعض اعداد و شمار کے مطابق چھوٹے بڑے حملوں کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے۔ ان 120 حملوں میں 70 خودکش حملے بھی شامل ہیں۔ (وہ حملے جو کہ صرف فورسز کے خلاف کیے گئے)

یاد رہے کہ 2002ء سے لے کر 2008ء کے دوران سب سے زیادہ حملے پشاور' سوات اور اسلام آباد میں کیے گئے۔ ایک معتبر ادارے کے سروے کے مطابق 2008ء تک 32 بار پشاور کو نشانہ بنایا گیا۔ 28 بار اسلام آباد حملوں کا ہدف رہا۔ 18 حملے کراچی میں کیے گئے۔ 8 بار کوئٹہ ان حملوں کا نشانہ بنا۔ 9 بار ڈیرہ اسماعیل خان کو ہدف بنایا گیا۔ 11 بار لاہور اور مضافاتی شہر ان حملوں کا نشانہ بنے جبکہ 18 بار راولپنڈی کو ہدف بنایا گیا۔ اس عرصہ کے دوران جن دوسرے شہروں کو بطور خاص ٹارگٹ کیا گیا ان میں مری' ٹیکسلا' سیالکوٹ' فتح جنگ' ہنگو' میران شاہ' درہ آدم خیل' ملاکنڈ' ٹانک' چارسدہ' مردان' کوہاٹ' لسبیلہ' سرگودھا' بنوں' شانگلہ' ہری پور' نوشہرہ' بہاولنگر' اٹک' پاڑا چنار' واہ کینٹ' لکی مروت' بھکر' اورکزئی' شبقدر' جمرود' بونیر' جھنگ' میانوالی' ڈی جی خان' دیر' چکوال اور کئی دوسرے شہر شامل ہیں۔ اگر ان شہروں کی تعداد کے تناظر میں دیکھا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ وفاقی دارالحکومت اسلام آباد اور چاروں صوبائی دارالحکومتوں سمیت پاکستان کے 40 کے قریب شہروں کو خودکش حملوں اور بم دھماکوں کا نشانہ بنایا جا چکا ہے۔

اعداد و شمار کے مطابق ان حملوں کے نتیجے میں ان چند برسوں کے دوران 8000 سے زائد شہری اور 2700 سے زائد فوجی' پولیس اور ایف سی اہلکار شہید کر دیئے گئے۔ ان حملوں کے نتیجے میں جن اداروں کے افراد کو نشانہ بنایا گیا ان میں سربراہ مملکت' کور کمانڈرز سمیت اعلیٰ فوجی حکام' بے نظیر' اسفند یار' آفتاب شیر پاؤ اور متعدد دوسروں سمیت کئی سیاستدان' حکومتی وزراء' غیر ملکی سفیر' مختلف مسالک سے تعلق رکھنے والے علماء' عوامی نمائندے' قبائلی عمائدین' غیر ملکی اداروں کے سربراہان یا نمائندے اور سکیورٹی سے متعلق تقریباً تمام اداروں کے اعلیٰ افسران اور اہلکار شامل ہیں۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ حملہ آوروں نے

کسی بھی شعبے یا ادارے سے تعلق رکھنے والے افراد کو نہیں چھوڑا جبکہ سب سے زیادہ حملے ایف سی اور پولیس کے خلاف کیے گئے جبکہ پاکستان آرمی تیسرے نمبر پر رہی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حملہ آوروں نے اہم شخصیات کے علاوہ سکیورٹی سے متعلق ریاست کے ان اداروں کو بطور خاص نشانہ بنایا گویا دوسرے لفظوں میں ان اداروں کے خلاف ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت جنگ لڑی۔

افسوسناک امر یہ ہے کہ ان حملوں کے دوران دینی اداروں یعنی مساجد' امام بارگاہوں' چرچز اور مدارس کو بھی بطور خاص نشانہ بنایا جبکہ روایتی قومی جرگوں پر بھی 10 سے زائد حملے کیے گئے۔ غیر ملکی سفارتخانے' قونصلیٹ' بڑے ہوٹلز اور سفارتی مشنز کو بھی بطور خاص نشانہ بنایا البتہ حملوں کے دوران مسلکی مخالفین کو بھی ہدف بنایا گیا۔ یہ واقعات زیادہ پنجاب کے مختلف علاقوں میں ہوئے۔

سال 2008ء میں خودکش حملوں اور بم دھماکوں میں یکدم بے حد اضافہ ہو گیا جبکہ سال 2009ء کے دوران اس سلسلے نے خطرے اور خدشے کی تمام حدود پار کر کے ملک کی سلامتی کو تشویشناک صورتحال سے دوچار کر کے رکھ دیا۔ ایک مستند سروے سے معلوم ہوتا ہے کہ سال 2007ء کے دوران پاکستان میں دہشت گردی کی دوسری کارروائیوں کے علاوہ 56 خودکش حملے کیے گئے۔ ان حملوں کے نتیجے میں جس شہر یا صوبے کو زیادہ ٹارگٹ کیا گیا وہ پشاور اور صوبہ پختونخواہ ہے۔ سال 2008ء کے دوران پاکستان میں 59 خودکش حملے کیے گئے۔ سوات آپریشن کے بعد سال 2009ء کے دوران ابتدائی دس مہینوں میں 70 خودکش حملے کیے گئے۔ ان حملوں کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ان حملوں میں سے 50 حملے پشاور اور پختونخواہ کے دوسرے شہروں اور علاقوں میں کیے گئے۔ نومبر 2009ء تک خودکش حملوں کی ترتیب کچھ اس طرح ہے۔ صوبہ پختونخواہ 52، اسلام آباد 8، لاہور اور دوسرے شہر 8، فاٹا 4 اور بلوچستان 2 جبکہ ان تمام اعداد وشمار میں ملاکنڈ ڈویژن خصوصاً ضلع سوات میں فوجی آپریشن سے قبل اور اس کے بعد کے عرصہ کے دوران فورسز اور عوام کے خلاف خودکش اور بم دھماکوں سمیت کی گئی دوسری کارروائیوں کی تفصیل نہیں ہے۔

سال 2008ء کے دوران صوبہ سرحد بدامنی اور دہشت گردی کی جس لہر کا شکار ہو

گیا تھا وہ سلسلہ 2009ء میں اور بھی بڑھ گیا۔ یہاں پر 2008ء کے دوران کیے گئے حملوں اور دھماکوں کا مختصر تجزیہ بھی شامل کرتے ہیں۔ اس برس صوبہ سرحد میں 9 دہشت گرد حملے کیے گئے۔ ان میں 32 خودکش حملے بھی شامل تھے۔ ان حملوں کے نتیجے میں فورسز کے 30 افراد شہید ہوئے جبکہ 120 سے زائد زخمی ہوگئے۔ سال 2007ء کے مقابلے میں 2008ء کو اور اس کے بعد 2009ء کے دوران بالترتیب حملوں کی شرح میں اضافہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ سال 2008ء کے دوران اگر فاٹا میں کی گئی کارروائیوں کا جائزہ لیا جائے تو وہ کچھ اس طرح بنتا ہے۔ 2008ء میں ان علاقوں میں 385 حملے کیے گئے جس کے باعث 620 لوگ جان بحق اور 1000 کے قریب زخمی ہوگئے۔ ان میں عام لوگوں کی تعداد 500 رہی۔ مرنے والوں میں 25 فوجی جوان، 57 ایف سی جوان جبکہ دوسری فورسز کے 50 سے زائد لوگ شامل تھے۔ PIPS کی ایک رپورٹ کے مطابق سال 2005ء میں کل حملوں کی تعداد (پاکستان میں) 254 تھی جس کے نتیجے میں 216 افراد جاں بحق جبکہ 571 زخمی ہوئے۔ 2006ء میں یہ تعداد 675 ہوگئی جس کے باعث 907 افراد جاں بحق اور 1500 زخمی ہوگئے۔ سال 2007ء میں یہ تعداد 1,503 ہوگئی۔ مرنے والوں کی تعداد 3,448 بن گئی جبکہ 5,353 زخمی ہوئے۔ سال 2008ء میں کیے گئے حملوں کی تعداد 2577 ہوگئی جس کے نتیجے میں 7997 افراد زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے اور 9,670 زخمی ہوگئے۔ اگر اس تعداد کو دیکھا جائے تو ان چند برسوں کے دوران جاں بحق ہونے والوں کی تعداد 20 ہزار سے زائد ہو جاتی ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ سرکاری حکام لاعلمی کے باعث دہشت گردوں کے ہاتھوں مرنے والوں کی تعداد اکثر مواقع پر 3000 کہتے سنے جاتے ہیں۔ لوگوں کی اتنی ہلاکتوں کے باوجود جہاد کے حامی امریکہ کی مخالفت کی آڑ میں ڈرون حملوں کے نتیجے میں جاں بحق ہونے والوں کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں۔ حالانکہ 2008ء کے دوران ڈرون حملوں کے باعث جاں بحق ہونے والوں کی تعداد (عام لوگ) 84 رپورٹ کی گئی تھی جبکہ انتہا پسندوں کی ہلاکت کی تعداد 216 بتائی گئی۔ اگر انتہا پسندوں کو بھی معصوم قرار دیا جائے تو بھی یہ تعداد 300 کا ہندسہ عبور نہیں کرتا۔ حالانکہ سال 2008ء کے دوران سب سے زیادہ ڈرون حملے کیے گئے تھے۔

اسی رپورٹ میں دوسرے علاقوں میں کیے گئے حملوں اور اس میں مرنے والوں کی تعداد کچھ یوں ہے:

	صوبہ	کل حملے	ہلاکتیں	زخمی
1	صوبہ بلوچستان	696	295	807
2	صوبہ پنجاب	35	219	621
3	آزاد کشمیر	4	3	10

ان اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ دہشت گردی کے دوران جن علاقوں کو بطور ٹارگٹ کیا گیا ان میں صوبہ سرحد اور فاٹا سرفہرست تھے۔ سال 2009ء کے دوران ان علاقوں خصوصاً صوبہ سرحد کے دارالحکومت پشاور کو مین ٹارگٹ کے طور پر نشانہ بنایا گیا۔ تاہم ملک کے دوسرے شہر خصوصاً اسلام آباد اور لاہور کو بھی متعدد بار حملوں کا نشانہ بنایا گیا۔ ان اعداد و شمار کا تناسب اگر افغانستان سے کیا جائے کہ جہاں پر مذہبی جہادی لیڈروں کے بقول واقعی اسلامی جہاد ہو رہا ہے تو وہاں خودکش حملوں اور مرنے والوں کی تعداد (فورسز، شہری) پاکستان کے مقابلے میں نہ صرف کم پائی جاتی ہے بلکہ حملوں کی شرح بھی بہت کم ریکارڈ کی گئی۔

اگر ہم مختلف سالوں کے دوران خودکش اور بم حملوں کا موازنہ کرتے ہیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ پچھلے برسوں کے دوران سال 2009ء کو ان واقعات میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ دوسرے مہینوں کی بجائے جب ہم مختصراً 2009ء کے صرف ایک مہینے یعنی اکتوبر کے حملوں کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کی تفصیل کچھ یوں بنتی ہے۔ (ان حملوں میں شدت بیت اللہ محسود کی ہلاکت کے بعد لائی گئی)

5اکتوبر	ورلڈفوڈ پروگرام دفتر اسلام آباد	5افراد جاں بحق
9اکتوبر	خیبر بازار پشاور	52افراد جاں بحق
10اکتوبر	جی ایچ کیو راولپنڈی	20افراد جاں بحق
12اکتوبر	ضلع شانگلہ (فوجی قافلے پر حملہ)	45افراد جاں بحق
15اکتوبر	لاہور کے تین مختلف مقامات	8افراد جاں بحق
15اکتوبر	کوہاٹ، ہنگو، پشاور	40افراد جاں بحق

16اکتوبر	پولیس تفتیشی مرکز پشاور	10افراد جاں بحق
20اکتوبر	اسلام یونیورسٹی اسلام آباد	6افراد جاں بحق
22اکتوبر	بریگیڈیئر کی گاڑی پر حملہ اسلام آباد	2افراد جاں بحق
23اکتوبر	کامرہ چیک پوسٹ پر حملہ	8افراد جاں بحق
28اکتوبر	سانحہ پشاور (چیپل منڈی)	120افراد جاں بحق

اکتوبر کے ان انسانیت سوز واقعات کا سلسلہ نومبر میں بھی جاری رہا لیکن اس میں اتنی شدت واقع ہوگئی کہ نومبر کے دوران پشاور میں مسلسل چھ روز تک چھ دھماکوں نے اس شہر کے علاوہ پورے ملک کو بدترین نفسیاتی دباؤ کا شکار بنا دیا اور ریاستی ادارے ایک طرح سے ہل کر رہ گئے۔ حفاظتی انتظامات کے نام پر پورا شہر خصوصاً پشاور اور اسلام آباد اس طرح سیل کر دیئے گئے کہ لوگوں کے لیے نقل وحرکت کرنا بھی ایک مشکل کام بن گیا۔ ریاستی سکیورٹی ادارے کس قدر خوفزدہ ہو گئے تھے' اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف پشاور کینٹ میں 18 چیک پوسٹیں قائم کی گئیں۔

✿ ✿ ✿ ✿

پس پردہ جہادی قوتیں

افغانستان میں روسی مداخلت کے بعد جب دنیا بھر کی جہادی اور روس مخالف قوتیں افغان سرزمین پر روس کے خلاف مزاحمت کی حکمت عملی طے کرنے پاکستان کی سرزمین خصوصاً پشاور میں جمع ہونا شروع ہوئیں تو ان میں اکثریت عربوں کی تھی عبدالرب سیاف (افغان لیڈر) ہی وہ شخص تھے جنہوں نے سعودی عرب سمیت عرب دنیا کے دورے کر کے مسلمان آبادی خصوصاً صاحب ثروت اور صاحب الرائے لوگوں کو افغانستان کی مدد کرنے اور جہاد میں معاونت کرنے پر راغب کیا۔ مولوی یونس خالص اور بعض دوسرے افغان لیڈر بھی اس کام میں پیش پیش رہے۔ انہی کی کوششوں سے ہزاروں کی تعداد میں عرب پشاور پہنچ کر افغانستان منتقل ہونا شروع ہوگئے جہاں پر ان کے لیے سرحدی صوبوں میں باقاعدہ تربیتی مراکز قائم کیے گئے۔ اس مشن میں جن شخصیات نے عملاً بڑا کردار ادا کیا ان میں فلسطینی نژاد ڈاکٹر عبداللہ عزام اور ان کے چند دوسرے ساتھی سرفہرست ہیں۔ ان لوگوں نے سال 1980-81ء کے دوران عالمی مسلمان تنظیموں کے ساتھ رابطے کیے تو سال 1982-83ء کے دوران افغان جہاد میں عربوں اور دوسرے غیر ملکیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ابتداء میں ان لوگوں کو عبدالرب سیاف کے ایک کیمپ میں تربیت کے لیے بھیجا گیا جو کہ انہوں نے علی خیل پکتیا میں قائم کیا تھا۔ امن اور انتہاپسندی کے موضوعات پر تحقیق کرنے والے معتبر ادارے پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز (PIPS) کی ایک سٹڈی کے دوران کرنل ریٹائرڈ نذیر سلطان نے بتایا کہ ابتداء میں عربوں کی تعداد دوسو سے لے کر تین سو تھی جو کہ بعد میں 4000 تک پہنچ گئی۔ یہ تعداد اتنی کم تھی کہ اس پر ابتداء میں سی آئی اے یا آئی ایس آئی نے

مستقبل میں کوئی بڑا مسئلہ پیدا کرنے کے خدشے یا گنجائش پر غور ہی نہیں کیا۔

افغان جہاد کو عربوں کی طرف سے جہاں افرادی اور فکری قوت مہیا کی جاتی رہی وہاں عربوں نے اس جہاد کی کامیابی کے لیے بے پناہ مالی وسائل بھی فراہم کیے۔ ایک مستند رپورٹ کے مطابق جو خیراتی اور فلاحی ادارے (عرب) اس جہاد کو فنڈز فراہم کر رہے تھے ان کی رجسٹرڈ تعداد 18 سے 30 کے درمیان تھی۔

پاکستان کے ایک خفیہ ادارے کے مطابق افغانستان میں عربوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی تھی۔ یہ تعداد وقت کے ساتھ بڑھتی گئی جبکہ مجاہدین کے عروج اور طالبان کے ابتدائی ادوار میں اس تعداد میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ تحقیقی کتاب ''افغان جہاد میں عربوں کا کردار'' میں شامل پاکستانی ادارے کی جانب سے بیان کردہ اعداد و شمار کے مطابق مختلف عرب ممالک کے جہادیوں کی تعداد کچھ اس ترتیب سے تھی۔

سعودی عرب	5,000
یمن	3,000
مصری	2,000
الجیریا	2,800
تیونس	400
عراق	370
لیبیا	200

اس سے واضح ہوا کہ عرب مجاہدین کی ابتدائی تعداد 13 ہزار سے زائد تھی لیکن اگر اس میں سوڈان اور بعض دوسرے ممالک کے مجاہدین کی تعداد بھی شامل کی جائے تو یہ 20,000 سے تجاوز کر جاتی ہے۔ جن دوسرے ممالک کے باشندوں نے افغانستان آ کر اس جنگ میں حصہ لیا۔ ان میں ترکی، شام، فلسطین، لبنان، چین، بنگلہ دیش، فلپائن، مراکش، بوسنیا، جنوبی افریقہ، ناروے اور متعدد دوسرے ملک شامل تھے۔

ان عربوں کے لیے باقاعدہ طور پر اسامہ بن لادن ہی نے 1986ء کو صوبہ خوست کے علاقے شوال میں ایک الگ کیمپ قائم کیا۔ انہوں نے 87-1986ء کو اس کیمپ کا

باقاعدہ دورہ کیا اور تربیت کے مراحل کا بذات خود مشاہدہ بھی کیا۔ اس کے بعد افغانستان کے مختلف مقامات پر عربوں اور دوسرے غیر ملکی مجاہدین کے لیے جو تربیتی کیمپ قائم کیے گئے ان کی تعداد کم از کم پندرہ بتائی جاتی ہے۔ ان کیمپوں کے نام یہ ہیں۔ 1-الانصار کیمپ (پکتیا) 2-المسادہ کیمپ (خوست) 3-الفاروق کیمپ (قندھار) 4-الصادق کیمپ (خوست) دارنتا کمپلیکس 5-خالدین کیمپ (پکتیا) 6-الجہاد کیمپ (خوست) 7-البدر ٹو کیمپ (خوست) 8-اکبر شاہ ظہور کیمپ (پکتیا) 9- لیظئی (Leezhah) کیمپ (خوست) 10-مرکز عبدالرحمان فاروقی (پکتیا) الثناء کیمپ (کنڑ) 11-ابوجندل کیمپ (خوست) 12-البدرون (جلال آباد) 13-تورابورا کمپاؤنڈ (ننگرہار) 14-سلمان فارسی کیمپ (ننگرہار) 15-خالد بن ولید کیمپ۔

ان کیمپوں میں سے بہت سے ایسے تھے جن کو ابتدائی طور پر جلال الدین حقانی' فضل الرحمان خلیل' عبدالرب سیاف اور گلبدین حکمت یار کی جہادی تنظیموں نے قائم کیا۔ تاہم جب اسامہ بن لادن نے عربوں اور دوسرے تمام جہادیوں کے لیے تربیتی مراکز اور قیام گاہوں کے ایک بڑے منصوبے کا فیصلہ کیا تو ان کیمپوں میں سے اکثر کو عربوں ہی نے یا تو اپنی تحویل میں لے لیا یا انہوں نے وہاں پر اپنے کمپلیکس قائم کر دیئے۔ اس تمام عرصہ کے دوران روسیوں کے خلاف جتنی بھی لڑائیاں لڑی گئیں عرب اور دوسرے غیر ملکی اپنی الگ شناخت اور تنظیمی طریقہ کار کے مطابق ان میں حصہ لیتے رہے۔ اگر ان کے الگ کیمپس اور گروپس کی جہادی تشکیل کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ 87-1985ء کے دوران ہی سے اسامہ بن لادن اور دوسرے لیڈروں نے ذہنی طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس خطے خصوصاً پاکستان اور افغانستان کی سرحدوں پر واقع علاقے میں نہ صرف یہ کہ اپنا ایک منظم نیٹ ورک بنائیں گے بلکہ عرب اور دوسرے غیر ملکی جنگجو اپنی شناخت بھی قائم رکھیں گے۔ اگر ان کیمپوں کے علاقائی یا جغرافیائی تربیت کا جائزہ لیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ القاعدہ کی ٹاپ لیڈر شپ نے 80ء کی دہائی ہی کے دوران فاٹا کو مستقبل کے لائحہ عمل کے حوالے سے ایک اہم علاقے کے طور پر اپنی نظر میں رکھ لیا تھا۔ ان کی اس تربیت سے یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں کہ القاعدہ کی افغان جہاد میں شرکت محض افغانیوں کی معاونت یا مدد کرنے کے جذبے تک محدود نہیں تھی بلکہ یہ تنظیم ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پاکستانی سرحد کے اس

طرف واقع قریبی افغان علاقوں کا مستقبل کی حکمت عملی کے حوالے سے انتخاب کرچکی تھی اور طالبان کے زوال کے بعد یہ حکمت عملی غیر ملکیوں کے بہت آسانی کے ساتھ قبائلی علاقوں میں منتقل ہونے کی صورت میں کھل کر سامنے آ گئی۔ خوست ہی کو القاعدہ نے اپنے مرکزی مرکز کے طور پر بہت فعال رکھا اور یہی وجہ ہے کہ نواز شریف دور حکومت میں امریکہ نے خوست ہی کے ایک ٹرمینل میں اسامہ بن لادن کی موجودگی کی اطلاعات پر میزائلوں کا نشانہ بنانے کی کوشش کی' تاہم اسامہ اس کیمپ کو کچھ ہی لمحے قبل چھوڑ کر جانے کے باعث محفوظ رہے۔

عربی جہادی قوتوں اور تنظیموں نے نہ صرف یہ کہ القاعدہ کی نظریاتی اور تنظیمی ڈھانچے اور بالادستی کو اس خطے میں قائم کر دیا بلکہ ٹاپ القاعدہ لیڈرشپ نے اس سلسلے کو متعدد دوسرے ممالک خصوصاً ایشیائی ریاستوں میں بھی بہت منظم طریقے سے پھیلا دیا۔ دوسری طرف سعودی عرب کے وہابی مکتبہ فکر نے ایک مربوط پالیسی کے تحت ان تنظیموں کے ساتھ ریاستی طور پر بھی ممکنہ حد تک غیر اعلانیہ روابط رکھ کر ان کی بھرپور معاونت کا سلسلہ جاری رکھا جو کہ افغانستان اور پاکستان سمیت دوسرے ممالک میں وہابی ازم کی حامی تھیں۔ اس ضمن میں یہاں ہم ان پاکستانی اور افغانی تنظیموں کا ذکر شامل کر دیتے ہیں جن کو سعودی عرب نے وہاں سرگرمیوں کی کھلی اجازت دے رکھی تھی۔

پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز اس ضمن میں ان جہادی تنظیموں کے نام اپنی ایک سٹڈی میں شامل کیے ہیں جو کہ سعودی عرب میں اپنا سیٹ اپ رکھتے ہیں۔ ایسی تنظیموں کی تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق 10 سے زائد ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں برما اور بنگلہ دیش کی دو تنظیمیں بھی شامل ہیں۔

1- حزب اسلامی افغانستان
2- حرکت انقلاب اسلامی افغانستان
3- اتحاد اسلامی افغانستان
4- حرکت الجہاد اسلامی پاکستان
5- حرکت المجاہدین (پاکستان + افغانستان)
6- لشکر طیبہ

7- البدر مجاہدین

8- حرکت الجہاد اسلامی برما

9- جماعت اسلامی بنگلہ دیش + بھارت

حزب اور حرکت کے 11 حصوں کی حامل جہادی تنظیموں کی بیک وقت افغانستان، پاکستان، برما اور بھارت میں موجودگی سے یہ اندازہ لگانا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ ان تنظیموں کو جہاد کے معاملے پر ان کی آپس کی وابستگی یا ہم آہنگی کے حوالے سے ایک پورے نیٹ ورک کا نام دیا جا سکتا ہے۔ بعض رپورٹس کے مطابق یہ تمام تنظیمیں یا ان کی اکثریت نہ صرف یہ کہ مختلف ممالک میں ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے رابطوں میں رہتی ہیں بلکہ نائن الیون کے بعد یہ تمام قوتیں القاعدہ کی چھتری کے نیچے بڑے اہداف حاصل کرنے کے لیے مشترکہ جدوجہد اور کارروائیاں بھی کرتی ہیں۔ بعض حلقوں کے مطابق متعدد دوسرے ایشیائی ممالک میں بھی ان کی شاخیں موجود ہیں۔

افغانستان سے سوویت یونین کی واپسی کے بعد عربوں سمیت دوسری غیر ملکی تنظیموں نے پاکستان خصوصاً فاٹا اور صوبہ پختونخواہ کو فوکس کرنا شروع کر دیا۔ اس کام میں ان کو کوئی مشکل اس لیے پیش نہیں آئی کہ اسی علاقے ہی سے ان قوتوں نے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا تھا اور پشاور یا فاٹا کے علاقوں میں ان کا نہ صرف یہ کہ انفراسٹرکچر موجود تھا بلکہ یہاں پر ان کے ہمدردوں اور فکری حامیوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ جولائی 1993ء میں قانون نافذ کرنے والے اداروں نے مختلف کارروائیاں کرتے ہوئے پشاور سے سینکڑوں کی تعداد میں غیر ملکی خصوصاً عرب گرفتار کر لیے۔ ان سے متعلق شکایات تھیں کہ وہ مشکوک سرگرمیوں اور غیر قانونی حرکتوں میں ملوث ہیں۔ خفیہ اداروں کی ہدایت پر ان میں سے اکثر کو چھوڑ دیا گیا۔ ان میں سے صرف 38 ان افراد کو تحویل میں رکھا گیا جو کہ اپنے اپنے ممالک میں دہشت گردی سمیت دوسری سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے بعد اپنی حکومتوں کو مطلوب تھے۔

ورلڈ جورسٹ کونسل کی ایک رپورٹ کے مطابق جون 1993ء میں مڈل ایسٹ اور افریقہ کے بعض ممالک سے چھ ہزار ایک سو مجاہدین اور امدادی کارکن پاکستان پہنچ گئے تھے۔ ان میں اکثریت مصریوں کی تھی جن کی تعداد 1,142 تھی۔ دوسرے ممالک کے باشندوں کی

تفصیل کچھ اس طرح تھی۔ سعودی عرب 981، یمن 946، الجیریا 792، جارڈن 771، عراق 326، شام 292، سوڈان 232، لیبیا 199، تیونس 47، مراکش 102، فلسطین 70، قطر 90، کویت 60، بحرین 35 اور اومان 11۔ اگر ہم اس تعداد (آن ریکارڈ) کا موازنہ 80ء کی دہائی کے 20 ہزار غیر ملکی باشندوں سے کرتے ہیں جو کہ پاکستان آئے تھے تو یہ تعداد 30 ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔ آف دی ریکارڈ پہنچنے والے غیر ملکیوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ بتائی جاتی ہے۔ ان میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو کہ اپنے اپنے ممالک میں اپنی حکومتوں کو غداری، دہشت گردی اور بغاوت جیسے مقدمات میں مطلوب تھے اور یہی وجہ ہے کہ جب بھی ان کو میزبان ممالک خصوصاً افغانستان اور پاکستان کی جانب سے نرم لہجے میں امریکی دباؤ کم کرنے کے لیے اپنے ممالک جانے کو کہا گیا' انہوں نے کھل کر انکار کرتے ہوئے کہا کہ وہ لڑتے لڑتے مر جانے کو ترجیح دیں گے مگر خود کو کسی ریاست کے حوالے نہیں کریں گے۔

افغانستان میں غیر ملکیوں کی آمد کے سلسلے کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک حصہ میں وہ لوگ شامل ہیں جو 80 کی دہائی میں روس کے خلاف جہاد میں شرکت کرنے یہاں آئے اور ان میں اکثریت نے جنگ میں باقاعدہ حصہ لیا جبکہ دوسرے دور میں یہ لوگ روس کی واپسی کے بعد امداد اور خدمت کے نام پر ہزاروں کی تعداد میں 90 کی دہائی میں افغانستان پہنچ گئے۔ یہ امدادی کارکن ریاستوں کے بجائے جہادی امدادی تنظیموں ہی سے وابستہ تھے۔ اس لیے اگر ان کو بھی جہادی سلسلے کا باقاعدہ حصہ قرار دیا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ ایک مستند ادارے کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق غیر ملکی امدادی کارکنوں میں سے افغانستان میں مختلف منصوبوں کے حوالے سے 2830 افراد صرف پشاور میں رہائش پذیر تھے۔ اس دوران 1500 عرب جلال آباد منتقل ہو گئے۔ باقی پشاور میں رہ گئے۔ تحقیقی کتاب "Arabs in Afghan Jihad" کے مطابق پاکستان میں ان عرب رضا کاروں کی تعداد بیس ہزار سے لے کر تیس ہزار تک تھی۔ ان میں سے پانچ ہزار سے زائد جماعت اسلامی کی دعوت پر آئے ہوئے تھے۔ ان کی سرگرمیوں اور مشکوک حرکات ہی کا نتیجہ تھا کہ حکومت پاکستان نے سال 94-1993ء کے دوران جماعت اسلامی کی سفارش پر ایسے رضا کاروں کو ویزے دینے پر پابندی عائد کر دی تھی۔

ایک اور رپورٹ کے مطابق سال 2000ء کے دوران عرب رضا کار امدادی (چیریٹی) تنظیموں کی تعداد پاکستان میں 35 کا ہندسہ عبور کر چکی تھی۔ سوال یہ ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں ایسی تنظیموں کی پاکستان خصوصاً پشاور اور فاٹا میں موجودگی کا کیا جواز بنتا تھا اور حکومت پاکستان ان کی آمد اور سرگرمیوں پر خاموش کیوں تھی؟

ایک اور رپورٹ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسی تنظیموں کی آمد اور پاکستان کے علاوہ دوسرے اسلامی ممالک میں ان کی سرمایہ کاری (جہادی مد میں) کا سلسلہ صرف القاعدہ تک محدود نہیں رہا۔ اس رپورٹ کے مطابق سال 1975ء سے سال 05-2004ء تک سعودی حکومت نے 70 بلین ڈالر اور سیز ایڈ کی صورت میں خرچ کیے۔ بظاہر یہ رقم مساجد' مدارس اور غریبوں کی مدد کے نام پر نکالی جاتی رہی۔ تاہم اتنی بڑی رقم کا حجم دیکھ کر اس بات پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا کہ عرب حکمرانوں کے مقاصد محض یہی تھے۔

جن اداروں نے اس عرصہ کے دوران جنگجوؤں کی تربیت اور فراہمی کے علاوہ امدادی رقوم کی مد میں انتہائی اہم کردار ادا کیا ان میں قابل ذکر یہ ہیں۔ 1- مکتبہ الخدمت (عبداللہ عضام) 2- الحرمین فاؤنڈیشن 3-الاتحاد المدارس عربیہ 4-مدینۃ المنورہ چیریٹی انسٹی ٹیوشن 5-بیو یلینس انٹرنیشنل فاؤنڈیشن (بی آئی ایف) 6-ہیومن ریلیف کمیٹی کینیڈا 7-ہیومن کنسرن انٹرنیشنل 8-اسلامک ریلیف ایجنسی 9- مجلس تنسیق الاسلامی 10-الجنت قطر 11-ہلال احمر 12- انٹرنیشنل اسلامک ریلیف 13-سنابل الخیر 14- سکس فاؤنڈیشن 15- کیوسی ایس (قطر) 16-ہلال احمر کویت 17-رابطہ عالم اسلامی 18- الاقصیٰ فاؤنڈیشن وغیرہ وغیرہ۔

اگر افغانستان کی جنگ (جہاد) کے دونوں ادوار کے دوران مالی' انتظامی' نظریاتی اور کسی حد تک کمانڈرز کی ہلاکتوں کا محتاط جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ غیر ملکی خصوصاً عربوں نے ان تمام شعبوں میں بنیادی اور اہم کردار ادا کیا ہے۔ عرب کمانڈرز اس تمام جنگ کے دوران افغانیوں اور پاکستانیوں سے کہیں پر بھی پیچھے نہیں رہے۔ اس جنگ یا جہاد میں جن عرب اور افریقی ممالک کے کمانڈروں اور جنگجوؤں نے براہ راست حصہ لیا۔ ان کی تعداد 15 سے زائد بتائی جاتی ہے۔

الجیریا کے جو کمانڈر اس جنگ کے دوران اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان میں

1-محمد عبدالقادر الجیرین 2-یسادم محمد الیاس 3-نصیر النفروسی 4- رمضان سفیان 5- عکرمہ الجیرین 6-صدیق صحراوی 7-عباس محمد 8-عبدالصدیق 9- عبید الحسن 10-ابو احمد 11- مخلوف بشیر 12-فرحت عبدالرحمان 13-عبدالوکیل 14-عبدالرؤف 15-ابو معالی 16-مسعود بن کشان 17-عمر ابراہیم 18- کمال الجیرین 19-عبدالہادی 20- نسیم اسلام 21-القاقا الجیرین 22-جلال الدین 23-ابو سیاف 24-محمد یوسف 25-یعقوب الجہر 26-ابوعبداللہ 27-ابوایوب 28-زکریا 29-ابوغوث 30-ابو حارث 31-خالد مصطفےٰ 32-عبدالرشید 33-ابوحساب 34-اسد الرحمان وغیرہ شامل ہیں۔

سعودی عرب کے جو اہم لوگ مارے گئے۔ ان کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

1-عبدالحامد 2-عبدالرحمان الغامدی 3-خالد عبداللہ 4-ابو سعد الخیدری 5-زبیر المکی 6-ابو زیادہ 7-ابوحسین 8-ابو عباس 9-ابو عمر مدنی 10-محمد دخیل احمد 11-محمد عیسےٰ 12-مستور عبداللہ 13-مرزوق ملکی 14-شاکر حسین 15-شعیب الغامدی 16-محمد عبدالاحد 17-خالد حمید 18- ابراہیم سعود 19-ابوجہاد 20-ابو یونس 21- سلیم مطیری 22-ابو عطےٰ 23-خالد الخلیدی 24-عماد الدین 25- عبداللہ یحیٰ 26-ابو عبیدہ 27-رضوان خلیفہ 28-ابو دجانہ 29-طارق مسادین۔

مصر کے جو لوگ (کمانڈر) مارے گئے ان کے نام یہ ہیں۔

1-ابوعبیدہ المعری 2-عبدالحمد 3- حسین بن علی 4-شعیب المصری 5-ابو ولید 6- محسن حسین 7-خالد علی 8-ابوعبد اللہ 9-احمد عربی 10-شعیب عربی 10-ابو ولید 11-عبدل باسم 13-ابو حذیفہ 14-بشیر المعری 15-احمد المیز ان۔

عراق کے جاں بحق کمانڈروں کے نام یہ ہیں۔

1-حیمان الکردی 2-لقمان خراج 3- طلحہ کریم 4-عثمان فراج 5-ملا محمد۔

ان ممالک کے علاوہ جن دوسرے ممالک کے کمانڈروں کی ہلاکتیں ہوئیں ان میں کویت کے 8' جارڈن کے 7' لیبیا کے 11' فلسطین کے 13' شام کے 9' صومالیہ کے 4' تیونس کے 6' قطر کے 6' متحدہ عرب امارات کے 4 اور یمن کے 35 کمانڈرز شامل ہیں۔ ان ممالک کے ناموں اور ان کے اہم کمانڈروں' جہادیوں کی تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ

تقریباً 15 سے زائد عرب ممالک افغانستان اور پاکستان کے جہادی معاملات اور سرگرمیوں کا باقاعدہ حصہ رہے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمارے اداروں' مبصرین اور تاریخ دانوں نے ان ممالک کے کردار' سرگرمیوں اور عمل دخل کو لمبے عرصے تک نظر انداز کیوں کیا؟

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان ممالک کے علاوہ جن دیگر ممالک کے مسلم اور جہادی گروپوں نے افغان جنگ کے دوران محدود پیمانے پر حصہ لیا ان میں کینیڈا' برطانیہ' ترکی' آئرلینڈ' بنگلہ دیش' فلپائن اور موجودہ سنٹر ایشین ریاستیں شامل ہیں۔ ان ممالک کے بھی 22 سے زائد شہری جنگ کے دوران مارے گئے۔

سال 2001ء کے بعد جب افغانستان کی حکومت امریکہ اس کے اتحادیوں اور شمالی اتحاد کے ہاتھوں میں چلی گئی تو ہزاروں غیر ملکی پاکستان کے علاقوں خصوصاً فاٹا اور پختونخواہ کے مختلف اضلاع کی طرف بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ یہاں سے یہ اپنے حامی گروپوں کے ہاں ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی پھیل گئے۔ تاہم ان کا مضبوط گڑھ فاٹا ہی رہا۔ پاکستان کی سکیورٹی فورسز نے سال 2001ء کے بعد 2006ء تک القاعدہ کی ٹاپ لیڈرشپ سمیت دوسرے غیر ملکیوں کی جتنی گرفتاریاں کیں وہ بھی پاک سٹڈیز فار پیس نے اعداد وشمار کی صورت میں شائع کی ہیں جبکہ ان گرفتاریوں کے علاوہ درجنوں افراد کو مزاحمت کرنے پر ہلاک بھی کر دیا گیا۔ تاہم یہاں گرفتاریوں کی تفصیل پیش کر رہے ہیں۔ سال 2001ء کے دوران گرفتار ہوئے 800 سے زائد (ابو زبیدہ اور خالد شیخ سمیت) سال 2002ء میں 310 سے زائد گرفتاریاں ہوئیں۔ سال 2003ء میں گرفتاریوں کی تعداد رہی 195۔ سال 2004ء کے دوران جتنے گرفتار ہوئے ان کی تعداد 182 تھی۔ سال 2005ء کے دوران 135 افراد کو گرفتار کیا گیا جبکہ سال 2006ء کے دوران (مئی تک) 18 افراد گرفتار کیے گئے۔ جن جن علاقوں سے ان کی گرفتاریاں عمل میں لائی گئی تھیں ان میں ساتوں قبائلی ایجنسیوں کے علاوہ کوہاٹ' پشاور' فیصل آباد' کراچی' کوئٹہ' لاہور' اسلام آباد' راولپنڈی' نوابشاہ' سوات' خضدار' ہری پور' نصیر آباد' ملتان' نوشہرہ' بنوں' بونیر' چارسدہ' مردان' پنوں عاقل اور متعدد دوسرے شہر شامل ہیں۔

ان شہروں میں غیر ملکیوں خصوصاً القاعدہ ارکان اور کمانڈروں کی گرفتاریوں اور

متعدد کو ہلاک کرنے کے واقعات اور اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد غیر ملکیوں کی اکثریت پاکستان منتقل ہوگئی تھی۔ ان میں تین سے چار ہزار تک کو اگر گرفتار کیا گیا تھا تو سوال یہ ہے کہ ابتدائی اعداد و شمار اور اس کے بعد طالبان کے دور میں جو ہزاروں غیر ملکی افغانستان آئے تھے' وہ کہاں چلے گئے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ بہت سے امریکی اور اتحادی حملوں میں مارے گئے یا اب وہاں لڑ رہے ہیں جبکہ بے شمار نے پاکستان آ کر فاٹا اور دوسرے علاقوں میں محفوظ ٹھکانے حاصل کر لیے' زیر نظر تفصیلات میں صرف عرب جنگجوؤں کی ممکنہ اعداد و شمار پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں وہ ہزاروں سنٹرل ایشین جنگجو شامل نہیں ہیں جو کہ اپنی تعداد کے لحاظ سے عربوں کے بعد دوسرے نمبر پر بتائے جا رہے ہیں اور ان کی نہ صرف موجودگی بار بار پاکستانی علاقوں میں دیکھی جا چکی ہے بلکہ وہ فاٹا' سوات اور دوسرے علاقوں میں فورسز کے خلاف مقامی طالبان' جہادی گروپوں کے ساتھ باقاعدہ لڑتے بھی رہے ہیں۔

اسی پس منظر اور خطرات کو سامنے رکھ کر پاکستان کے حساس ادارے' حکومتی عہدیداران اور فورسز کے اعلیٰ حکام تکرار کے ساتھ یہ کہتے نظر آ رہے ہیں کہ پاکستان کو اب مقامی جہادیوں کے علاوہ غیر ملکی عسکری قوتوں کے چنگل سے بھی چھٹکارا دلانا ناگزیر ہو گیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہت سی گرفتاریاں اور ہلاکتیں ہوئیں لیکن ہم ڈرون حملوں کے دوران نشانہ بنائے جانے والے القاعدہ کی لیڈرشپ کے علاوہ دوسرے بے شمار غیر ملکیوں کی ہلاکتوں کے امریکی دعوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ڈرون حملوں کی مخالفت یا حمایت سے قطع نظر اس حقیقت کو نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ ان کے نتیجے میں القاعدہ کی ٹاپ لیڈرشپ ہاشم الیمنی' ابوحمزہ ربیعہ' محسن موسیٰ' متولی غنوی' ابو خیاب مصری' ابولیث' راشد رؤف' ابوسلیمان الجزیری' ابو عکاش' خالد حبیب' عظام السعودی' ابوسعید' ابو زبیر المصری سمیت لاتعداد عرب ازبک' چیچن' تاجک اور پاکستانی کمانڈروں کو نشانہ بنایا گیا جبکہ بیت اللہ محسود بھی ایسے ہی ایک حملے کے دوران ہلاک کر دیئے گئے۔

✿ ✿ ✿ ✿

اے مرے پشاور

جنوبی ایشیا اور وسطی ایشیا پاکستان اور افغانستان کے سنگم پر واقع صوبہ پشتونخواہ کا دارالحکومت اور تاریخی شہر پشاور ایک زمانہ میں کاروباری اور ثقافتی مرکز رہا ہے۔ یہاں وسطی ایشیا سے مہاجر بھی آئے اور آرین سے لے کر منگولوں تک اور پھر غزنویوں' غوریوں اور مغلوں نے بھی ہندوستان پر حملوں کے لیے اسی شہر کی گزرگاہوں کو استعمال کیا اور اس پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے تو دوسری طرف ہندوستان اور وسطی ایشیا سے آنے والے تجارتی قافلے بھی اسی شہر میں قیام کیا کرتے تھے جس کی سرائیں انہیں عارضی تحفظ فراہم کرتی تھیں۔ پشاور کا قصہ خوانی بازار ان قافلوں کا اہم مرکز ہوا کرتا تھا۔ جہاں ان قافلوں میں شامل افراد ایک دوسرے کو اپنے اپنے دیس' اپنے وطن' اپنی تہذیب اور اپنی ثقافت کی کہانیاں سنا کر سرد راتیں گزارا کرتے یا پھر وقت گزارنے کے سہارے تلاش کیا کرتے تھے۔

آج جب دنیا ایک نئی تبدیلی کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ایک نیا تجارتی اور کاروباری نقشہ وجود میں آرہا ہے تو نہ صرف پشاور بلکہ اس کی کاروباری اہمیت نمایاں ہو رہی ہے بلکہ اس کے قصہ خوانی بازار نئے رنگ روپ اختیار کرنے والے ہیں تو کچھ قوتوں کو یہ ایک آنکھ نہیں بھا رہا لیکن اس تناظر میں ایک نقطہ نظر تو یہ بھی ہے کہ پشاور تو ایک شہر ہے جبکہ اس کے اردگرد کے علاقے بھی موجود ہیں جو اکیسویں صدی کے آغاز پر بھی پندرہویں' سولہویں صدی کی پسماندگی کا منظر پیش کرتے ہیں۔ وہی پرانی معاشرتی اور ثقافتی روایات جن میں انسانی شعوری ارتقاء کی داستانیں مفقود ہیں یا پھر یہ علاقے ہنوز جہل کی

روایات میں جکڑے ہوئے ہیں اور وہ اپنے اس خول سے باہر بھی نکلنا نہیں چاہتے۔ انہوں نے مذہب کا لبادہ اوڑھ کر ترقی کے راستے بند کر رکھے ہیں یا پھر کچھ ایسے خان اور مشران ہیں جو استحصال کو جاری رکھنے کے لیے مذہب کو استعمال کر رہے ہیں تاکہ ان علاقوں میں علم کی روشنی نہ پھیل سکے اور لوگ اپنے حقوق سے آشنا نہ ہوسکیں۔

یہ نقطہ نظر اپنی جگہ...... لیکن اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ یہ خطہ پچھلے تیس سال سے عالمی سازشوں کا گڑھ بن چکا ہے بلکہ اس خطے میں موجود معدنی وسائل نے پوری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا ہے۔ ہر کسی کی یہی خواہش اور کوشش ہے کہ ان وسائل پر قبضہ کرے۔ جو اس خطے کے عوام کو فتح کیے بغیر ممکن نہیں۔ ستم تو یہ بھی ہے کہ سوویت یونین نے بھی حکمرانوں کے ذریعے کوشش کی تو امریکہ نے یہاں کے جنگجو سرداروں کے ذریعے اسے نکال باہر کر دیا اور اب امریکہ نے اگرچہ ہتھیاروں کے ذریعے افغانستان پر قبضہ کر لیا ہے اور کچھ سردار بھی اپنے ساتھ ملا لیے ہیں لیکن وہ مجاہدین اور ان کے اہم کمانڈرز جنہیں اس نے مذہب اور جہاد کے نام پر استعمال کیا تھا' وہ اس نئے منظرنامے کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں جن میں سے اکثر نائن الیون کے بعد پاکستانی علاقوں میں پناہ گزین ہو گئے اور انہوں نے مسلح بغاوت بھی شروع کر دی تھی۔

چنانچہ ایک خیال یہ بھی رہا ہے اور اس میں صداقت بھی ہے کہ یہ تمام گروپس براہ راست جنگ کے متحمل ہو سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی صلاحیت اور طاقت رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ لمبی اور خفیہ جنگ جس کو جنگی اصطلاح میں گوریلا وار بھی کہا جاتا ہے' اسی کی طرف بڑھ رہے ہیں بلکہ اس کا آغاز کر چکے ہیں لیکن ان کے سامنے دوہری مشکل ہے۔ ایک طرف تو انہیں افغانستان میں کارروائیاں کرنا مشکل ہو رہا ہے تو دوسری طرف انہیں پاکستانی افواج کا بھی سامنا ہے جس کے بعد ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہتا کہ وہ بم دھماکوں اور خودکش حملوں کو اپنا موثر ترین ہتھیار استعمال کریں جس کے لیے انہوں نے طویل منصوبہ بندی بھی کی اور اس کے لیے باقاعدہ خام مال بھی تیار کیا اور پندرہ سے بیس سال کے نوجوانوں کی برین واشنگ کر کے انہیں اس جنگ کا سب سے خطرناک ہتھیار بھی بنا دیا اور یہ ہتھیار پاکستان کے مختلف شہروں میں بہت کامیابی کے ساتھ استعمال بھی کیا گیا جس کے بعد حکومت پاکستان

اور اس کے ادارے بھی متحرک ہوئے اور انہوں نے اس کے سد باب کی کوششیں بھی کیں مگر وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے لیکن وہ کسی حد تک ان کی ناکہ بندی کرنے میں ضرور کامیاب ٹھہرے جس سے یہ خودکش حملہ آور مخصوص علاقوں تک محدود ہو گئے لیکن...... ان کے لیے پشاور کو نشانہ بنانا ضروری ہو گیا جو قریب بھی تھا اور آسان ہدف بھی اور پھر انہیں یہاں زبان و ثقافت اور رنگ و نسل کے تضاد کا بھی سامنا نہیں تھا اور یہاں وہ ماحول بھی موجود تھا جو سوویت یونین کے خلاف جنگ سے شروع ہوا اور اس کے اثرات بھی موجود تھے لیکن ایک اور تلخ حقیقت تو یہ بھی تھی کہ پشاور تین ایجنسیوں کے جغرافیائی گھیرے میں تھا۔ یہ اس قسم کی کارروائیوں کا نزدیک ترین اور آسان ہدف تھا اور یہاں دہشت گردوں کا آنا جانا بھی کچھ ایسا مشکل نہیں تھا۔

1979ء کے دوران جب افغانستان میں سوویت عسکری مداخلت کا آغاز ہوا اور دنیا بھر کے روس مخالف ممالک اور گروپ اپنا اپنا حساب برابر کرنے پاکستان میں جہاد کی ابتداء اور اس کے فروغ کے بہانے جمع ہونا شروع ہوئے تو روس سمیت اس کے اتحادیوں اور حامیوں نے پشاور کے گرد سرخ نشان ڈال کر اس شہر میں جاری ان جہادی سرگرمیوں کا بہت برا منایا۔ پشاور شہر ہی وہ مقام تھا جہاں پر افغان مجاہد تنظیموں کی تشکیل ہوئی۔ ان کے دفاتر اور ٹرسٹ قائم ہوئے اور یہاں سے لوگوں کو ہزاروں کی تعداد میں بھرتی کر کے طورخم کے اس پار روس اور سوشلسٹ افغان حکمرانوں سے لڑنے بھیجا جانے لگا۔ اس دور میں پشاور پاکستان کے بجائے افغانستان کے کسی شہر کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ یونیورسٹی ٹاؤن اور بعض دوسرے مقامات پر مجاہد تنظیموں کے ستر سے زائد دفاتر قائم ہوئے۔ یہی وہ شہر ہے جہاں پر چند برسوں بعد القاعدہ جیسی تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا اور ڈاکٹر عبداللہ عزام' ڈاکٹر ایمن الظواہری اور اسامہ بن لادن جیسے لوگوں نے قیام کرتے ہوئے ایک عالمی تصور جہاد کا ہوم ورک مکمل کیا۔ پشاور اس عرصہ کے دوران مجاہد تنظیموں کے علاوہ سی آئی اے کا بھی اس خطے میں سب سے بڑا مرکز بن گیا اور یوں اس تاریخی شہر پر مقامی لوگوں اور حلقوں کی گرفت تیزی سے ڈھیلی پڑتی گئی۔

پشاور ہی کے راستے روزانہ درجنوں ٹرالر اور ٹرک جدید اسلحہ لے کر افغان حدود

میں داخل ہوتے گئے۔ جب اس شہر کے راستے افغانستان کو جنگجو اور اسلحہ بھیجنے کا سلسلہ دراز ہوتا گیا تو دوسری جانب سے بھی اس علاقے کو تخریبی کارروائیوں کا نشانہ بنانے کا آغاز کیا گیا۔ بازاروں میں بم دھماکے ہونے لگے اور شہر کا پرامن اور روایتی ثقافتی ماحول بری طرح متاثر ہونے لگا۔ سال 1982ء سے لے کر 1988ء کے عرصہ کے دوران پشاور دھماکوں کا مرکز بنا رہا' تاہم اس شہر کی بدقسمتی دیکھیے کہ روس کی واپسی' افغانستان میں مجاہدین' طالبان کے ادوار حکمرانی اور متعدد دوسری تبدیلیوں کے باوجود 2006-07ء کے دوران یہ شہر پھر سے تشدد' اغوا' دھماکوں اور دوسری کارروائیوں کا بری طرح نشانہ بننا شروع ہوا۔

جن جن جہادی گروپوں اور ان کے لیڈروں نے اسی شہر سے اپنے قیام' سرگرمیوں اور عروج کے ادوا کی ابتدا کی تھی' طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد انہوں نے اس شہر کی بربادی اور تباہی کا سلسلہ کچھ اس انداز سے شروع کر دیا کہ اس شہر کے در و دیوار لرز کر رہ گئے اور انسانیت افسوس اور شرم سے منہ میں انگلی ڈالے نظر آئی۔

طالبان اور دوسری عسکری تنظیموں نے امریکہ' پاکستان اور افغانستان پر مشتمل سہ فریقی اتحاد کے خلاف کارروائیوں کا آغاز کیا تو صوبہ سرحد خصوصاً پشاور ان کا محبوب ترین اور آسان ترین ہدف بن کر رہ گیا۔

پشاور کا شاید ہی کوئی ایسا علاقہ بچا ہو جہاں پر انتہاپسندوں نے حملہ نہ کیا ہو۔ ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ حملہ آوروں نے 2008ء کے بعد نہ صرف وزراء' سرکاری افسران' سفارتکاروں اور فوجی حکام اور ان کے مراکز کو نشانہ بنایا بلکہ ان درندوں نے عام شہریوں یہاں تک کہ خواتین اور بچوں کو بھی نہیں بخشا۔

ایسی ایسی کارروائیاں کی گئیں کہ ایک ایک خاندان اور گھر سے کئی کئی جنازے نکلتے دکھائی دیئے۔ ایسے بے گناہ اور غیر متعلقہ لوگوں کو خودکش حملوں اور بموں سے اڑا دیا گیا کہ جن کی نہ تو ریاست سے کوئی وابستگی تھی نہ سیاست سے اور نہ ہی طالبان وغیرہ کی مخالفت پر مبنی کسی مہم یا ادارے سے ان کا کوئی تعلق تھا۔ ایک عام تاثر یہ ہے کہ چونکہ صوبہ پختونخواہ میں طالبان مخالف اے این پی کی حکومت تھی' اس لیے اس حکومت کے اقتدار کے مرکز کو بار بار نشانہ بنایا جانے لگا۔

یہ وہ تباہ کن صورتحال تھی جس کو ادیب اور شاعر بھی نظر انداز نہیں کر سکے چنانچہ انصار اللہ خلجی چیخ اٹھے کہ

کیسے یہ وحشتوں کے سائے ہیں؟
کیسی فریاد کیسے نالے ہیں؟
موت رقصاں ہے گلی کوچوں میں
کہ جیسے
زندگی نے شکست کھائی ہو
مسجدوں میں آذاں تو ہوتی ہے
پر عجب مسجدوں سے دوری ہے
جھوٹے باغوں میں اب نہیں ملتے
لوگ پیاروں سے اب نہیں ملتے
ایک دہشت کی گھٹا چھائی ہے
ہر طرف موت کی پرچھائیں ہے
اک عجب بُو ہے اب ہواؤں میں
جسم اُڑتے ہیں اب فضاؤں میں
اب نہ روزی نہ کاروبار کوئی
یاں پہ سجتا نہیں بازار کوئی
بھوک بدتر ہے مگر
موت سے تو بہتر ہے
اس لیے غریب شہر نے
غربت سے دوست کر لی
چارہ گر نام کے
گر ہوں بھی تو محدود اپنے محلوں تک
وہ جو کہتے تھے سب بہ بانگ دہل

کہ ہم اِک دوسرے پہ مرتے ہیں
اب وہی لوگ سہمے سہمے سے
اپنی پرچھائیوں سے ڈرتے ہیں
رونقیں اب میرے دل شہر پشاور کی
ایسی ماند پڑیں
کچہریوں کی طرح شام کے بعد
اے میرے دل میری جاں
شہر پشاور یہ ماجرا کیا ہے
ہر کوئی پوچھ رہا ہے
تجھے ہوا کیا ہے؟

ایک اور تلخ حقیقت تو یہ بھی ہے کہ پشاور تین ایجنسیوں کے جغرافیائی گھیرے میں تھا اور یہ اس طرح کی گھناؤنی کارروائیوں کے لیے نزدیک ترین اور آسان ہدف بھی تھا اور یہاں دہشت گردوں کا آنا جانا بھی کچھ ایسا مشکل نہیں تھا۔

پشاور میں ایسا ہی ایک خودکش حملہ 28اکتوبر (بروز بدھ) 2009ء کو چوک یادگار کے ایک علاقے پیپل منڈی میں کیا گیا جو اس شہر پر کیے جانے والے لاتعداد حملوں میں سب سے زیادہ خطرناک خودکش حملہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے 115 سے زائد افراد شہید جبکہ 200 سے زائد شدید زخمی ہوگئے۔ شہداء اور زخمیوں میں خواتین اور بچوں کی بڑی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ اس خودکش حملے نے پشاور کی موجودہ تاریخ کے دوران اجتماعی طور پر اس بدنصیب مگر تاریخی شہر کو مایوسی' ناامیدی' خوف اور بے بسی کی بدترین صورتحال اور سوگ سے دوچار کر کے رکھ دیا۔ 12 معصوم بچوں اور بچیوں کی لاشوں کے ٹکڑے اٹھانے والے خدا سے فریاد اور گلہ کرنے کے علاوہ اور کچھ بھی کرنے اور کہنے کے قابل نہیں تھے۔ متعدد ایسے تھے جن کے والدین اور رشتہ داروں کو بھی ان کی شہادت کا علم اور پتہ نہیں تھا۔ ہسپتالوں میں لاشیں ڈھانپنے اور مریض لٹانے کے لیے چادریں اور جگہیں بھی کم پڑ گئی تھیں۔ ہر آنکھ نہ صرف اشکبار تھی بلکہ مستقبل کے حوالے سے سوالیہ نشان بنی بے بسی سے محض آسمان ہی سے رجوع

کرتی نظر آرہی تھی۔ ملبے تلے دبے بچے اور دوسرے لوگ امدادی اہلکاروں اور لوگوں سے چیخ چیخ کر زندگی بچانے کی بھیک مانگ رہے تھے۔ ہر طرف خون' آگ اور جلی لاشوں' کٹے جسموں کا منظر تھا۔ مہوش نامی چھ سالہ خوبصورت بچی کی ایک ٹانگ اس گڑیا کے قریب پڑی تھی جو اس نے کچھ ہی دیر قبل اپنے بابا کے ساتھ مینا بازار میں ایک دکان سے خریدی تھی۔ وقاص نامی سات سالہ بچے کا بابا کچھ ہی دیر قبل صبح چھ بجے سے رکشہ چلانے سے تھک ہار کر کھانا کھانے گھر آیا تو وقاص اس کو تنور سے روٹی لانے سے منع کرتے ہوئے خود روٹی لانے نکل پڑیا اور کچھ ہی لمحوں بعد اس کی ماں' دو بہنیں اور غریب بابا اس کے جسم کے ٹکڑے سامنے رکھے دھاڑیں مارتے دیکھتے گئے۔ شہداء میں ایک ہی خاندان کے آٹھ بدنصیب افراد بھی شامل تھے۔ ان کے جنازے اٹھائے گئے تو سیاست کی سیاہ کاریوں' عالمی' علاقائی سازشوں' مذاہب کی تلخیوں اور حملہ آوروں کی سنگدلی سمیت دوسرے اسباب پر ہر آنکھ محض سوال کرتے نظر آنی لگی کیونکہ آنسوؤں کا ذخیرہ تو کئی گھنٹے قبل ختم ہو چکا تھا۔ دھماکے کے بعد تیس لاکھ کی آبادی کا شہر منٹوں میں خوف' اداسی اور مایوسی کے باعث قبرستان کا نقشہ پیش کرنے لگا۔ قومی قیادت کی بے حسی کا یہ عالم تھا کہ حکمرانوں نے اسی شام کو اسلام آباد میں ہیلری کلنٹن کے وفد کے اعزاز یئے اور استقبالیے کو منسوخ کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ حالانکہ ہیلری اس دورہ کے دوران بار بار یہ کہتے سنی گئی کہ القاعدہ کی ٹاپ لیڈرشپ پاکستان میں چھپی ہے یا چھپائی گئی ہے۔

اس روز ثابت ہوا کہ پشاور کے سات ہزار پولیس اہلکار' سینکڑوں فوجی جوان' بے شمار انٹیلی جنس ادارے' سیاستدان' حکمران اور دوسرے نہ تو عوام کو تحفظ فراہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان کو ان کے مستقبل کے بارے میں کوئی امید دلا سکتے ہیں۔ عوامی نمائندوں کی حالت یہ تھی کہ پشاور کے عوام نے جن لوگوں کو ووٹ دے کر ایوان اقتدار میں پہنچایا تھا ان میں سے صرف ایک (بشیر احمد بلور) کو چھوڑ کر باقی تمام موت کے خوف سے گھروں اور دفتروں کے اندر دبکے بیٹھے تھے۔ عظیم باچا خان کے پوتے اور پشتونوں کے لیڈر اسفند یار ولی خان اور پشتونوں کے دانشور اعظم (سفیر امن) افراسیاب خٹک نے دورہ کرنا اور میڈیا پر آنا تو درکنار مذمتی بیان بھی جاری کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ نوجوان وزیراعلیٰ کو سکیورٹی سے متعلق افسران' زخمیوں کی عیادت کرنے

سے منع کرتے رہے تا آنکہ رات کے دس بج گئے اور وہ ہسپتال پہنچ گئے۔ جہاد کے بابوں اور پاکستان کے علمائے کرام اور دینی سیاسی جماعتوں کے باریش لیڈروں کے موبائل اور ٹیلی فون سیٹ بند تھے تاکہ میڈیا جہادیوں کی مذمت اور حالات پر تبصرہ کرنے کے لیے رابطہ کرکے ان کو کسی آزمائش میں نہ ڈال دے۔

اس دھماکہ کے واقعات' اثرات اور نتائج کو اجاگر کرنے کا مقصد محض یہ تھا کہ اس واقعہ نے واقعتاً نہ صرف یہ کہ اس بدنصیب شہر' صوبے اور خطے کے عوام کو اپنی سلامتی اور مستقبل سے یکسر مایوس کر دیا بلکہ حساس اور باخبر تجزیہ نگاروں سمیت عوام پر بھی یہ بات واضح ہوگئی کہ نان سٹیٹ ایکٹرز سٹیٹ اور سیاستدانوں کے مقابلے میں زیادہ کامیابی کی شاہراہ پر گامزن ہیں۔ بعض پاکستانی جہادی لیڈروں کے برعکس اقوام متحدہ اور امریکہ کے اعلیٰ عہدیداروں (بون کی مان+ اوباما) سمیت متعدد عالمی رہنماؤں نے بھی چند گھنٹوں کے اندر اس وحشت ناک کارروائی پر اظہار افسوس کیا مگر یہ مدعی سست اور گواہ چست والی بات تھی۔

دیکھا جائے تو صرف اکتوبر کے ان 25 روز کے دوران پشاور اور صوبہ پشتونخواہ کے جن دوسرے علاقوں میں دھماکے اور حملے (زیادہ تر خودکش) کیے گئے ان کے نتیجے میں 250 سے زائد معلوم لوگ کوئی جرم کیے بغیر بڑی سزا پاتے ہوئے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان دھماکوں کا ایک اور المیہ یہ سامنے آیا کہ جو شدید زخمی زندہ بچ جاتے وہ عمر بھر کے لیے معذور ہوکر دوسروں کے محتاج بن جاتے رہے۔ پشاور کے لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں خیبر بازار بم دھماکہ کے بعد ایک ایسے شخص کو دیکھا گیا جس کی ناف سے نیچے کا تمام جسم دھماکے میں اڑ گیا تھا مگر وہ زندہ تھا اور اب بھی سانسیں لے رہا تھا۔

ایک رپورٹ کے مطابق سال 2009ء کے دوران پاکستان کی فورسز' سرکاری افسران اور نہتے عوام کے خلاف خودکش' بم حملوں سمیت 198 کارروائیاں کی گئیں۔ پشاور کے بدترین انسانی تشدد کو بعض حلقوں نے ہیلری کلنٹن کے استقبال کا نام دیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وفاق پرست پارٹیوں اور مذہبی جماعتوں کی طرف سے اس واقعہ کے بعد بھی وہ ردعمل یا اظہار مذمت سامنے نہیں آیا جس کی ضرورت اور توقع تھی جبکہ اسلام آباد اور لاہور کے حکمران ہیلری کی مہمان نوازی میں مصروف تھے۔ یہ وہ موقع تھا جب امریکی وزیر خارجہ

ہیلری کلنٹن نے اپنے دورہ پاکستان کے دوران اس بات پر خصوصی توجہ دی کہ محض حکمرانوں یا دوسرے بااختیار طبقوں کے ساتھ ملاقاتوں پر انحصار نہ کیا جائے بلکہ پاکستانی معاشرے کے صاحب الرائے حلقوں مثلاً صحافیوں' سٹوڈنٹس' تاجروں اور خواتین کے ساتھ براہ راست بات کرکے ان کی رائے سنی جائے۔ ان ملاقاتوں کے دوران ان کو بعض حلقوں کی جانب سے امریکی پالیسیوں کے حوالے سے تیز وتند سوالات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ان کے دورے سے عام طور پر یہ تاثر بھی لیا گیا کہ عوام سے رابطے کے معاملے میں پاکستانی حکمران اور سیاسی قیادت کتنی نااہل یا غیر ذمہ دار ہے کیونکہ پاکستانی سیاسی لیڈروں کی سرگرمیاں نہ صرف دہشت گردی کی خوف کی آڑ میں ختم ہوکر رہ گئی تھیں بلکہ حکمران اتحاد میں شامل پارٹیاں خصوصاً پی پی پی اور اے این پی کا صاحب الرائے حلقوں سے رابطے کا سلسلہ ہی ختم ہوکر رہ گیا تھا۔ مورچہ بند حکمران عملاً نہ تو عوام کے ساتھ رابطے میں رہے اور نہ ہی وہ خود کو ریاستی اور سیاسی معاملات پر عوام کی رائے کو کوئی اہمیت دے کر خود کو ان کے سامنے جوابدہ سمجھتے تھے۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ ہیلری کلنٹن نے دوسرے شہروں کے دورے تو کر لیے تاہم انہوں نے بوجوہ پشاور جانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی حالانکہ یہ شہر عرصہ دراز سے امریکہ اور دوسری قوتوں کی پالیسیوں کی سزا بھگتتے ہوئے میدان جنگ میں تبدیل ہوکر رہ گیا تھا۔ ہیلری نے فاٹا اور صوبہ سرحد کے عوام سے بات کرنے کی بجائے محض ان کے چند نمائندوں کے ساتھ اسلام آباد میں ایک مختصر ملاقات ہی پر اکتفا کرکے بالفاظ دیگر ان کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔ حالانکہ ان کی آمد سے پہلے یہ اطلاعات موجود تھیں کہ وہ نہ صرف جنگ سے متاثرہ علاقوں خصوصاً سوات اور پشاور کا وزٹ بھی کریں گی لیکن شاید سکیورٹی کی صورتحال اور اس علاقے میں جاری جنگ کی وجہ سے ایسا نہیں ہوسکا۔ بہرحال ہیلری کے دورہ پاکستان کے دوران پشاور کی تاریخ کا بدترین دھماکہ اپنے پیچھے بہت سے سوالات اور تلخ یادیں چھوڑنے کے باعث عدم تحفظ کے خطرناک اثرات مرتب کرگیا لیکن ایک اور بہت بڑا سوال یہ بھی سامنے آیا کہ کیا ان دھماکوں میں طالبان کے علاوہ غیر ملکی ہاتھ بھی ملوث ہیں اور اگر ہیں تو ان کا راستہ کیسے روکا جائے۔ تحریک طالبان کے نئے امیر حکیم اللہ محسود نے بذات خود

اس دھماکے سے لاتعلقی کا اظہار کیا جبکہ ان کے حامی بھی طالبان کا نام لینے کے بجائے بیرونی ہاتھ کی رٹ لگا کر کنفیوژن کا شکار دکھائی دیئے۔ اے این پی کے بعض لیڈروں کو بھی بیرونی ہاتھ یہاں تک کہ بھارت کا نام لیتے سنا گیا۔

لیکن دوسری طرف پشاور اور قریبی علاقوں میں تمام تر حکومتی اقدامات کے باوجود عام مقامات پر دھماکوں اور حملوں کا سلسلہ کم ہونے کی بجائے بڑھتا ہی گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اکتوبر کی ریکارڈ ہلاکتوں کا سلسلہ نومبر کے پہلے دس دنوں کے دوران دوسرے واقعات کے علاوہ تین بڑے دھماکے یا حملے کیے گئے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ حملے کیے بعد دیگر کئی روز تک کسی وقفے کے بعد کیے گئے۔ 6 نومبر کو پشاور میں پولیس پر خودکش حملہ کیا گیا جس میں نصف درجن سے لگ بھگ افراد جاں بحق ہو گئے۔ 7 نومبر کو متنی میں ایک اور دھماکہ کرایا گیا جس کے نتیجے میں علاقہ ناظم سمیت 12 افراد زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے اور اس سے اگلے روز یعنی 8 نومبر کو اسفند یار ولی خان سمیت دوسرے اہم لیڈروں کے شہر چارسدہ میں ایک اور بدترین دھماکے نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس دھماکے میں 35 عام لوگ شہید ہو گئے۔ ان میں بچے اور خواتین کی بڑی تعداد شامل تھی جس سے حملہ آوروں نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ پاکستانی ریاست اور اس کے اداروں میں ان کا مقابلہ یا سدباب کرنے کی صلاحیت ہی موجود نہیں کیونکہ ایک اندازے کے مطابق نومبر کے پہلے دو ہفتوں کے دوران صرف پشاور میں 8 حملے کیے گئے۔

عالمی قوتوں کا مشکوک کردار

سال 09-2008ء کے دوران جب پاکستان میں طالبان اور دوسری عسکری قوتوں کی سرگرمیوں اور اقدامات نے خطرے کی لکیر پار کر کے پاکستانی ریاست کی رٹ کو ایک سوالیہ نشان بنا دیا تو پاکستانی اداروں اور ماہرین نے اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے جہاں سخت کارروائیوں کے حق میں فیصلہ دیا وہاں اس بات کا بھی جائزہ لیا جانے لگا کہ آیا اس گیم میں صرف طالبان ہی ملوث ہیں یا کچھ اور طاقتیں بھی پاکستان کو عدم استحکام سے دوچار کرنا چاہتی ہیں۔ اس ضمن میں جن ممالک کے خلاف انگلیاں اٹھاتے ہوئے خدشات کا اظہار کیا جانے لگا ان میں بھارت' افغانستان اور امریکہ شامل تھے جبکہ بعض روایتی تبصرہ نگاروں نے اسرائیل کا نام بھی لینا شروع کیا۔ افغانستان میں بھارت کے عمل دخل اور سفارتی عملے کی تعداد کو بطور خاص ہدف بنایا گیا جبکہ بلوچستان میں بھی بھارت کی مداخلت اور فنڈنگ کے نہ صرف سیاسی اور عسکری حلقوں کی جانب سے دعوے کیے گئے بلکہ نومبر 2009ء کے پہلے ہفتے کو اسلام آباد میں منعقدہ پارلیمنٹ کی قومی سلامتی کمیٹی کے اعلیٰ ترین اجلاس کے دوران وزیر داخلہ رحمان ملک نے بریفنگ دیتے ہوئے بلوچستان اور محدود پیمانے پر فاٹا میں بھارت کی مداخلت کے شواہد پیش کرنے کا دعویٰ کیا۔ اس اجلاس میں دوسروں کے علاوہ مبینہ طور پر بھارت نواز پاکستانی لیڈر اسفند یار ولی خان بھی موجود تھے۔ کمیٹی (کونسل) نے حکومت کو مشورہ دیا کہ اس مسئلے کو امریکہ اور خود بھارت کے ساتھ سنجیدگی کے ساتھ اٹھایا جائے۔ اسی روز صوبہ پختونخواہ کے وزیر اطلاعات میاں

افتخار حسین نے بھی نوشہرہ میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے حالات خراب کرنے میں ایک پڑوسی ملک کا ہاتھ ہے۔ اے این پی کے سربراہ اور صوبائی وزیر کی جانب سے اس جانب اشارہ کرنے یا اتفاق رائے کا اظہار کرنے سے اس مسئلے کی شدت اور صداقت کے بارے میں ایک نئی بحث شروع ہوئی کیونکہ اگر ان کا اشارہ بھارت یا افغانستان کی طرف تھا تو یہ بات سب کے علم میں رہی ہے کہ اے این پی وہ واحد جماعت ہے جو کہ خاندانی اور سیاسی طور پر بھارت اور افغانستان کے حکمرانوں اور سیاسی قوتوں کے انتہائی قریب رہی ہے بلکہ افغان جنگوں کے دوران وہ مقبول عام پاکستانی رویئے کے خلاف افغانستان کے حق اور صف میں کھڑی نظر آتی تھی اور اس کا یہی موقف 2002ء کے الیکشن کے دوران اس پارٹی کی بدترین شکست کا بھی سبب بنا تھا۔ 2 نومبر 2009ء کو آئی ایس پی آر کی جانب سے دعویٰ کیا گیا کہ فورسز نے جنوبی وزیرستان میں کارروائیوں کے دوران بڑی مقدار میں بھارتی اسلحہ برآمد کیا ہے۔ بعض حلقوں کی جانب سے کرنسی اور بعض دستاویزات ملنے کے دعوے بھی کیے گئے۔

اس صورتحال کے تناظر میں جو سب سے بڑا سوال غیر جانبدار تجزیہ کاروں کے ذہن میں سر اٹھانے لگا وہ یہ تھا کہ اگر واقعی بھارت یا افغانستان کی حکومتیں پاکستان کے خلاف ان کارروائیوں میں اس حد تک مداخلت کر رہی ہیں تو کیا یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ اے این پی اور ان دو ممالک کے درمیان باہمی تعلقات اور انڈرسٹینڈنگ کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ اس بات کو نظرانداز کرنا اس لیے ممکن نہیں کہ جاری جنگ کے دوران اگر کسی پارٹی نے بطور سیاسی قوت اور انفرادی شکل میں سب سے زیادہ نقصان اٹھایا تھا تو وہ اے این پی ہی تھی کیونکہ یہ پارٹی فرنٹ لائن صوبے میں نہ صرف یہ کہ اہم قوت رہی ہے بلکہ جنگ کے دوران صوبے کی حکومتی قیادت بھی اس پارٹی کے ہاتھ میں تھی۔ پشاور کے متعدد تجزیہ نگاروں نے اس سوال کے جواب میں کوئی واضح رائے دینے کی بجائے مبہم جواب دینے ہی پر اکتفا کیا۔ تاہم کچھ ایسے بھی تھے جو کہ اے این پی کی صوبائی حکومت کی موجودگی میں بھارت یا افغانستان کی طرح اس حد تک جانے کے امکان کو رد کرتے نظر آئے۔ ان کا موقف تھا کہ بھارت یا افغانستان کے عمل دخل کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں۔ تاہم اسفند یار ولی

سمیت اس پارٹی کی اعلیٰ قیادت' وزراء اور دوسروں کو خودکش حملوں کا نشانہ بنانا یا اے این پی کو دیوار سے لگانا شاید ان دو ممالک کے لیے کوئی پسندیدہ عمل نہیں ہوگا۔ ان مبصرین کے مطابق فاٹا یا پشتونخواہ اور بلوچستان کے سیاسی' جغرافیائی تناظر کو سامنے رکھ کر دونوں کا موازنہ کرنا ان دو ممالک کی پالیسی کے حوالے سے زیادہ مناسب بات لگتی دکھائی نہیں دیتی۔ ان کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ بلوچستان میں بے شک یہ ممالک مداخلت کر رہے ہوں مگر فاٹا یا صوبہ پختونخواہ میں ان کی اس حد تک مداخلت کو ہضم کرنا شاید درست نہ ہو کیونکہ ان کی دلیل تھی کہ دونوں ممالک پشتونوں خصوصاً اے این پی کے ساتھ والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔

اس ضمن میں جب بھی نجی محفلوں یا رابطوں کے دوران طالبان کی قیادت سے بھارتی مداخلت کے بارے میں پوچھا گیا تو وہ بھی انکار کرتے ہوئے بھارت سے نفرت کا اظہار کرتے نظر آئے۔ اس پس منظر کو سامنے رکھا جائے تو سال 2008ء کے دوران ممبئی حملوں کے بعد اعلیٰ ترین طالبان کمانڈروں کے وہ بیانات نظرانداز نہیں کیے جا سکتے جن میں انہوں نے پاک بھارت جنگ کی صورت میں پاکستانی فورسز کے ساتھ تمام اختلافات ختم کرنے اور فورسز کے ساتھ مل کر بھارت کے خلاف لڑنے کے اعلانات کیے تھے۔ اس سلسلے میں طالبان کی صفوں بلکہ قیادت میں موجود ان پاکستانی جہادی کمانڈروں کے پس منظر اور اس جدوجہد کو بھی مدنظر رکھنے کی بات کی جاتی رہی جو کہ کشمیر کی آزادی کے لیے عملاً کئی برسوں تک بھارت کے خلاف لڑے اور جب مشرف کی حکومت نے کشمیر کے بارے یوٹرن لیا تو یہ لوگ مایوس ہوکر طالبان کے ساتھ جا ملے اور وہاں قیام پذیر ہوئے۔

ان چیدہ دلائل کے باوجود پاکستان کے اداروں اور سیاسی رہنماؤں میں بڑی سنجیدگی سے پاکستانی طالبان کو بھارت کی فنڈنگ کا مسئلہ زیر بحث رہا۔ تاہم سنجیدہ حلقے بھارت کی براہ راست مداخلت پر ابہام کا شکار رہے۔ افغانستان اور بھارت کے بعد جس ملک کی مداخلت یا پالیسی کو طالبان کی کارروائیوں کے تناظر میں حکومت مخالف حلقوں میں زیر بحث لایا گیا وہ پاکستان کا دیرینہ پارٹنر امریکہ تھا۔ امریکہ کی پارٹنرشپ اور اس سے وابستہ مفادات کو مدنظر رکھ کر پاکستانی حکمران محتاط انداز میں کبھی کبھی اشاروں کنایوں یا نجی محفلوں

میں بات کرتے سنے گئے جبکہ سیاستدانوں' حکمرانوں کے برعکس سکیورٹی ایجنسیوں کا موقف کسی نہ کسی حد تک زیادہ واضح دکھائی دیا اور فورسز وقتاً فوقتاً اس ایشو کو حکومتی عہدیداروں کے ساتھ اٹھاتی بھی رہیں۔

اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں رہا کہ امریکہ محض القاعدہ یا طالبان کو ختم کرنے اس خطے میں نہیں آیا۔ اس قسم کے بے شمار واقعات اور شواہد اب تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں کہ امریکی کمانڈرز اور فورسز نے متعدد بار القاعدہ اور طالبان کی اعلیٰ قیادت کو گھیرنے کے بعد مارنے یا گرفتار کرنے کی بجائے محفوظ راستہ فراہم کیا۔ متعدد نیٹو افسران اور خود امریکیوں کی اس قسم کی باتیں یورپ اور امریکہ کے میڈیا میں وقتاً فوقتاً چھپتی بھی رہی ہیں۔ امریکہ اگر چاہتا تو اتنی بڑی طاقت کے لیے مٹھی بھر القاعدہ یا طالبان جنگجوؤں کو راستے سے ہٹانا کوئی مشکل کام ہرگز نہیں تھا۔ امریکہ نے 2002ء کے بعد کیے گئے حملوں کے دوران جب افغانستان پر قبضے کا پلان بنا کر سنجیدگی کا مظاہرہ کیا تو دنیا نے دیکھ لیا طالبان یا دوسرے گروپ لمبے عرصے تک مزاحمت کرنے میدان میں نکلنے کی ہمت بھی نہیں کر رہے تھے۔ تاہم جب امریکہ پر عالمی برادری خصوصاً روس' ایران اور چین کی طرف سے اپنے اپنے خدشات کے تناظر میں قیام امن کے بعد افغانستان سے باہر نکل جانے کا دباؤ بڑھ گیا تو اس کے ردعمل میں امریکہ نے طالبان اور القاعدہ پر اپنی بنائی گرفت بڑی تیزی سے ڈھیلی کرنی شروع کر دی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ طالبان پھر سے سر اٹھا کر مزاحمت کرتے دکھائی دینے لگے۔

اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ ابتداء میں جب امریکہ اور اس کے قریبی اتحادی دہشت گردی کے خاتمے کے مینڈیٹ کے نام پر افغانستان میں اتر آئے تو روس اور ایران جیسے ممالک نے بھی ان کا خیر مقدم کر کے ممکنہ حد تک ان کو معاونت فراہم کی کیونکہ القاعدہ اور طالبان سے ان ممالک کو بھی خطرات لاحق ہو چکے تھے' تاہم جب ان ممالک نے امریکی کوتاہیوں اور مقاصد کو سامنے رکھ کر چند برسوں بعد اپنے اپنے طور پر ان کا تجزیہ کیا تو ان پر واضح ہو گیا کہ امریکہ نہ صرف یہ کہ افغانستان میں لمبے عرصے تک قیام کا ارادہ رکھتا ہے بلکہ وہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے عملاً طالبان یا دوسرے مزاحمت کاروں کو بھی زندہ اور متحرک رکھنا چاہتا ہے۔ اس ضمن میں دوسروں کے علاوہ نیٹو کی شکایات اور تجاویز بھی

مختلف اوقات میں میڈیا کے ذریعے سامنے آتی رہی ہیں۔

بہرحال ان کے برعکس افغانستان میں وقتاً فوقتاً حکمرانوں اور امریکیوں سے ملاقاتیں کرنے والے صحافیوں اور تجزیہ نگاروں کا کہنا تھا کہ امریکہ جان بوجھ کر افغان جنگ کو طول دینے کی پالیسی پر نہ صرف یہ کہ عمل پیرا ہے بلکہ بعض عہدیدار کھلے عام اس قسم کے خیالات کا اظہار بھی کرتے سنے گئے ہیں۔ امریکہ کی اس پالیسی پر دوسروں کے علاوہ امریکہ کے حامی افغان صدر یعنی حامد کرزئی نے جب خدشات کا اظہار کرنا شروع کیا تو امریکہ اور اس کے میڈیا نے سال 2009ء میں الیکشن مہم کے دوران ان کی جگہ عبداللہ عبداللہ کو آگے لانے کی ہر ممکن کوشش کی، تاہم کرزئی نے نہ صرف یہ کہ رن آف کے لیے دوبارہ میدان میں اترنے کا اعلان کر دیا بلکہ عبداللہ عبداللہ نے ان کی مقبولیت دیکھ کر صدارتی الیکشن میں دوبارہ حصہ لینے ہی سے انکار کر دیا اور الیکشن کمیشن کو یکم نومبر 2009ء کو امریکی خواہشات کے برعکس کرزئی کی کامیابی کا اعلامیہ جاری کرنا پڑا۔

انہی دنوں کے دوران جب امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن پاکستان کے لمبے دورے پر آئیں تو انہوں نے دوسری سخت باتوں کے علاوہ متعدد بار یہ بھی دعویٰ کیا کہ القاعدہ اور طالبان کی ٹاپ لیڈرشپ پاکستان میں موجود ہے۔ ان کی آمد سے قبل کوئٹہ شوریٰ اور بلوچستان پر ڈرون حملوں کی اطلاعات اور واقعات کی ریہرسل سے بھی امریکی عزائم کھل کر سامنے آئے۔ ہیلری جب پاکستان کا دورہ مکمل کر کے کابل پہنچی تو وہاں انہوں نے دوسری باتوں کے علاوہ خود بھی یہ اعتراف کیا کہ بش حکومت نے القاعدہ اور طالبان کے خاتمے کے لیے اس پلاننگ یا سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا جو خطے کے استحکام کے لیے ناگزیر اقدامات کا تقاضا کر رہی تھیں۔

اس حقیقت کو اب ماننا ہی پڑے گا کہ سال 2009ء کے دوران خطے میں دہشت گردی کے نام سے جاری عالمی گیم سے متعلقہ ایشوز پر اسلام آباد توقعات کے برعکس کابل کے مقابلے میں زیادہ ناکامیوں اور ابہام کا شکار نظر آیا۔ یکطرفہ امریکی الزامات اور تابڑ توڑ حملوں کے باوجود نہ صرف یہ کہ حکمران بلکہ تمام سیاسی قائدین امریکہ کی ناراضگی مول لینے کی بجائے مصالحت کی پالیسی پر گامزن دکھائی دیے جبکہ حامد کرزئی

کے خلاف توقع نہ صرف یہ کہ امریکی خواہشات کے برعکس اندرون خانہ طالبان اور حزب اسلامی کے ساتھ ایک روڈ میپ کو آگے بڑھانے میں مصروف رہے بلکہ انہوں نے رچرڈ ہالبروک سمیت متعدد دوسروں کو جھاڑ پلانے جیسی جرأت دکھانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ امریکی پالیسیوں، عزائم اور اہداف سے متعلق معلومات رکھنے والے باخبر حلقوں نے ایک سروے کے مطابق یہی موقف اپنایا کہ امریکہ خطے میں اپنی موجودگی کا جواز برقرار رکھنے کے لیے طالبان یا القاعدہ کو بدستور عالمی امن کے لیے بڑا خطرہ قرار دینے کی پالیسی پر گامزن ہے۔ ان حلقوں سے جب یہ پوچھا گیا کہ اگر ایسا ہی ہے تو امریکہ افغانستان ہی پر انحصار کرنے کے بجائے اپنے حلیف ملک یعنی پاکستان کو کیوں گھسیٹ رہا ہے تو ان کا جواب تھا کہ امریکہ یہ سب کچھ ایک مربوط حکمت عملی ہی کے تحت کرتا ہے۔ ان کا موقف تھا کہ افغانستان میں طالبان یا القاعدہ کی مسلسل موجودگی اور ان کے خاتمے میں امریکہ کی ناکامی اس سپرپاور کی حیثیت اور شہرت کو نقصان پہنچانے کے علاوہ اپنے دوسرے اتحادیوں اور خود امریکی عوام کی مزاحمت کی وجہ بن رہی ہے تو یہی سبب ہے کہ امریکہ عین اپنی پالیسی کے مطابق اب دوسرے محاذ کے طور پر پاکستان کو ٹارگٹ کرنے کی کوشش میں ہے جو کہ طالبان اور القاعدہ کا نہ صرف ماضی میں لانچنگ پیڈ رہا ہے بلکہ ایٹمی قوت ہونے کے علاوہ آج کل طالبان کی بدترین کارروائیوں کی زد میں ہونے کے باعث شدید دشواریوں سے بھی دوچار ہے۔ اس تناظر میں بعض ماہرین کی دلیل ہے کہ اگر بقول پاکستانی ادارے، افغانستان اور بھارت طالبان کو بڑھاوا دینے کے علاوہ دوسری عملی کارروائیوں میں پاکستان کے خلاف براہ راست ملوث ہیں تو اس عمل کو بھی امریکی آشیرباد کے بغیر کرنا ممکن نہیں کیونکہ اس ایشو پر مذکورہ دونوں ممالک پوری دلجمعی کے ساتھ امریکہ کے نہ صرف یہ کہ بااعتماد پارٹنرز ہیں بلکہ دونوں ممالک کا اس خطے کی صورتحال کے تناظر میں زیادہ تر انحصار امریکہ ہی پر ہے۔ دیکھا جائے تو شواہد اور امکانات کے تناظر میں امریکی پالیسی سے متعلق ان دلائل کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں ان مراکز (Basis) چھاؤنیوں اور ایئرپورٹس کی تعمیر اور توسیع کو امریکی پالیسی کے تناظر میں صورتحال کو سمجھنے کے حوالے سے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا جو کہ امریکیوں نے

مزاحمت کاروں کی قوت نہ ہونے کے باوجود افغانستان میں قائم کر رکھے ہیں۔ ان مراکز کے مقاصد اس سے بڑھ کر اور کچھ نظر نہیں آتے کہ امریکہ ان کے ذریعے وسطی ایشیائی ریاستوں‘ ایران اور چین کے مختلف علاقوں پر نظر رکھنا چاہتا ہے۔

اس ضمن میں تمام تر پیچیدگیوں اور یکطرفہ تجزیوں کے باوجود روس کے کردار کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ روس کے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس امریکہ‘ ایران اور پاکستان کو اتنی آسانی سے معاف یا نظرانداز کر دے جنھوں نے 80ء اور 90ء کی دہائیوں میں اس سپر پاور کو بے شمار دوسرے ممالک سے اتحاد کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔

المیہ یہ ہے کہ پاکستان کے پالیسی ساز ادارے‘ حکمران اور روایتی تجزیہ نگار امریکہ اور بعض دوسرے ملکوں کے یکطرفہ رومانس میں اتنے الجھے ہوئے ہیں کہ وہ پاکستان کی سلامتی سے متعلق درست اور غیر روایتی اپروچ کے ذریعے ان اسباب اور کرداروں کو سامنے لانے میں دلچسپی ہی نہیں دکھاتے جو پاکستان میں انتہاپسندی‘ مزاحمت اور اب ایک مکمل جنگ کی صورت میں مرکزی رول ادا کر سکتے ہیں یا کر رہے ہیں۔ سال 2009ء کے دوران جب بم دھماکوں اور حملوں کا سلسلہ خطرناک حد تک بڑھ گیا اور ریاستی ادارے اس سلسلے کی روک تھام میں ناکام ہونے لگے تو بعض قوتوں نے مزاحمت کاروں کو نظرانداز کرنے کی پالیسی اپنا کر اس صورتحال کی تمام تر ذمہ داری بھارت پر ڈالنی شروع کر دی۔ وہ یہ بھی بھولنے لگے کہ جب بھی کوئی بڑی کارروائی ہوتی ہے طالبان ہی اس کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں جبکہ شواہد‘ ثبوت بھی مل جاتے ہیں۔ انہوں نے محض ان پانچ فیصد کارروائیوں کی ذمہ داری قبول نہیں کی جن میں عام لوگوں کو نشانہ بنایا گیا کیونکہ ایسا ہونے سے ان کی مخالفت میں اضافہ ہونے کا امکان تھا۔ بعض تجزیہ نگار یہ کہتے پائے گئے کہ سوات میں شرپسندوں کی بعض لاشوں سے پتہ چلا کہ مرنے والوں کے ختنے نہیں کرائے گئے تھے‘ لہٰذا وہ ہندو تھے۔ حالانکہ ایک تاریخی حقیقت یہ ہے کہ محسود قبیلے میں ختنے کرانے کی روایت اب بھی بہت کم ہے اور یہ معمول کی بات سمجھی جاتی ہے۔

القاعدہ اور طالبان

افغانستان اور پاکستان سمیت متعدد دوسرے ممالک میں جہاد کے نام پر جاری کوششوں' مزاحمت' لڑائیوں اور نفسیاتی کشمکش کے اسباب' مقاصد اور نتائج کا تجزیہ کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک بعض دوسرے مقامی کرداروں کے علاوہ امریکہ کی پالیسیوں اور القاعدہ تنظیم کے مقاصد کو ایک مسلسل تکرار اور تعاقب کے ساتھ اجاگر کرتے ہوئے ان دو قوتوں کے کلیدی کردار کو سمجھا اور جانچا نہیں جاتا۔ اس بات یا تھیوری سے قطع نظر کہ متعدد لوگ امریکہ اور القاعدہ کو ان کے مشترکہ مقاصد کے تناظر میں اتحادی بھی قرار دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ افغانستان اور پاکستان جیسے ممالک تمام تر دعوؤں اور دلائل کے باوجود دور حاضر میں درحقیقت امریکہ اور القاعدہ ہی کے درمیان جاری جنگ یا کشیدگی کو بھگتاتے یا لڑتے آئے ہیں۔ ایک فریق یعنی امریکہ کو دنیا کی واحد سپر پاور کی حیثیت حاصل ہے تو دوسرے فریق یعنی القاعدہ کو گلوبل اسلامک آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ایک منظم نظریاتی اور عسکری قوت کا مقام حاصل ہے۔

امریکہ کے کردار پر زیادہ بحث کرنے کی بجائے خلاصہ کے طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ریاست نہ صرف یہ کہ اپنے نظریاتی' جغرافیائی اور اقتصادی مخالفین کو صفحہ ہستی سے مٹانے میں دیر نہیں لگاتی بلکہ اس کی سازشوں' مصنوبوں اور عملی اقدامات کا سب سے بڑا سبب یہی نکتہ رہا ہے کہ دنیا میں موجود ہر قسم کے وسائل کو اگر اپنے قبضے میں لانا مشکل ہے تو کم از کم اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ وسائل رکھنے والے ممالک کو ممکنہ حد تک کسی بھی حربے

یا طریقے سے یا تو اپنا اتحادی بنایا جائے یا ان کو دباؤ کا شکار کر کے اپنے مفادات کے تناظر میں اپنی شرائط کے لیے انتہائی حد تک کمزور کیا جائے۔

اسی پالیسی کا نتیجہ ہے کہ امریکہ نے جہاں ایک طرف مختلف مزاحمتی گروپوں کو وسائل دے کر ان کو مختلف ممالک میں سیاسی سسٹم اور ریاستوں کے خلاف منظم کیا وہاں القاعدہ اور طالبان جیسی تنظیموں کا بہانہ بنا کر متعدد کمزور ممالک کو خانہ جنگی اور عدم استحکام کے کنویں میں دھکیل کر اپنے مقاصد پورے کیے۔ اس ریاست کی ایک اور خوبی یہ رہی ہے کہ اس کی پالیسی میں دوستوں اور اتحادیوں کی اہمیت کبھی دیرپا یا مستقل نہیں ہوا کرتی بلکہ ہر تعلق کی بنیاد مفادات پر ہوتی ہے۔ یہ امریکہ ہی ہے جس نے اس تاریخی اصول کو جدید خطوط پر استوار کیا ہے۔ کل کے اتحادی آج کے دشمن اور آج کے دشمن کل کے دوست ہو سکتے ہیں اور افغانستان' پاکستان جیسے ممالک کے علاوہ افغان مجاہدین' طالبان اور القاعدہ جیسی تنظیمیں اس کی حالیہ مثالیں ہیں۔

چونکہ اس وقت ہماری بحث کا موضوع پاکستان میں جاری دہشت گردی یا انتہاپسندی ہے۔ اس لیے اس کردار کے پس منظر کو سامنے لانا زیادہ ضروری ہے جس کی آڑ میں امریکہ سمیت پوری دنیا جہاں پاکستان پر فوکس کیے ہوئے ہے۔ وہاں گلوبل اسلامک آئیڈیالوجی کی بنیاد پر جاری مزاحمت یا جدوجہد بھی پاکستان یا اس خطے کے لیے ایک سنگین خطرہ بنا ہوا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ پاکستان ہی وہ ملک تھا جس نے ایک پالیسی کے تحت جہادیوں کا ہر دور میں کھل کر ساتھ دیا لیکن موجودہ صورتحال طالبان یا اس قسم کے دوسرے گروپوں کے بارے میں کسی کو یہ ابہام نہیں رہا کہ ان کی اپنی کوئی الگ آئیڈیالوجی یا تھیوری موجود نہیں مگر وہ القاعدہ کی آئیڈیالوجی کی مکمل تقلید کر کے اس کے متعین کردہ اہداف اور مقاصد کی تکمیل کے لیے (بعض امتیازات یا اختلافات کے باوجود) محض سپاہیوں کا کردار ادا کرتے آئے ہیں۔ ان کا کردار محض یہی ہے کہ ان سے جنگجوؤں کا کام لے کر ایک عظیم اسلامی ریاست کے قیام اور غیر مسلموں کو صفحہ ہستی سے مٹانے جیسے بڑے نکات یا مقاصد کی تکمیل کے ایجنڈے پر القاعدہ کے نیٹ ورک کا حصہ بنایا جائے اور ابھی تک عملاً ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ اس پس منظر میں چند بنیادی نتائج اخذ کرنے کے لیے تاریخی تناظر میں اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ القاعدہ اور امریکہ کے درمیان براہ راست جنگ کی نوبت

کیوں آئی اور اس محاذ آرائی میں پاکستان اور افغانستان کا کیا کردار رہا ہے؟

سال 1986ء کو پاکستان کے شہر پشاور آنے والے اسامہ بن لادن فکری طور پر مصر کے سید کبت فلسطین کے ڈاکٹر عبداللہ عزام اور شیخ عمر عبدالرحمان کے افکار سے کافی متاثر تھے جو کہ جہاد کے عالمگیر تصور کے حامی سمجھے جاتے ہیں۔ اس سلسلے کو فکری طور پر اخوان المسلمین، الجماعۃ الاسلامی اور اسلامی جہاد جیسی تنظیموں کے فلسفہ جہاد کا نام دیا جاتا ہے۔ اس فلسفے میں دنیا پر صرف اللہ کی حاکمیت اور مسلمانوں کی ریاست کے قیام کے علاوہ غیر مسلموں کے خلاف انتہائی شدت کے ساتھ ہر جدوجہد اور کارروائی کو ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ محدود پیمانے پر اپنے اپنے ممالک میں روایتی مسلمان حکمرانوں کے بھی مخالف رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب عبداللہ عزام، ڈاکٹر ایمن الظواہری اور اسامہ بن لادن نے 1986-87ء کے دوران افغانستان اور فاٹا کے پشتون علاقوں پر سٹڈی کرکے یہاں کے دورے کیے تو یہ علاقہ ان کی نظر میں انتہائی آئیڈیل قرار پایا تھا۔ اسامہ بن لادن نے 1986ء میں خوست کمپلیکس کا دورہ کرتے وقت ہی تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے مستقبل کے منصوبوں کے حوالے سے اسی علاقے ہی کا انتخاب کریں گے۔ ان کی نظر میں پشتون بیلٹ کا جو تصور بن گیا وہ جہاد کے فلسفے کو دوسرے علاقوں تک پھیلانے کے لیے انتہائی موزوں اور محفوظ تھا۔ اس فیصلے کو دوسروں کے علاوہ سوڈان کے عمر بشیر اور احمد بشیر جیسے لوگوں کی حمایت بھی حاصل ہوگئی۔ اسامہ بن لادن نے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ (مکتب خدمت) کو 1988ء کے دوران القاعدہ نامی خطرناک تنظیم میں تبدیل کر دیا تو وہ پاکستان اور افغانستان کے معاملات ڈاکٹر عزائم کے ذمے چھوڑ کر 1989ء میں سعودی عرب چلے گئے جہاں پر انہوں نے جہاد کے بڑے حامیوں اور تنظیموں کو اعتماد میں لینے کی مہم چلائی۔ انہی سرگرمیوں کے باعث اسی سال وہ سعودی عرب میں گرفتار کر لیے گئے تو وزیر داخلہ خالد بن ولید نے ذاتی دلچسپی لے کر ان کی رہائی کو ممکن بنایا۔ اس رہائی کو بھی متعدد ماہرین ایک ڈیل کا نتیجہ قرار دیتے رہے۔ اس ڈیل یا فارمولے کے بانی شہزادہ ترکی الفیصل بتائے جاتے تھے جس کی بنیاد یہ تھی کہ اس ڈیل کے ذریعے سعودی حکمرانوں نے اسامہ اور ان کے ساتھیوں کو سعودی عرب کے باہر ہر قسم کی معاونت کی یقین دہانی کرائی تھی۔ اسی برس یعنی

1989ء کو ڈاکٹر عبداللہ عزام پشاور میں دو بیٹوں سمیت ایک دھماکے کے ذریعے ہلاک کر دیئے گئے جبکہ اسامہ بن لادن سوڈان چلے گئے جہاں وہ عالمی جہادی تنظیموں کے ساتھ رابطوں میں مصروف ہو گئے۔ 1994ء کو ان کے ساتھیوں کی سرگرمیوں کا نوٹس لینے کے سبب اور امریکی دباؤ کے نتیجے میں سعودی حکومت نے ان کی شہریت ختم کر دی۔ تاہم یہ اقدام محض دکھاوے کی حد تک سعودی ریاست کے اپنے اندرونی مفادات کے تناظر میں اٹھایا گیا تھا۔ حالانکہ سعودی حکمران اب بھی اس حق میں تھے کہ القاعدہ کو دوسرے ممالک میں رہتے ہوئے مضبوط کیا جائے۔ اسامہ بن لادن مئی 1996ء کو افغانستان کے شہر جلال آباد بلائے گئے۔ اس کام یا مقصد کو افغان لیڈر یونس خالص کے ذریعے ممکن بنایا گیا جبکہ بعض لوگ اس کو پاکستانی ماورائے آئی ایس آئی کی دلچسپی کا نتیجہ بھی قرار دیتے ہیں۔ اس سے قبل جب 1993ء کو صومالیہ میں 20 کے قریب امریکیوں کی ہلاکت کی ذمہ داری اسامہ بن لادن یا القاعدہ پر ڈال دی گئی تو دنیا پر اس تنظیم کی بھرپور موجودگی کا انکشاف ہو گیا اور اس کا سنجیدگی سے نوٹس لیا گیا۔ 1995ء کو ریاض میں ایک حملے کی ذمہ داری بھی القاعدہ پر ڈال دی گئی جبکہ کینیا اور تنزانیہ میں امریکیوں پر ہونے والے حملے بھی القاعدہ کے کھاتے میں ڈال دیئے گئے بلکہ القاعدہ نے کسی حد تک ان تمام کارروائیوں کی ذمہ داریاں بھی قبول کر لیں۔

سوڈان سے اسامہ بن لادن کی واپسی کے بعد ان کی نگرانی میں چلنے والے کیمپوں کو اپ ڈیٹ کیا گیا جبکہ فکری مبلغین نے اس عرصہ کے دوران تیرہ کتابوں پر مشتمل ایک جہادی کورس تربیت دے کر پوری دنیا میں پھیلا دیا۔ اس دوران خوست میں امریکیوں نے اسامہ بن لادن کو ہلاک کرنے کی کوشش کر کے ان پر نواز شریف دور میں میزائل کا حملہ کیا' تاہم وہ اپنے ساتھیوں سمیت بچ گئے۔ اس کے بعد ان کی سرگرمیوں میں انتہائی شدت دیکھنے کو ملی اور ان کے طالبان کے ساتھ تعلقات بھی ایک نئے دور میں داخل ہو گئے۔ بنیادی طور پر ان کے اور طالبان کے درمیان ابتداء میں اختلافات کے شواہد ملتے ہیں کیونکہ طالبان اسامہ بن لادن یا القاعدہ کے دوسرے لیڈروں کو کٹر وہابی قرار دے کر ان کی مخالفت کر رہے تھے جبکہ وہ ان کو طالبان کے بجائے ان افغان مجاہدین خصوصاً گلبدین حکمت یار اور یونس خالص کے بھی ہمدرد سمجھ رہے تھے جن کے کردار اور پالیسیوں پر طالبان کو خود تحفظات کا

سامنا تھا۔ دوسری طرف اسامہ بن لادن اور ان کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ طالبان کو امریکہ اور پاکستان کے خفیہ اداروں کی معاونت اور گائیڈ لائن حاصل ہے۔ اس کے باوجود ستمبر 1996ء کے بعد القاعدہ اور طالبان کے قریبی تعلقات کی ایسی ابتداء ہوئی جس نے بعد میں اتحاد کی نئی مثال قائم کر دی۔ اس تمام عرصہ کے دوران افغانستان کے اندر اسامہ بن لادن کو جن قریبی ساتھیوں کی مشاورت اور معاونت حاصل رہی ان میں سید امام شریف' ایمن الظواہری' محمد عاطف اور ابو زبیدہ سرفہرست تھے۔ ان کے قریبی ساتھیوں میں جن ممالک کے لوگ شامل تھے' ان میں مصر' سوڈان' شام' عراق اور فلسطین شامل ہیں۔

نامور صحافی رحیم اللہ یوسفزئی کے مطابق اسامہ بن لادن کے ساتھیوں کی تعداد سال 1988ء کے دوران 1900 تھی۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اسامہ بن لادن 1982ء ہی سے ایک بڑی اور جدید جہادی تنظیم کا ارادہ کیے ہوئے تھے اور اس سلسلے میں باقاعدہ نظریات اور خدوخال کا اعلان انہوں نے 1998ء کو خوست میں اپنی بلائی گئی پریس کانفرنس کے دوران عیسائیوں اور یہودیوں کو بدترین دشمن قرار دینے اور ان کے خلاف انفرادی تنظیمی اور اجتماعی کارروائیوں کو لازم قرار دینے کے دو بڑے نکات کی صورت میں کر دیا۔ طالبان نامی کتاب کے مصنف جناب احمد رشید کے مطابق اسامہ بن لادن نے 23 فروری 1998ء کو خوست والی پریس کانفرنس کے دوران انٹرنیشنل اسلامک فرنٹ کے قیام کا مقصد یہودیوں اور عیسائیوں کو ہر صورت میں ٹارگٹ بنانے اور ان کے خلاف جنگ لڑنے کا ایجنڈا بتایا جبکہ اس پریس کانفرنس سے قبل منعقد کیے گئے ایک اہم اجلاس کے دوران ایک باقاعدہ فتویٰ جاری کیا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ امریکیوں اور ان کے اتحادیوں کو قتل کرنا ہر مسلمان پر انفرادی اور اجتماعی طور پر فرض ہے۔ اس اجلاس' اعلان اور فتوے کے چند ماہ بعد جب اگست 1998ء کو کینیا اور تنزانیہ میں موجود امریکی سفارتخانوں پر منظم حملے کرتے ہوئے 220 سے زائد افراد کو ہلاک کیا گیا تو اس کی ذمہ داری اسامہ بن لادن ہی پر ڈال دی گئی اور ان واقعات سے دس پندرہ روز بعد امریکہ نے اسامہ اور ان کے ساتھیوں کو کروز میزائلز کے ذریعے ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ اس برس نومبر کو امریکہ نے اسامہ بن لادن کی ہلاکت یا گرفتاری کے لیے پانچ ملین ڈالر کے انعام کا اعلان کر دیا جہاں سے فریقین کے درمیان براہ راست تصادم اور

کشیدگی کے ایک نئے مگر خطرناک سلسلے کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

اسامہ بن لادن پر امریکہ نے نیو یارک کی ایک عدالت میں ان واقعات کے علاوہ تقریباً نصف درجن دوسرے حملوں کے ملزم کے طور کے پر مقدمہ قائم کیا اور بعدازاں اسی مقدمے کی بنیاد پر افغانستان کی طالبان حکومت سے ان کی سپردگی کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے امریکہ نے پاکستان اور سعودی عرب کے مختلف افراد اور اداروں کی خدمات بھی حاصل کیں۔ تاہم طالبان اسامہ بن لادن کی حوالگی پر آمادہ نہیں ہوئے۔ امریکہ نے 18 دسمبر 1998ء کو وزیراعظم پاکستان نواز شریف کے دورہ واشنگٹن کے دوران ان سے مطالبہ کیا کہ وہ خود اس معاملے میں دلچسپی لے کر امریکیوں کی مدد کریں مگر پاکستان کے بااثر ادارے ایسی کسی مہم کی مخالفت کرتے رہے۔

اس سے قبل امریکیوں نے شہزادہ ترکی الفیصل کو بھی طالبان کو اس بات پر آمادہ کرنے 25 اگست 1998ء کو قندھار بھیجا تھا کہ وہ (طالبان) بن لادن کو امریکہ کے حوالے کر دیں۔ موصوف اس سے صرف ایک ماہ قبل یعنی جولائی میں قندھار کا دورہ کر کے اسامہ بن لادن اور ملا عمر سے تفصیلی ملاقاتیں کر چکے تھے۔ ان ملاقاتوں کے بعد ترکی الفیصل نے طالبان اور القاعدہ کے لیے دبئی کے راستے 400 گاڑیوں کا تحفہ بھی بھیجا تھا۔ بہرحال ملا عمر نے حوالگی سے انکار کر دیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سعودی عرب نے عملاً طالبان حکومت کے ساتھ اپنے سفارتی تعلقات معطل یا ختم کر دیئے۔ ذرائع کے مطابق اس وقت بھی طالبان لیڈرشپ نے یہ کہہ کر بن لادن کی حوالگی سے انکار کر دیا تھا کہ افغان اپنے مہمانوں کو دشمن کے حوالے نہیں کرتے۔ 2008ء کے امریکی حملے سے قبل بھی طالبان نے یہی موقف اپنا کر اپنے لیے جنگ مسلط کرنے کی راہ ہموار کی تھی۔

شہزادہ ترکی الفیصل کے ناکام دورے اور طالبان کے انکار کے بعد امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے سال 1998ء کے دسمبر میں ملا عمر اور دوسرے اعلیٰ طالبان کمانڈروں کے ساتھ سیٹلائٹ فونز کے ذریعے براہ راست رابطوں کا آغاز کر دیا۔ ان رابطوں کے دوران امریکہ کا اصرار تھا کہ طالبان حکومت اسامہ بن لادن کو امریکیوں کے حوالے کر دیں۔ بعض ذرائع کے مطابق امریکیوں نے ملا عمر کے ساتھ ایک ٹیلی فون رابطے کے دوران ان کو یہ بھی

یقین دلایا تھا کہ اگر اسامہ بن لادن کی حوالگی میں سنجیدہ ہونے کا ارادہ کر لیں تو امریکہ طالبان حکومت کو بن لادن کے خلاف بعض ایسے ثبوت فراہم کرنے پر بھی غور کرے گا جن سے بن لادن کا ان حملوں میں ملوث ہونے کے دعوے درست ثابت ہوں گے۔ امریکیوں نے جنوری 1999ء کے اپنے آخری براہ راست رابطے کے دوران طالبان کو کھلی دھمکی دے دی کہ وہ یا تو اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کر دیں یا جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ اس دھمکی کے بعد طالبان کے رویئے میں کافی نرمی دیکھنے کو ملی اور انہوں نے سیکنڈ کمانڈ کی سطح پر القاعدہ چیف کو افغانستان اور طالبان کے لیے ایک خطرہ قرار دے دیا۔ تاہم ملا عمر اور چند دوسرے اہم لیڈروں کا موقف تھا کہ امریکی بن لادن کی حوالگی کے باوجود بعض دوسرے اسباب کے باعث افغانستان پر حملہ کرنے کا ارادہ کیے ہوئے ہے۔ اس لیے درست اقدام یہ ہوگا کہ اسامہ بن لادن کو بطور مہمان حسب معمول افغانستان میں رہنے دیا جائے۔ اس عرصہ کے دوران یہ اطلاعات بھی ملنی شروع ہوگئیں کہ طالبان نے نہ صرف بن لادن کو نقل و حرکت اور دوسری معمول کی سرگرمیوں سے منع کر دیا بلکہ ان پر بعض پابندیاں بھی عائد کر دی ہیں۔ کابل میں یہ تصور بھی بہت عام رہا ہے کہ ملا عمر سمیت طالبان لیڈرز نے اسامہ بن لادن کو جنوری 1999ء کو افغانستان سے نکلنے کا مشورہ دیا تھا مگر اس پلان کو پاکستان کے ایک بااثر ادارے کے تین افسران کے دورہ قندھار کے باعث عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔

اس تمام گیم کے دوران دوسرے ممالک میں موجود القاعدہ کے ترجمان اور لیڈرز امریکہ کو مسلسل دھمکیاں دینے میں مصروف رہے جبکہ مرکزی ترجمان سمیت متعدد نے مقبول عام تبصروں یا موقف کے برعکس امریکیوں پر حملہ کی ذمہ داریاں بھی قبول کی تھیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ القاعدہ ان حملوں میں ملوث تھی یا نہیں امریکہ کے لیے اسامہ بن لادن اور ملا عمر جیسے لوگوں کی مزاحمت ایک سپر پاورز کی حیثیت سے برداشت کرنا یقیناً ایک ناممکن کام بن گیا تھا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ عربوں نے القاعدہ کی صورت میں مالی اور عسکری شکل میں طالبان حکومت کی اتنی مدد کی تھی کہ طالبان اس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ احسان مندی کی لپیٹ میں آ چکے تھے بلکہ ان کے لیے ریاستی معاملات چلانے کے لیے مستقبل کے حوالے سے بھی القاعدہ کی موجودگی اور معاونت ناگزیر صورت اختیار کر گئی تھی۔ بعض مبصرین کا یہ بھی

خیال ہے کہ القاعدہ نے ایک طرح سے طالبان کی لیڈر شپ اور پالیسیوں کو یرغمال بنایا ہوا تھا اور بن لادن کی حوالگی کے معاملے پر ملا عمر سمیت سب عملاً بے بس تھے۔ ان تمام دلائل سے قطع نظر جب نائن الیون کا سانحہ رونما ہو گیا اور القاعدہ نے اس کی ذمہ داری بھی قبول کر لی تو اس بات میں کوئی شک ہی نہیں رہا کہ اب فریقین کے درمیان لگنے والے میدان میں نہ صرف یہ کہ افغانستان کو ایک اور تباہی سے دوچار ہونا پڑے گا بلکہ اس کی آڑ میں قریبی ممالک اور جہاد کے حامیوں کو بھی ایک نئی آزمائش کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پاکستان چونکہ جہادیوں کا بہت بڑا حامی رہا تھا' اس لیے نائن الیون کے بعد فال آف طالبان کی صورت میں اس ریاست کے جہادی اتحادی یا ساتھی زندگی بچانے یا جہاد کے سلسلے کو مناسب وقت پر جاری رکھنے کے لیے پاکستان ہی کا رخ کرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد اپنے ہی سابق اتحادی پاکستان ہی پر جھپٹ پڑے کیونکہ اب پاکستان ہی ان کے لیے موزوں ترین ملک ثابت ہو سکتا تھا اور یہ امریکہ کا اتحادی ہونے کے باعث اسامہ بن لادن کے اس ایجنڈے اور فتوے کی شرائط پر بھی پورا اتر رہا تھا جو کہ انہوں نے فروری 1998ء کو خوست پہنچ کر اپنی پریس کانفرنس کے دوران امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے ساتھ کھلی جنگ کے اعلان کے طور پر جاری کر دیا تھا۔

القاعدہ اور امریکہ کے درمیان جاری کشمکش اور کشیدگی کے اس تمام پس منظر کے دوران پاکستان کا کردار بہت عجیب اور مشکوک قسم کا رہا ہے۔ اس سلسلے میں کسی لمبی بحث سے قطع نظر یہ مثال ہی کافی ہوگی کہ پاکستان بیک وقت امریکہ کا اتحادی بھی رہا اور القاعدہ کے ساتھ بھی اس کے رابطے رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ کو ہی ایسی تنظیموں کے قیام اور حوصلہ افزائی کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے اور اپنے ملک کی سلامتی اور اپنے مفادات کے تحفظ جیسے بنیادی ایشو پر امریکیوں میں کسی قسم کی فکری یا سیاسی تقسیم نہیں۔ امریکہ اپنے مفادات کو سامنے رکھ کر جس کو دشمن قرار دیتا ہے تو پھر اپنے مقاصد کی تکمیل تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا بلکہ اس کے بالمقابل پاکستان کچھ ایسی پالیسیوں اور پیچیدگیوں کا شکار رہا کہ اس قسم کے معاملات میں نہ صرف یہ کہ اس کے سابق اتحادی وقتاً فوقتاً اس کے مخالف ہو کر اس پر حملہ آور ہوتے رہے بلکہ ریاستی اتحادی بھی اس کے کردار کو انتہائی شک کی نظر سے دیکھتے رہے۔ اس

سلسلے میں ہم بھارت اور افغانستان کے علاوہ چین اور ایران جیسے دوست ممالک کی مثال دے سکتے ہیں جن کی طرف سے الزامات سامنے آتے رہے کہ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں ان کے دشمن تنظیموں کے خلاف نہ صرف یہ کہ اقدامات سے گریز کیا جا رہا ہے بلکہ ان کو فاٹا میں ٹھکانے بھی فراہم کیے جا رہے ہیں۔ اس ضمن میں چینی سنٹرل ایشین جنگجوؤں کے خاتمے یا حوالگی کا بار بار مطالبہ کرتے دیکھے جاتے رہے۔اکتوبر 2009ء کے دوران ایران کے ایک علاقے میں پاسداران ایران پر جند اللہ کی جانب سے حملہ کر کے درجنوں افراد کو مارا گیا تو ایران نے چند ہی منٹوں کے اندر نہ صرف پاکستان پر الزامات لگائے بلکہ ایرانی صدر' وزیر خارجہ' وزیر داخلہ اور سفیر نے پاکستانی حکمرانوں سے چند ہی گھنٹوں کے اندر اپنے شدید تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے کھلے عام کہا کہ جند اللہ کی قیادت پاکستان میں ہے اور پاکستانی حکومت ان کو ایران کے حوالے کر دے۔

عالمی تعلقات کے مروجہ فارمولوں کے تناظر میں دیکھا جائے تو پاکستان اپنی پالیسیوں کے باعث علاقائی اور عالمی طاقتوں اور ریاستوں کے محاصرے میں آ چکا ہے جبکہ اس سے بھی بڑی خطرناک بات یہ ہے کہ جن جہادی تنظیموں اور لیڈروں پر پاکستان نے زبردست قسم کی سرمایہ کاری کر کے ان کی خاطر پڑوسیوں اور عالمی طاقتوں کی ناراضگی مول لی تھی' وہی قوتیں اب مکمل قوت کی صورت میں پاکستانی ریاست کے خلاف صف آرا ہو کر اس کے خلاف پاکستان کے اندر ایک بدترین جنگ لڑنے میں مصروف ہیں۔ جہاں تک اس خوش فہمی کا تعلق ہے کہ افغانی یا پاکستانی طالبان پاکستان کے حامی ہیں یا اس کا استحکام چاہتے ہیں' اس کو محض ایک خواہش یا خودفریبی کے سوا دوسرا کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

کون نہیں جانتا کہ طالبان جہادیوں کے اس عالمی نیٹ ورک اور ڈسپلن کا حصہ ہیں جس کی قیادت القاعدہ کے ہاتھوں میں ہے جبکہ اسامہ اور ایمن الظواہری سمیت متعدد دوسرے ٹاپ لیڈرز متعدد بار پاکستان کو امریکہ کا اتحادی قرار دے کر اس کے خلاف کارروائیوں کی دھمکیاں دے چکے ہیں اور یہ دھمکیاں کئی اقدامات کی صورت میں عملی طور پر ظاہر ہوتے بھی دیکھی جا چکی ہیں۔ اس بات کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ ہر طالب جنگجو شیخ اسامہ کو اپنا فکری اور تنظیمی رہبر مانتا ہے اور اس کا حلف بھی اٹھاتا ہے جو لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ملا

عمر یا دوسرے افغان رہنما پاکستانی طالبان کی جانب سے اس ملک کے خلاف کارروائیوں کی مخالفت کر رہے ہیں۔ وہ خود ساختہ کہانیاں سنانے اور اندازے لگانے کے بجائے ملا عمر کا کوئی ایک بھی ایسا باضابطہ بیان بطور مثال پیش نہیں کر سکتے جس میں انہوں نے پاکستانی طالبان کو ایسا کرنے سے منع کیا ہو۔ زمینی حقائق یہی ہیں کہ افغانستان کے طالبان اور القاعدہ نہ صرف یہ کہ پاکستان سے بے وفائی اور غداری کا شکوہ کرتے ہیں بلکہ عملاً وہ پاکستانی طالبان یا جہادیوں کو ناراض کرنے کا رسک بھی نہیں لے سکتے کیونکہ یہ لوگ القاعدہ اور افغان طالبان کی ضرورت بن گئے ہیں۔

❁ ❁ ❁ ❁

گڈ اور بیڈ طالبان

پاکستانی سکیورٹی فورسز نے 17 اکتوبر 2009ء کو طالبان اور دوسرے جہادی گروپوں کے مضبوط ترین گڑھ بلکہ ان کے خود ساختہ ''اسلامی امارات آف طالبان'' کے دارالخلافہ جنوبی وزیرستان کی طرف پیش قدمی شروع کی تو اس اقدام پر ساری دنیا کی نگاہیں مرکوز ہوگئیں کیونکہ وزیرستان سے طالبان کا خاتمہ نہ صرف پاکستان کے پرامن شہریوں کا اہم مطالبہ بن گیا تھا بلکہ عالمی قوتیں خصوصاً امریکہ اور برطانیہ بھی وزیرستان سے طالبان کا صفایا کرنے میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی تھیں۔ فورسز اور حکومت کی موجودگی یا عملداری اسی علاقے میں عملاً سال 03-2002ء کے بعد ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ پاکستانی خفیہ اداروں اور اسٹیبلشمنٹ کی وہ خطرناک پالیسی تھی جو کہ انہوں نے فال آف طالبان کے بعد غیر ملکی اور دوسری جہادی قوتوں کو پاکستان میں محفوظ ٹھکانے فراہم کرنے کی غرض سے اپنائی ہوئی تھی۔ اس پالیسی کا واضح مقصد یہ تھا کہ ان قوتوں کو اپنے ہاتھ میں رکھ کر ان کی طاقت اور موجودگی کو بوقت ضرورت افغانستان، بھارت اور یہاں تک کہ امریکہ کے خلاف استعمال کرنے کے لیے محفوظ رکھا جائے۔ یہ الگ بات کہ یہ پالیسی بعد کے حالات میں پاکستان کو بہت مہنگی پڑی اور اس کی قیمت بھی ریاست وحکومت کو ادا کرنا پڑی۔

فال آف طالبان کے بعد القاعدہ سمیت دوسری غیر ملکی تنظیموں کے جو کمانڈر اور جنگجو ہزاروں کی تعداد میں افغانستان کی سرحد پار کر کے پاکستان کے جن علاقوں میں داخل ہوئے ان میں شمالی اور جنوبی وزیرستان پر مشتمل دو قبائلی ایجنسیاں سرفہرست تھیں۔ انہیں دو

ایجنسیوں میں مقامی محسود طالبان گروپوں کے علاوہ مشہور زمانہ حقانی گروپ کی بھرپور معاونت اور سرپرستی حاصل ہوئی۔ ان دو ایجنسیوں کے علاوہ دوسری ایجنسیوں خصوصاً کرم، اورکزئی اور باجوڑ میں بھی غیرملکی عسکریت پسندوں کو نہ صرف یہ کہ ٹھکانے فراہم کیے گئے بلکہ 2005-06ء کے بعد ان کو مخالفین خصوصاً ان پاکستانی فورسز کے خلاف متعدد بار لڑایا بھی گیا جنہوں نے اپنی اعلیٰ قیادت کے فیصلے کے مطابق وزیرستان کی دو ایجنسیوں کو مکمل طور پر طالبان اور ان کے اتحادیوں کے حوالے کر دیا تھا اور وہ اس حکمرانی کو اور وسعت دینے میں مصروف تھے۔ لہٰذا جب طالبان اور ان کے اتحادیوں نے عملاً ان علاقوں کو اپنی ریاست میں تبدیل کر لیا تو یہ لوگ نہ صرف یہ کہ وہاں اپنے سخت گیر مذہبی فلسفے کی بنیاد پر ریاستی معاملات چلاتے رہے بلکہ وہ سزائے موت، سنگسار اور ذبح کرنے جیسے انتہائی اقدامات سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کی موجودگی میں مرد یا عورت کی تفریق کیے بغیر درجنوں افراد کو موت کی سزائیں دی گئیں اور عملاً اس علاقے کے اندر دنیا کی ایک ایسی ریاست کا قیام عمل میں لایا گیا جو کہ بظاہر تو پاکستان نامی ملک کی سرحدوں کے اندر ہی واقع تھی مگر وہاں کا سسٹم انتہاپسند مذہبی جنونیوں کے ہاتھ میں تھا لیکن حیرت کی بات تو یہ تھی کہ پاکستان کے سیاسی اور عسکری ادارے برسوں تک اس خطرناک سلسلے پر آنکھوں اور کان بند کر کے خاموش بیٹھے رہے۔ حالانکہ طالبان اس تمام عرصہ کے دوران پاکستانی فورسز پر وقتاً فوقتاً حملے کر کے ان کو بھاری جانی، مالی نقصان بھی پہنچاتے رہے۔ تاہم ان کے خلاف چھوٹے موٹے آپریشنز اور برائے نام کارروائی کے علاوہ سنجیدگی سے کوئی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سال 2007ء کے وسط کے بعد طالبان یا ان کے اتحادی محض وزیرستان یا فاٹا تک تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ واقعہ لال مسجد کے بعد ان کی سرگرمیاں صوبہ سرحد کے بندوبستی علاقوں اور اس کے بعد پورے پاکستان تک پھیلنی شروع ہوگئیں۔ یوں یہ لوگ پاکستانی جہادی منصوبہ سازوں کے اندازوں کے برعکس پاکستان کی سلامتی کے لیے واقعتاً ایک بڑا خطرہ بنتے چلے گئے۔

سال 2009ء اکتوبر کے مہینے میں وزیرستان کے خلاف شروع کی جانے والی کارروائی سے قبل وہاں پر دو قسم کے اقدامات کرنے پر توجہ دی گئی۔ پہلے قدم کے طور پر بیت

اللہ محسود گروپ کے خلاف مقامی سطح پر دوسرے گروپوں اور قومی لشکروں کی تشکیل کی کوششیں کی گئیں جبکہ دوسرے مرحلے میں جنوبی وزیرستان کا دو ماہ سے زائد کے عرصہ تک محاصرہ کیا گیا۔ پہلا تجربہ حکومت کے حمایت یافتہ گروپوں کے کمزور افرادی قوت اور عوام کی طرف سے لشکروں کی تشکیل سے معذرت کی صورت میں ناکام ہو گیا جبکہ دوسرے تجربے یا مرحلے کے بارے میں کہا گیا کہ اس کے باعث طالبان خصوصاً خودکش حملہ آوروں کی دوسرے علاقوں کی طرف منتقلی اور نقل و حرکت کو مشکل بنایا گیا۔ حالانکہ اس دعوے کے باوجود بیت اللہ کی ہلاکت کے بعد ستمبر اور اکتوبر کے مہینے پورے پاکستان خصوصاً اسلام آباد اور پشاور جیسے شہروں پر بہت مشکل گزرے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ محاصرے یا آپریشن کے فیصلے میں اتنی تاخیر کی جا چکی تھی کہ خودکش حملہ آوروں سمیت ہزاروں طالبان مختلف پہاڑی راستے استعمال کر کے دوسری ایجنسیوں خصوصاً اورکزئی اور کرم میں منتقل ہو چکے تھے۔

عین اسی دوران جے یو آئی (ف) کے ذریعے بعض حکومتی اور عسکری اداروں نے جولائی 2009ء کے آخری ایام میں بیت اللہ محسود کے ساتھ ایک اور معاہدے کی کوششیں بھی کیں' تاہم یہ کوششیں اے این پی' پی پی پی اور ایم کیو ایم کی مخالفت اور اس کے بعد بیت اللہ کی ہلاکت کے باعث ناکامی سے دوچار ہو گئیں۔

17 اکتوبر 2009ء کے آپریشن راہ نجات سے قبل فضائیہ کے ذریعے کئی ہفتوں تک جنوبی وزیرستان میں موجود طالبان کے ٹھکانوں کو نشانہ بنایا جاتا رہا' تاہم طالبان اپنی کارروائیوں میں کوئی کمی نہیں لائے۔ فورسز نے فیصلہ کن آپریشن کے نام سے کارروائی کا آغاز کیا تو دنیا پر واضح ہو گیا کہ طالبان کے اعلیٰ لیڈر اور کمانڈروں کے علاوہ اکثریتی جنگجو بھی فوج کے داخلے سے قبل دوسری علاقوں کو منتقل ہو چکے تھے۔ جن علاقوں کے نام لیے گئے۔ ان میں شمالی وزیرستان' کرم اور اورکزئی کی ایجنسیوں کے علاوہ جنوبی وزیرستان سے کچھ ہی فاصلے پر واقع صوبہ بلوچستان کے وہ علاقے سرفہرست ہیں جہاں نہ تو عام آبادی ہے' نہ فورسز کی کوئی قابل ذکر موجودگی اور نہ ہی حکومتی رٹ کا کوئی مظہر۔ وزیرستان یا ٹانک سے شروع ہونے والے بلوچستان کے یہ علاقے ضلع ژوب کی آبادی والے علاقے کے درمیان دس سے پندرہ گھنٹوں کی مسافت پر مشتمل ہیں۔ یہ علاقے سنگلاخ اور پیچیدہ پہاڑی سلسلوں

پر مشتمل ہیں اور اس میں کوہ سلیمان کا مشہور زمانہ سلسلہ بھی شامل ہے جن لوگوں کو اس علاقے کی ساخت اور پہاڑی راستوں کا علم ہے وہ جانتے ہیں کہ اس پیچیدہ اور طویل ترین سلسلے میں حکومت تو کیا انسانی معاشرہ بھی نہیں پایا جاتا۔ اگر طالبان یہاں منتقل ہو گئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے صرف یہ کہ پہلے سے بہت زبردست ہوم ورم کیا ہوا تھا بلکہ وہ اپنے اگلے ہدف کے طور پر دو مختلف ٹریکس کے ذریعے بلوچستان کے مختلف علاقوں کو بھی انتہائی آسانی کے ساتھ نشانہ بنا سکتے ہیں اور اس کے بعد بلوچستان کے متعدد پشتون علاقوں کے علاوہ ملک کے کئی دوسرے علاقے بھی مستقبل میں طالبانائزیشن کی عملی کارروائیوں کی زد میں آسکتے ہیں۔

بعض اطلاعات کے مطابق کوہ سلیمان پر القاعدہ کے جنگی اور جغرافیائی ماہرین نے 90 کی دہائی میں ہی اس کی اہمیت کے حوالے سے زبردست قسم کا ہوم ورک کر لیا تھا جس کے بعد القاعدہ کی پلاننگ میں اس علاقے کو اپنے زیر کنٹرول لانا بہت اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ اس تحقیقی کام کے جو خدوخال یا بڑے نکات سامنے آئے تھے اس کی بنیاد یہ تھی کہ یہ علاقہ نہ صرف محفوظ ترین ٹھکانے کے طور پر زیر استعمال لایا جا سکتا ہے بلکہ اس سے افغانستان کے متعدد علاقوں کے علاوہ فاٹا' بلوچستان اور پنجاب کے سرحدی علاقوں کو بھی آسانی کے ساتھ ٹارگٹ بنایا جا سکتا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ پاکستانی فورسز نے شمال کی طرف سے تو اپنی موجودگی پر توجہ دی' تاہم جنوب میں واقع اس علاقے کو بری طرح نظرانداز کیے رکھا اور اسی غلطی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وزیرستان آپریشن کے آغاز سے قبل طالبان محفوظ اور طے شدہ راستوں کے ذریعے بڑی تعداد میں اس جانب بھی نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

متعدد سروے رپورٹس' ماہرین کی رائے اور خود ریاستی اداروں کے محتاط اعداد و شمار کے مطابق وزیرستان میں تین سے لے کر پانچ ہزار تک غیر ملکیوں سمیت 20 ہزار سے زائد جنگجو موجود تھے۔ تاہم 7 نومبر سے لے کر 10 نومبر تک کی آئی ایس پی آر کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق ہلاک کیے جانے والوں کی تعداد 1500 کی حد بھی عبور نہیں کر سکی تھی۔ حالانکہ 2 نومبر کو جاری کردہ ایک بیان میں وفاقی وزیر داخلہ رحمان ملک کا کہنا تھا کہ وزیرستان میں موجود صرف غیر ملکیوں کی تعداد تین ہزار سے زائد ہے۔ بعض اخبارات نے

ان سے منسوب اس بیان میں غیر ملکیوں کی تعداد پانچ ہزار رپورٹ کی تھی۔

بہر حال اس کے بعد سب سے بڑا سوال یہ اٹھایا جانے لگا کہ آخر ہزاروں خودکش حملہ آوروں اور جنگجوؤں پر مشتمل اس گروپ (ٹی ٹی پی) کے لوگ گئے تو کہاں گئے کیونکہ آئی ایس پی آر کی مصدقہ اطلاعات اور وزیرستان کا دورہ کرنے والی میڈیا ٹیموں کے مطابق فورسز نے 5 نومبر تک نہ صرف یہ کہ پہلے مرحلے کی تکمیل تک جنوبی وزیرستان کے اکثر یتی علاقوں پر قبضہ کرلیا تھا بلکہ طالبان کے متعدد بڑے بڑے مراکز' سارارو غہ اور لدھا کو بھی کلیئر کر دیا تھا۔ تاہم اس دوران یہ الزام بھی لگایا گیا کہ فورسز کی جانب سے ہلاک شدگان کے جو اعداد و شمار بتائے جا رہے ہیں حقیقتاً ان میں مبالغہ آرائی سے کام لیا جاتا ہے جبکہ ہلاک شدگان میں عام لوگ بھی شامل ہیں۔

اس تمام صورتحال کو سامنے رکھ کر یہ بات بڑی حد تک حقائق کی بنیاد پر ثابت ہوگئی کہ عسکریت پسند آپریشن سے قبل دوسرے علاقوں میں منتقل ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے اور وہ مستقبل میں مزید مسائل کا سبب بن سکتے ہیں۔ چنانچہ بعض دفاعی تجزیہ نگاروں نے اس صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے آپریشن کی تیاریوں اور منصوبہ بندی پر خدشات کا اظہار کرنا شروع کیا اور شاید اسی نقطہ نظر کا احساس کرتے ہوئے ہی ڈی جی آئی ایس پی آر میجر جنرل اطہر عباس کے علاوہ وزیر دفاع احمد مختار نے 5 نومبر کے روز ایک ٹاک شو کے دوران یہ عندیہ دیا کہ جنوبی وزیرستان کو کلیئر کرنے کے بعد طالبان کا پیچھا کرتے ہوئے شمالی وزیرستان میں بھی فوجی کارروائی کی ابتداء کی جائے گی۔ اگر ان اطلاعات کو درست مان لیا جاتا ہے کہ عسکریت پسند دوسرے علاقوں میں منتقل ہو چکے ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فورسز اور دوسرے اداروں نے آپریشن کو فیصلہ کن بنانے کے لیے پہلے سے ان علاقوں کی سکیورٹی کیوں نہیں بڑھائی جن کی سرحدیں جنوبی وزیرستان سے ملتی ہیں؟ لیکن اس کے جواب میں جو دلائل دیئے گئے ان میں ایک خدشہ یہ بھی موجود تھا کہ فوج کی اعلیٰ قیادت اس آپریشن کا جلد از جلد خاتمہ کرکے عالمی اتحادیوں خصوصاً امریکیوں کو یہ تاثر نہیں دینا چاہتی تھی کہ وزیرستان کے طالبان کو جان بوجھ کر برداشت کرنا اور موجود رکھنا پاکستانی اداروں کی کوئی پالیسی تھی ورنہ جب پاکستانی فورسز نے پیش قدمی کی تو چند ہی ہفتوں میں ان کا صفایا کر دیا

گیا۔ فوجی حکام کے مطابق وزیرستان کو عملاً طالبان سے آزاد کرانا اور وہاں پر فورسز اور دوسرے اداروں کو اندر داخل کر کے قیام کے مقامات فراہم کرنا ان کی ترجیحات میں سرفہرست اقدام تھا۔ ان کے بقول پہلے مرحلے کے طور پر طالبان کے بڑے مراکز پر کنٹرول حاصل کرنا اس لیے ضروری تھا کہ عوام کو تحفظ کا احساس دلانے کے علاوہ فوج کے محفوظ قیام اور نقل و حرکت کو ممکن بنایا جائے۔

اس صورتحال کے تناظر میں سکیورٹی فورسز اور حکومت کی حکمت عملی کو اس حوالے سے بھی تنقید کا نشانہ بننا پڑا کہ اگر ریاستی قوتیں واقعتاً طالبان اور ان کے غیر ملکی اتحادیوں کا خاتمہ کرنے میں سنجیدہ ہیں تو اس شمالی وزیرستان کو کیوں محفوظ رکھتے ہوئے نشانہ نہیں بنایا گیا جس کو غیر ملکیوں کے محفوظ ترین ٹھکانے کی شہرت حاصل ہے اور اسی شہرت کا پیچھا کرتے ہوئے سال 2004ء سے لے کر سال 2009ء تک شمالی وزیرستان کو سب سے زیادہ ڈرون حملوں کا نشانہ بنایا گیا اور اس سلسلے کے دوران 5 نومبر کی رات کو شمالی وزیرستان کے ہیڈ کوارٹر میر علی کو جنوبی وزیرستان آپریشن کی پیش رفت اور کامیابی کے باوجود ایک ڈرون حملے کا نشانہ بناتے ہوئے چھ افراد کو ہلاک کر دیا گیا۔

بعض تجزیہ نگاروں کا کہنا تھا کہ شمالی وزیرستان کو نظرانداز کر کے وہاں غیر ملکیوں کے قیام کو تحفظ فراہم کرنا جہاں آپریشن کے مقاصد کو مشکوک بنانے کا سبب بن رہا ہے وہاں اس پالیسی سے پاک امریکہ تعلقات کے حوالے سے مزید نئی پیچیدگیاں بھی پیدا ہوں گی۔ اس سلسلے میں بعض باخبر تبصرہ نگار یا دفاعی ماہرین کا کہنا تھا کہ پاکستانی ریاستی ادارے اب بھی گڈ اور بیڈ طالبان کے ایک فارمولے کو آگے بڑھانے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ چونکہ شمالی وزیرستان میں ملا نذیر یا گل بہادر گروپ کی صورت میں پاکستان کے حامی طالبان کمانڈروں کا ہولڈ ہے اس لیے پاکستانی فورسز غیر ملکیوں کی موجودگی کے باوجود اپنے ان حامیوں کا خیال رکھتے ہوئے شمالی وزیرستان کو نظرانداز کر رہی ہیں۔ حالانکہ اس حقیقت کو بظاہر نظرانداز نہیں کیا جانا چاہیے کہ بیت اللہ کی موجودگی میں جب 2009ء کی پہلی سہ ماہی کے دوران پاکستانی فورز کا ایک کانوائے شمالی وزیرستان کے راستے جنوبی وزیرستان میں داخل ہونے جا رہا تھا تو شمالی وزیرستان میں اس کو خودکش حملے کا نشانہ بنایا گیا جس کے نتیجے

میں دو درجن سے زائد فوجیوں کو زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔ بعض رپورٹس میں مرنے والوں کی تعداد 50 سے زائد بتائی گئی تھی۔ اس حملے میں گڈ طالبان ہی کے ملوث ہونے کے شواہد بھی ملے تھے کیونکہ گڈ اور بیڈ طالبان کے درمیان اس واقعے سے کچھ عرصہ قبل بعض اختلافات کے باوجود یہ طے پایا تھا کہ فریقین پاکستانی فورسز کی جانب سے دونوں ایجنسیوں میں داخلے کی مزاحمت کریں گے جس کے جواب میں پاکستانی متعلقہ حکام رابطے پر بتاتے رہے کہ فورسز کے لیے بیک وقت چونکہ دونوں ایجنسیوں میں کارروائیاں کرنا ایک مشکل کام تھا۔ اس لیے پہلے مرحلے کے دوران جنوبی وزیرستان ہی کو ٹارگٹ بنایا گیا کیونکہ وہاں سے ریاستی' اداروں اورعوام پر حملے بڑھتے جارہے تھے۔ ان حکام کا موقف تھا کہ شمالی وزیرستان کے طالبان گروپس بیت اللہ گروپ کے مقابلے میں پرامن اور اپنے علاقوں تک محدود ہیں اور وہ غیر ملکیوں کو بھی محدود کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کو دوسرے آپشن کے طور پر رکھتے ہوئے چھیڑنے سے گریز کیا گیا۔ دوسری طرف بعض تبصرہ نگاروں کا یہ دعویٰ بھی سامنے آیا کہ اکتوبر 2009ء کے دوران شمالی وزیرستان کے طالبان گروپوں اور فورسز کے درمیان مصالحت پر مبنی ایک غیر اعلانیہ معاہدہ بھی ہوا تھا جس کے رو سے فورسز نے آپریشن نہ کرنے اور طالبان نے پرامن رہنے اور غیر ملکیوں کو نکالنے پر مشتمل شرائط پر اتفاق رائے کیا تھا۔ شمالی وزیرستان میں آپریشن کرنے کے علاوہ اس سلسلے کو دوسری ایجنسیوں اور علاقوں تک کسی وقفے کے بغیر پھیلانے کی ضرورت کو اسی حوالے سے نظرانداز کرنا ممکن نہیں کہ طالبان(پاکستانی) افغان طالبان اور القاعدہ کے باقاعدہ اتحادی ہیں اور ان کے ماضی کو مدنظر رکھ کر ان پر مزید اعتماد کرنا یا ان کو گڈ طالبان قرار دینا بلاشبہ کسی بھی وقت پاکستانی ریاست کے لیے مشکلات کا سبب بن سکتا ہے۔ دیکھا جائے تو اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا کہ فال آف طالبان کے بعد لمبے عرصے تک سب عسکریت پسند پاکستان کے لیے گڈ طالبان ہی تھے اوران میں بیت اللہ محسود نامی وہ کمانڈر بھی شامل تھا جس نے بعد میں پالیسی بدل کر پاکستانی ریاست وحکومت کو دیوار سے لگا دیا۔ ان کے ساتھ رعایت کرنے یا ان کو دوسرے علاقوں میں جانے سے روکنے پرتوجہ نہ دینے سے قبل فورسز کو سوات کی مثال سامنے رکھنے کی ضرورت تھی جہاں سے آپریشن کے بعد ہزاروں کی تعداد میں طالبان اور ان

کے حامی صوبہ پختونخواہ کے مختلف علاقوں کے علاوہ قبائلی ایجنسیوں کا رخ کرنے لگے تھے۔ صوبائی وزارت داخلہ کو 5 نومبر 2009ء کی جاری کردہ ایک رپورٹ کے مطابق پولیس اور دوسرے اداروں نے صرف پشاور سے 495 مطلوب اور مشکوک افراد کو گرفتار کرکے ان کی تحویل سے ٹنوں کے حساب سے اسلحہ اور بارود برآمد کر لائی۔ سوال یہ ہے کہ صوبے کے دوسرے اضلاع سے کتنے افراد گرفتار کیے گئے اور ان سے کون سا کیسا اور کتنا گولہ بارود قبضے میں لیا گیا۔ اس بات پر دفاعی ماہرین اور تجزیہ نگاروں کے درمیان مکمل ہم آہنگی پائی جاتی رہی کہ عسکریت پسندوں کے خلاف کارروائیاں اب تک فارمولے کے تحت کسی ایک علاقے یا ایجنسی تک محدود کرنے کے اور بھی منفی اور خطرناک نتائج کا سبب بن جایا کرتے ہیں کیونکہ ایسی صورت میں وہ دوسرے علاقوں میں پھیل کر مزید تباہی کی وجہ بنتے ہیں۔ اس ضمن میں پاکستانی ریاست کو امریکہ اور دوسرے اتحادیوں کے شکوک و خدشات کے اثرات کو بھی مدنظر رکھنے کی ضرورت ہوگی کیونکہ یہ قوتیں بھی جاری پارٹنرشپ کے حوالے سے پاکستان میں ان کارروائیوں اور پالیسیوں سے خود کو الگ نہیں رکھ سکتیں اور وہ طالبان کے ساتھ غیر ملکی جنگجوؤں کا بھی خاتمہ چاہتی ہیں۔ چنانچہ پاکستانی حکومت' سیاستدانوں اور سب سے بڑھ کر فورسز کے لیے ماضی کے تجربات' خطے میں القاعدہ کی موجودگی' پاکستان میں سکیورٹی کی تشویشناک صورتحال اور ریاست کے مستقبل کے تناظر میں ابہام یا رعایتیں دینے کی روایتی پالیسیوں سے گریز کرکے عسکریت پسندوں کے خلاف فیصلہ کن کارروائیاں کرنی چاہئیں۔

✿ ✿ ✿ ✿

جب زندہ لوگ موت کی دُعا مانگنے لگے.....

سال 2007ء سے لے کر 2009ء کے آخر تک فاٹا اور صوبہ سرحد میں طالبان کی شکل میں دہشت گردوں نے جن جن طبقوں کو بدترین جانی اور مالی نقصان سے دوچار کیا اُن میں سیاسی کارکن، فوج اور پولیس افسران اور اہلکار ایف سی جوان، لشکروں کے حمایت یافتہ افراد، سرکاری ملازمین اور خفیہ اداروں کے لوگ سرفہرست رہے تاہم سب سے افسوسناک امر یہ ہے کہ طالبان کی صورت میں ان ظالموں نے عام شہریوں کو بھی بار بار نشانہ بنا کر نہیں بخشا جن کا سیاست، ریاست یا ان سے متعلقہ اُمور سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سال 2009ء کے آخر میں جاری کردہ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ملک میں 492 حملے یا دھماکے کیے گئے ان میں 88 خودکش حملے بھی شامل تھے۔ اس بدترین لہر کا سب سے بڑا مرکز صوبہ سرحد بنا جہاں یکم جنوری سے 31 دسمبر 2009ء تک 51 خودکش حملوں کے علاوہ 148 بم دھماکے کیے گئے۔ ان حملوں میں 808 شہری اور مختلف فورسز خصوصاً پولیس کے 390 اہلکار قیمتی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ 2009ء اسلام آباد کے علاوہ پنجاب کے متعدد دوسرے شہروں میں 30 بم دھماکے اور 21 خودکش حملے کیے گئے۔ جس کے نتیجے میں 351 عام شہری اور فورسز کے 85 جوانوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ سندھ میں 6 بم دھماکوں کے نتیجے میں 50 سے زائد جوان اور عام لوگ نشانہ بنے۔ بلوچستان میں 3 خودکش حملوں سمیت 135 دھماکے کرائے گئے جن میں درجنوں عام لوگوں کے علاوہ فورسز کے 85 اہلکار زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ قبائلی علاقوں میں 128 بم دھماکے اور 11 خودکش حملے ہوئے جن میں 430 شہری اور فورسز کے

178 اہلکار جان بحق ہو گئے۔ آزاد کشمیر کے دارالحکومت مظفرآباد میں سال کے آخری دنوں کے دوران خودکش حملے میں 10 سکیورٹی اہلکار جان بحق اور اتنے ہی زخمی ہو گئے۔ (ان واقعات کا سلسلہ سال 2010ء کے آغاز پر اور بھی شدت سے سامنے آ گیا)۔

اگر ان اعداد و شمار کا بغور جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سال 2009ء کے دوران ہونے والی ان وحشیانہ کارروائیوں کے دوران عام شہریوں کو بدترین انتقام کا نشانہ بنایا گیا۔ فورسز کی بجائے اگر اس سال عام لوگوں کی تعداد کو اکٹھا کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ سال 2009ء کے دوران 1640 سے زائد عام شہری زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ دستیاب اعداد و شمار کے مطابق اس برس بم دھماکوں، خودکش حملوں اور ٹارگٹڈ کلنگ کے اقدامات کے ذریعے جہاں اتنی بڑی تعداد میں لوگ شہید ہو گئے وہاں 6000 کے لگ بھگ لوگ کچھ اس انداز سے شدید زخمی ہو گئے کہ وہ اب معذوری کے باعث مرنے سے بدتر زندگی گزارتے ہوئے واقعتاً جسمانی موت کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔ سرحد پولیس کے ترجمان ریاض احمد کے مطابق سال 2009ء کے دوران پولیس فورس کے 280 جوان دہشت گردوں کا نشانہ بنتے ہوئے جام شہادت نوش کر گئے جبکہ 100 کے لگ بھگ زخمی یا معذور ہوئے۔ صوبہ سرحد کے 808 شہریوں کے بعد جن علاقوں میں عام لوگوں کو بڑی تعداد میں انتقاماً بم دھماکوں اور خودکش حملوں کا نشانہ بنایا گیا وہ فاٹا کی سات ایجنسیاں ہیں۔ ان علاقوں میں شہید ہونے والوں کی تعداد 430 سے زائد ہے۔ ان میں سے اکثریت ان لوگوں کی تھی جو طالبان کے خلاف کسی جرگے، لشکر یا اجلاس میں شریک ہونے پر مجرم ٹھہرے تھے یا وہ لوگ تھے جو اپنے علاقوں میں طالبان کی موجودگی اور سرگرمیوں کی مخالفت کے ناقابل معافی عمل کے ذمہ دار تھے۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ طالبان کے نام پر ان ظالم دہشت گردوں نے ایسے واقعات کے دوران بچوں اور خواتین کو بھی نہیں بخشا۔ محتاط اندازے کے مطابق صرف پشاور میں کیے گئے 4 حملوں کے دوران 21 خواتین اور 19 بچے شہید ہوئے۔

چوک یادگار کے علاقے نمک منڈی میں کیے گئے خودکش حملے کے بعد جب لوگ اپنے پیاروں کی لاشیں تلاش کرنے نکلے تو کسی کو ایک بھی لاش صحیح اور سلامت حالت میں نہیں ملی۔ زیادہ تر لاشوں کی شناخت بدن پر بچوں کے کپڑے یا جوتے سے کی گئی۔ متعدد بار

ایسا ہوا کہ جسم کے مختلف اعضا کو گنتی کے حساب سے پورا کرتے ہوئے ان اعضا کو ایک تابوت، چادر یا بوری میں ڈال کر انہیں ایک لاش کا نام دیا گیا۔ ایک عینی شاہد اور زخمی اکرام اللہ نے اُس دن کا واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ دھماکے کے بعد جتنی بھی لاشیں دیکھی گئیں اُن میں اکثر نہ صرف ناقابلِ شناخت تھیں بلکہ ایک افسوسناک چیز یہ سامنے آئی کہ 90 فیصد لاشوں کے جسموں پر کپڑے بھی نہیں بچے تھے۔ ان میں خواتین اور بچوں کی لاشیں بھی شامل تھیں۔ دھماکے کے فوراً بعد میں نے دیکھا کہ ایک سر کی لاش نہ صرف حرکت میں تھی بلکہ نیچے کا دھڑ کافی دور تک جانے کے بعد گر گیا تو اس کا سر کئی فٹ پیچھے رہ گیا تھا۔ میں خود بری طرح زخمی تھا اس کے باوجود مجھے آٹھ روز تک جب بھی سر کٹی لاش یاد آجاتی تو میں چلانا شروع کر دیتا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے زنجیروں اور رسیوں سے باندھنا شروع کر دیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ متعدد خواتین برہنہ حالت میں پڑی ہوئی تھیں تاہم ان میں سے کسی کی نعش سلامت نہیں تھی زندہ رہنے والے لوگوں نے چادریں اور کپڑے نکال کر ان کے جسم ڈھانپے تھے۔

باجوڑ سے تعلق رکھنے والے مذکورہ شخص کے مطابق ایک ہی خاندان کے تین وہ نوجوان لڑکے بھی شہداء میں شامل تھے جو دھماکے کے وقت اپنی دُکان میں بیٹھے ہوئے تھے بعض پر بجلی کے تار گر گئے اور وہ کرنٹ لگنے سے راکھ بن گئے تھے ہم صرف ان کی ہڈیاں دیکھ سکتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے جسم پر بم میں استعمال ہونے والے لوہے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے یا ذرے پیوست ہو گئے تھے جبکہ بم میں شامل کسی چیز کا اثر یہ تھا کہ اس کے پورے جسم سے کئی ہفتوں تک سفید رنگ کی پیپ نکلتی تھی اور اس کے علاج کے لیے ڈاکٹروں نے جو خرچہ بتایا تھا وہ یومیہ چھ ہزار روپے تھا۔

''ہمیں دھماکے کے تین روز بعد انتہائی بری حالت میں لیڈی ریڈنگ ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ ایمرجنسی توڑ دینے کے علاوہ وہ مستقل علاج نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد میں نے بیوی کے زیورات فروخت کر کے پانچ چھ روز تک اپنا علاج کرایا وہ پیسے ختم ہو گئے تو دوستوں سے قرض لینے لگا جس دُکان میں مَیں سیل مین تھا اس کا مالک کہہ رہا تھا کہ میں علاج کے لیے کچھ نہیں دے سکتا کیونکہ میرا اپنا کاروبار تباہ ہو گیا ہے ہم

نے حکومت کے دعووں پر اعتبار کر کے سینئر وزیر بشیر بلور کے پاس ایک وفد بھیجا تاہم انہوں نے کسی قسم کی مالی معاونت کی فراہمی کے برعکس یہ کہہ کر وفد کو واپس بھیج دیا کہ فہرستوں کی چھان بین کے بعد طریقہ کار کے مطابق ہر شہید اور زخمی کے ورثاء کو طے شدہ معاوضہ دیا جائے گا۔'' اکرام اللہ کے مطابق متاثرین کے ساتھ حکومتی شخصیات کا رویّہ ناقابل برداشت ہوتا ہے کاش کہ ہم بھی دوسروں کی طرح دھماکے میں اُڑ کر معذوری کی اس زندگی سے چھٹکارا پا لیتے تو یہ ذلالت اور بے بسی دیکھنے کو نہ ملتی۔ ان کے ایک اور ساتھی منور خان کے مطابق ایک متعلقہ سرکاری ادارے کے ایک اہلکار نے ان سے مطالبہ کیا کہ اُس کو 25000 یا 50000 (ہزار) صرف اُس صورت میں مل سکتے ہیں اگر وہ پیشگی کے طور پر اسے 10000 (ہزار) روپے دے۔ ''میں بازار کے صدر، ڈاکٹری دستاویزات اور دوسرے تصدیق شدہ چیزیں لے کر امداد لینے گیا تو میرے پاس واپسی کا کرایہ بھی نہ تھا۔ مجھ سے وہاں تکلیف کے باعث بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا کئی گھنٹوں کے انتظار کے بعد مجھ سے دس ہزار کی رشوت کا مطالبہ کیا گیا تو میرا سر چکرا کر رہ گیا۔ میں نے اُس شخص کو کہا کہ اگر وہ میرے پیسے دے دے تو میں رشوت اُسی میں سے نکال کر دوں گا مگر وہ نہیں مان رہا تھا یوں میں خود کو بددعائیں دیتے ہوئے اُس دفتر سے نکل آیا۔''

خیبر بازار پشاور کے دھماکہ کے نتیجے میں ایک زخمی اس حالت میں لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں زیرِ علاج رہا کہ دھماکہ سے اُس کے جسم کا ناف سے نیچے کا حصہ اُڑ گیا تھا مگر وہ پھر بھی زندہ تھا۔ متعدد ایسے شخص جن کے رشتہ داروں کا کئی روز تک پتہ بھی نہ چل رہا تھا جبکہ وہ شدید زخمی ہونے کے باعث اپنی شناخت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ متعدد لوگوں کو کئی کئی ہفتوں تک اپنے رشتہ داروں کو ڈھونڈنے میں لگ جاتے آخر تھک ہار کر وہ مایوس ہو جاتے اور ان کی آنکھیں بے بسی اور انتظار کے باعث پتھر کی بن جاتیں۔ لیڈی ریڈنگ ہسپتال کے ایک سرجن کے مطابق ایک خاتون 3 مہینوں سے اپنے ایک گمشدہ سترہ سالہ بیٹے کی تلاش میں نیم بے ہوشی کے عالم میں ہر دوسرے تیسرے دن آ کر دریافت کرتی رہی کہ اس کے دوسرے بیٹے کی لاش کب ملے گی۔ مذکورہ ڈاکٹر کے مطابق اس کے دو بیٹے مینا بازار خریداری کرنے آئے تھے دھماکہ سے چند منٹ قبل موبائل پر ان سے ایک چیز لانے کا کہا

گیا۔ شام کو اُس کے ایک بیٹے کی نعش تو شناخت کی گئی مگر دوسرا تاحال لاپتہ ہے اور ان کی ماں اب دیوانگی اور پاگل پن کی حدود کراس کرتے دکھائی دے رہی ہے۔

طالبان یا دہشت گردوں کے مظالم اور حکومتی اداروں کی بے حسی کا رویہ صرف عام متاثرہ لوگوں تک محدود نہیں رہا۔ پشاور پولیس کے ایک بہادر شہید کے بھائی نے رابطے پر بتایا کہ وزیر اعلیٰ نے دوسروں کے علاوہ اُس کے شہید بھائی کے لیے بھی تین لاکھ روپے کا اعلان کر رکھا تھا تاہم ہمیں یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہ متعلقہ حکام کے دفاتر کے چکر کاٹتے کاٹتے نہ صرف ہمارے جوتے پھٹ گئے بلکہ ہمیں بہت ذلالت سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ مذکورہ شخص کے مطابق ''یہ بڑی ناانصافی ہے کہ اگر اسلام آباد، لاہور یا کراچی میں کوئی پولیس والا شہید ہو جاتا ہے تو اس کے ورثاء کو 5 سے لے کر 15 لاکھ تک کی رقم دی جاتی ہے تاہم پشاور اور صوبہ سرحد کے شہداء کو اس تناسب سے تیسرا حصہ بھی ادا نہیں کیا جاتا۔ اگر کم رقم بھی آسانی سے مل جایا کرتی تو ہمیں دوسرے صوبوں کے بھائیوں کے زیادہ حصے پر اعتراض نہ ہوتا مگر افسوس کہ اس کے لیے بھی خوار ہونا پڑتا ہے۔

پشاور کے ایک سینئر صحافی فرید اللہ خان کا کہنا ہے کہ حکومت کی نااہلی اور لاپرواہی کا ہمیں بذات خود اُس روز اندازہ ہوگیا جب ہم پشاور پریس کلب پر ہونے والے خودکش دھماکے کے زخمیوں کو لیڈی ریڈنگ ہسپتال لے گئے اور وہاں یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ زخمیوں کے علاج کے لیے درکار ادویات اور ماہر ڈاکٹر بھی دستیاب نہیں تھے۔ چنانچہ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ جو لوگ دہشت گردوں کے حملوں میں مرنے سے بچ جاتے ہیں ان میں سے اکثریت علاج کی مؤثر سہولتیں نہ ہونے اور ڈاکٹروں کی لاپرواہی کے باعث زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں۔ فرید اللہ خان کے مطابق ہسپتال میں نہ تو زخمیوں کو لینے کے لیے عملہ تھا نہ سٹریچر تھے اور نہ ہی ایمرجنسی سے نمٹنے کے لیے کوئی فعال اور تیز نظام موجود تھا حالانکہ پریس والوں کی بڑی تعداد بھی وہاں موجود تھی اگر ہمارے زخمیوں کی حالت یہ تھی تو یہ سوال یہ اٹھتا ہے کہ عام لوگوں کی کیا حالت ہوتی ہوگی؟

شہداء اور زخمیوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے ایسے رویّوں کے علاوہ ان لوگوں کی داستانیں اور فریادیں بھی سننے کے قابل ہیں جن کی دکانیں، عمارتیں، گاڑیاں اور

دوسری املاک دہشت گردی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ ان کو پہلا مسئلہ تو یہ درپیش ہوتا ہے کہ ان کے نقصان کا درست اور بروقت تخمینہ نہیں لگایا جاتا۔ دوسرا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ متعلقہ اہلکار تخمینہ لگانے یا تو آتے نہیں اور اگر آ جائیں تو معاشی بدحالی اور تباہی سے دوچار متاثرین سے حسب روایت رشوت طلب کرتے ہیں اگر نقصان کا تخمینہ لگا دیا جائے تو متاثرین کو کئی کئی مہینوں تک دفاتر کے چکر لگانے پڑتے ہیں تب تک وہ دیوالیہ ہونے کے علاوہ ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج ہو چکے ہوتے ہیں۔ ایک بیمہ ایجنٹ کے مطابق دہشت گردی کی حالیہ لہر کے بعد سرکاری ملازمین اور عام شہریوں کی جانب سے انشورنش کرانے کی شرح میں اس کے باوجود یہ اضافہ ہو گیا ہے کہ لوگ پیسہ نکالنے سے گریزاں ہیں۔ انشورنس وہ اس لیے کرا رہے ہیں کہ ان کو اپنی ذات اور خاندان کے مستقبل نے پریشان کر دیا ہے۔ ماہر نفسیات اور نامور دانشور ڈاکٹر فاروق خان کے مطابق حالیہ برسوں کے دوران دماغی اور نفسیاتی مریضوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے کیونکہ لوگ نہ صرف حالات سے خوفزدہ اور مایوس ہیں بلکہ ان کو اپنی زندگی اور خاندان کی فکر نے بھی جکڑ رکھا ہے۔

✿ ✿ ✿ ✿

بے نظیر بھٹو کا قتل اور اس کے ذمہ دار

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ بھٹو خاندان کے دو بڑے لیڈروں ذوالفقار علی بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو اُن قوتوں نے نہ صرف اقتدار بلکہ زندگی سے بھی محروم کر دیا جن کو طاقتور بنانے میں ان دو لیڈروں نے مرکزی کردار ادا کیا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے اسٹیبلشمنٹ کے جن جن نمائندوں پر انحصار کر کے ان کو اقتدار یا اختیارات کے مراکز پر بٹھایا وہی نمائندے ان کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن کر ان کے سامنے کھڑے ہو گئے اس ضمن میں ان کو پھانسی دینے والے جنرل ضیاء الحق اور فاروق لغاری کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ عالمی کھلاڑیوں کے علاوہ پاکستانی کھلاڑیوں خصوصاً مذہبی قوتوں نے دونوں شہید وزرائے اعظم کو اس کے باوجود نہیں بخشا کہ اپنے دورِ اقتدار میں دونوں نے مذہب سے متعلق بعض ایسے ریاستی فیصلے کیے جن کو جمہوریت پسند اور روشن خیال حلقوں نے کبھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ اس ضمن میں قادیانیوں کے خلاف قانون سازی، ایٹمی پروگرام کی بنیاد رکھنا اور افغانستان کے جہادی لیڈروں کو تربیت کے لیے پاکستان کے مہمان بنانے کے اقدامات شامل ہیں۔ جبکہ بھٹو نے ہندوستان اور افغانستان جیسے ممالک کے معاملے پر بھی عملاً جہادیوں یا مذہبی قوتوں کے طرزِ عمل سے کوئی الگ رویہ نہیں اپنایا۔

یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ ایک ماڈرن، سیکولر اور ڈیموکریٹک حکمران ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے دورِ اقتدار میں نہ صرف سردار داؤد خان اور دوسرے افغان لیڈروں کے خلاف انتہائی ہتک آمیز رویہ اپنائے رکھا بلکہ جن مجاہدین کو بعد میں روس کے خلاف استعمال کیا گیا ان کو کمانڈروں کا روپ دینے میں بھی بھٹو کا مرکزی کردار رہا۔ اقتدار کی محرومی سے

چند ماہ قبل بھٹو نے اس کے باوجود فاٹا کا ایک ......دورہ کیا حالانکہ ان علاقوں میں ان کے حامی نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس دورے کے دوران سابق وزیراعظم نے سردار داؤد خان کو مسلسل ٹارگٹ بناتے ہوئے نہ صرف دھمکیاں دیں بلکہ ان کو تضحیک کا بھی نشانہ بنایا۔

تاریخ کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ ان کی شہید صاحبزادی بھی اپنے دونوں ادوار میں افغانستان کے بارے میں ایسی ہی پالیسیاں لے کر آگے بڑھی۔ اگر بھٹو صاحب نے پہلے دور کے مجاہدین کو تربیت دے کر افغانستان کو دباؤ سے دوچار کرنے کی پالیسی اپنائی تو ان کی صاحبزادی کو یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ انہوں نے کئی برسوں بعد دوسرے قسم کے جہادیوں یعنی طالبان کو کوئٹہ اور قندھار کے راستے افغانستان میں داخل کرانے کا کارنامہ انجام دیا۔

حسنِ اتفاق دیکھئے کہ دونوں سیکولر وزرائے اعظم کو دونوں ادوار میں اس ٹاسک کے لیے جو شخص میسر رہا وہ نصیر اللہ بابر تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ اس وقت بھی طالبان کو اپنے بچے قرار دے کر ان کی وکالت کرتے رہے۔ جب بے نظیر بھٹو (بعد میں) طالبان کو نہ صرف ناپسندیدہ قرار دے چکی تھیں بلکہ وہ طالبان کی مخالفت میں حد سے آگے نکل گئی تھیں اور انہوں نے متعدد انٹرویوز کے دوران اعتراف بھی کیا کہ طالبان کو سپورٹ کرنا ان کی ایک بڑی غلطی تھی۔

دونوں شہید وزرائے اعظم کو اس کے باوجود افغانستان میں مداخلت اور مجاہدین کو بنانے کی پالیسی سے مبرئ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پیپلز پارٹی کے متعدد لیڈر بعد میں ان پالیسیوں کو اسٹیبلشمنٹ کی پالیسی اور دباؤ کا نتیجہ قرار دیتے رہے۔

مشرف کے دورِ اقتدار میں بے نظیر شہید نے یورپ اور امریکہ میں اپنی جلاوطنی کے دوران القاعدہ، طالبان اور دوسری مذہبی قوتوں کے خلاف کھل کر مہم چلائی۔ اس مہم کی وجہ یہ بتائی جاتی رہی ہے چونکہ امریکہ ان قوتوں کا مخالف ہے۔ اس لیے بی بی کی کوشش تھی کہ امریکی آشیرباد کے حصول کے لیے یہ مہم چلائی جائے تاہم ایک دوسرا اور شاید زیادہ معتبر تاثر یہ ہے کہ بی بی واقعتاً القاعدہ اور طالبان کی مخالف ہوگئی تھیں اور اس کی ایک بڑی وجہ القاعدہ کی وہ مالی مہم جوئی تھی جس میں اُسامہ بن لادن نے بی بی کی حکومت کے خاتمے کے

لیے نواز شریف اور بعض دوسرے عناصر کو رقم فراہم کی تھی۔ بی بی نے اس عرصہ کے دوران نہ صرف یہ کہ امریکی موقف کا کھل کر ساتھ دیا بلکہ انہوں نے اے این پی جیسی پارٹی کے علاوہ افغانستان میں حامد کرزئی اور دوسرے طالبان مخالف لوگوں کے ساتھ بھی بہتر مراسم کی ابتدا کر دی تھی بلکہ پاکستان آنے سے پہلے ان کی کرزئی سے ایک ملاقات بھی طے ہوئی تھی جو نہیں ہو سکی۔ بے نظیر بھٹو پاکستانی طالبان خصوصاً بیت اللہ محسود کی کھل کر مخالفت کر رہی تھیں۔ اپنی شہادت سے قبل جب بی بی نے پاکستان آنے کے پروگرام کا اعلان کیا تو انہوں نے اپنے بیانات میں یہ بات بڑی شدت اور تکرار کے ساتھ کہی کہ طالبان اپنی کارروائیوں اور پالیسی کے تحت پاکستان کا جھنڈا اُتارنا چاہتے ہیں اور وہ عوام کی قوت سے ان کا مقابلہ کرنے اور ان کے حامیوں کو سیاسی شکست دینے پاکستان آ رہی ہیں۔ ان کے ایسے بیانات پر طالبان کی اعلیٰ قیادت کے علاوہ ان کے حامیوں کا شدید ردِعمل سامنے آتا رہا اور متعدد ایسی اطلاعات بھی ملنی شروع ہو گئیں کہ طالبان کمانڈرز بعض قوتوں کی خواہش پر بے نظیر بھٹو کے اقتدار میں آنے کا راستہ روکنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ طالبان اور پاکستان کی بعض قوتوں کو یقین ہو چلا تھا کہ بی بی کی کامیابی کی صورت میں پاکستان کی خارجہ پالیسی میں بڑی بنیادی تبدیلیاں رونما ہوں گی اور یہ تبدیلیاں طالبان کی شکست اور ناکامی کا راستہ ہموار کرنے کا سبب بنیں گی۔

چونکہ جنرل مشرف بھی در پردہ دہشت گردی سے متعلق معاملات پر امریکہ کے ساتھ ڈبل گیم کھیل رہے تھے اس لیے ان کی خواہش تھی کہ بے نظیر بھٹو کے اقتدار کا یا تو راستہ روکا جائے یا ممکنہ حد تک ان کو ہمنوا بنا کر ایک اتحاد کے لیے کسی فارمولے پر متحد کیا جائے اسی مقصد کے لیے طالبان اُن کے پاس ایک اچھا آپشن تھا یہی وجہ ہے کہ اُس وقت کے اعلیٰ سرکاری حکام وقتاً فوقتاً اس خدشے کا کھلے عام اظہار کرتے پائے گئے کہ طالبان بے نظیر بھٹو کو کارروائی کا نشانہ بنا سکتے ہیں۔ یہ تاثر یا اطلاع دینے والوں میں جنرل مشرف اور ان کے وزرائے داخلہ آفتاب خان شیر پاؤ اور حامد نواز (نگران وزیر) بذات خود پیش پیش تھے۔

فاٹا اور طالبان کے معاملات پر نظر رکھنے والے متعدد افراد کا کہنا ہے کہ بیت اللہ محسود، قاری حسین اور حکیم اللہ محسود بھی نجی محفلوں میں کہا کرتے تھے کہ اگر ان کے پاس

اسلام آباد میں جنرل مشرف اور بے نظیر بھٹو میں سے کسی ایک کو پسندیدہ قرار دینے کا آپشن آ گیا تو وہ یقینی طور پر جنرل مشرف کا نام لیں گے۔

ایسی بھی اطلاعات تھیں کہ قاری حسین نے بعض خودکش حملہ آوروں کو نوید سنائی تھی کہ وقت آنے پر اُن کو بے نظیر کو شکار بنانے کے ٹاسک پر بھیجا جا سکتا ہے۔ اِدھر افغانی طالبان اور القاعدہ لیڈرشپ کو بھی یقین تھا کہ اگر پی پی پی اور اے این پی پر مشتمل حکومت قائم ہوتی ہے تو اس سے ان کی مشکلات میں اس حوالے سے بہت اضافہ ہو گا کہ دونوں پارٹیاں امریکہ کے ساتھ اتحاد کے معاملے پر جنرل مشرف سے بھی کئی قدم آگے نظر آئیں گی۔ بے نظیر بھٹو نے بھی بعض بیانات میں اپنی آمد سے قبل کئی بار بتایا تھا کہ ان کو پاکستان میں وہ قوتیں قتل کر سکتی ہیں جو کہ انتہا پسندی کی حامی اور جمہوریت کی دشمن ہیں۔ ایسے مواقع پر یہ سوال سر اُٹھانے لگا کہ اگر وہ امریکہ اور ایسی دوسری قوتوں کی کوششوں اور گارنٹی کے ساتھ آ رہی ہیں تو ان کو کن قوتوں سے جان کا خطرہ ہوسکتا ہے کیونکہ جن دنوں وہ اس خدشے کا اظہار کر رہی تھی اُس وقت ایک ڈیل کے تحت جنرل مشرف اور شہید لیڈر کے درمیان مصالحت کے معاملات ہنی مون پیریڈ سے گزر رہے تھے۔

18 اکتوبر 2007ء کو جب وہ کراچی ائیرپورٹ پر اُتریں اور حکومت کی توقعات کے برعکس لاکھوں کارکنوں نے ان کا استقبال کیا تو اس واقعہ سے نہ صرف یہ کہ بی بی کے اعتماد میں اضافہ کر دیا بلکہ حکمرانوں کو بھی ڈیل کے باوجود اپنے پاؤں اُکھڑتے محسوس ہو گئے۔ اسی روز ان پر کارساز کراچی میں خودکش حملوں کے علاوہ فائرنگ بھی کی گئی تاہم وہ بچ گئیں اور انہوں نے کچھ دیر بعد کہا کہ وہ پاکستان میں ایسے حملوں کے باوجود نہ صرف موجود رہیں گی بلکہ الیکشن لڑ کر حکومت بھی بنائیں گی۔

پاکستان آنے سے قبل انہوں نے جنرل مشرف کو 16 اکتوبر کو دوبئی سے خط لکھا کہ ان کی حفاظت کے لیے خصوصی اقدامات کیے جائیں اگر ان کو حکومت کے علاوہ طالبان یا کسی اور قوت سے خطرہ نہ تھا تو وہ مشرف ہی کے نوٹس میں یہ بات کیوں لاتیں۔ ان کے سیکیورٹی انچارج رحمان ملک نے 27 اکتوبر کو سیکرٹری داخلہ سید کمال شاہ کو بھی خط لکھتے ہوئے سیکیورٹی کے غیرمعمولی انتظامات کرنے کا کہا تاہم وزارت داخلہ نے 6 نومبر کو اپنے جواب میں ان

خدشات پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ بی بی کے حفاظتی انتظامات مناسب نہیں ہیں۔ صدر آصف زرداری نے ایک ٹی وی انٹرویو کے دوران بی بی کی شہادت کے بعد کہا کہ رحمان ملک نے وزارت داخلہ اور اعلیٰ حکومتی شخصیات کو بی بی کی سکیورٹی کے لیے 25 خطوط لکھے۔

ذرائع کے مطابق اپنی شہادت سے ایک روز قبل یعنی 26 دسمبر کو بے نظیر بھٹو نے خود ڈی جی آئی ایس آئی جنرل ندیم تاج کے ساتھ ہونے والی ایک ملاقات میں لیاق باغ والے جلسہ عام اور دوسرے اجتماعات کے انتظامات اور سکیورٹی کے معاملہ پر تبادلۂ خیال کیا تھا۔ 27 دسمبر کو جب شہید لیڈر لیاقت باغ کے لیے نکل رہی تھیں تو اُس سے چند گھنٹے قبل ان کی افغان صدر حامد کرزئی کے ساتھ اسلام آباد میں ایک ملاقات ہوئی تھی۔ بعض معتبر افغان ذرائع کے مطابق ملاقات کے دوران کرزئی نے بی بی کو اشارتاً یہ بھی بتایا تھا کہ ان کے پاس بی بی کے قتل کے منصوبے کی انٹیلی جنس اطلاعات ہیں۔ اس لیے وہ احتیاط کریں بعض ذرائع کے مطابق ایک اور اسلامی ملک کی انٹیلی جنس نے بھی ایسے ہی خدشے کا اظہار کرتے ہوئے بی بی کو مطلع کیا تھا۔ ان اطلاعات کے بعد بی بی نے رحمان ملک اور متعلقہ دوسرے افراد سے مشاورت بھی کی۔

بے نظیر بھٹو لیاقت باغ گئیں اور وہاں جلسے کی ابتدا کی تو انہوں نے حسبِ معمول طالبان اور مشرف کو سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ انتہا پسندوں نے پاکستان کے متعدد علاقوں سے پاکستان کا جھنڈا اُتارا ہے تاہم وہ قومی پرچم لہرا کر ہی دم لیں گی اور پاکستان کو انتہا پسندوں سے صاف کریں گی۔ اس جلسے سے دو روز قبل وہ پشاور کے جلسہ میں شرکت کرنے آئیں تو ان کے جلسے میں کارکنوں اور عوام نے بہت کم تعداد میں شرکت کی۔ پتہ لگانے پر بعض لیڈروں نے کہا کہ کارکنوں میں کسی نے یہ افواہ پھیلائی تھی کہ بی بی پر پشاور میں خودکش حملہ ہوسکتا ہے۔ اس لیے وہ خوف کے باعث بڑی تعداد میں شریک نہ ہو سکے۔

بی بی جلسے کے اختتام پر لیاق باغ سے نکلیں تو شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی ان پر فائرنگ کی گئی جس سے وہ گاڑی کے اندر گر گئیں فوراً بعد قافلے پر خودکش حملہ کیا گیا۔ اس واقعہ نے ایک عظیم اور باجرأت لیڈر کی جان لے کر ان خدشات کو بدقسمتی سے درست ثابت کیا کہ بعض قوتیں جان لے سکتی ہیں۔ اسی روز سی این این نے ان

کی وہ ای میل نشر کر دی جس میں انہوں نے ایک صحافی دوست کو لکھا تھا کہ اگر ان کو قتل کیا گیا تو اس کی ذمہ داری دوسروں کے علاوہ جنرل پرویز مشرف پر بھی عائد ہو گی۔ چند اور ای میلز میں متعدد دوسرے لوگوں کو بھی ذمہ دار قرار دیا گیا تھا جبکہ وزارتِ داخلہ کے ترجمان جاوید اقبال چیمہ اور دوسرے حکام نے دعویٰ کیا کہ بی بی کو بیت اللہ محسود کے کہنے پر طالبان نے شہید کر دیا ہے۔ جاوید اقبال چیمہ نے بیت اللہ محسود اور ایک آپریشنل کمانڈر کی مبینہ اور غیر مصدقہ گفتگو کی ریکارڈنگ بھی سنا دی۔ جس میں کمانڈر موصوف کو خوشخبری سناتے ہیں کہ جانثاروں نے پنڈی والا ٹاسک کامیابی سے پورا کر دیا ہے۔ اس موقع پر حکومتی اہلکاروں خصوصاً حکام کے متضاد بیانات نے حکومت کی پوزیشن کو مشکوک بنا دیا۔ حکام کا کہنا تھا کہ بی بی پر کوئی گولی نہیں چلائی گئی بلکہ وہ گاڑی کی چھت کے لیور کے ساتھ سر لگنے سے جاں بحق ہو گئی ہیں۔ دوسرا بیان یہ تھا کہ صرف ایک ہی شخص نے گولی چلائی ہے جبکہ عینی شاہدین کا دعویٰ تھا کہ تین مختلف اطراف سے گولیاں چلائی گئی تھیں اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ متعدد دوسرے لوگوں کو بھی گولیاں لگی تھیں۔ جلسے کے منتظمین کے مطابق ایک واٹرٹینکی، ایک زیرِ تعمیر عمارت اور بعض درختوں کی آڑ سے بیک وقت فائرنگ کی گئی۔ یہ الزام بھی لگایا گیا کہ پولیس اور انٹیلی جنس حکام نے نہ صرف واپسی کا روٹ تبدیل کر دیا بلکہ واقعہ سے کچھ دیر قبل پولیس اہلکاروں کو کسی کے اشارے پر متعدد مقامات سے ہٹا بھی دیا گیا۔ ایک عینی شاہد کے مطابق بعض غیر سرکاری لوگ مشکوک انداز میں پستول لیے گھوم رہے تھے مگر پولیس نے ان کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ ایک پارٹی رہنما کے مطابق بی بی نے درختوں کی آڑ میں بعض افراد کی حرکات کا نوٹس لے کر اس پر تشویش کا بھی اظہار کیا مگر کسی نے ان کا نوٹس نہیں لیا۔ اس وقت کے وزیرِ داخلہ جنرل (ر) حامد نواز کے مطابق جلسے کے انتظامات کے لیے دو ہزار کے لگ بھگ پولیس اہلکار تعینات کیے گئے تھے۔

اس کے باوجود بی بی کی حفاظت کا انتظام نہ ہو سکا۔ ایک طرف جاوید چیمہ بیت اللہ محسود پر حملے کی ذمہ داری ڈال رہے تھے تو دوسری طرف میڈیکل ٹیم کے انچارج ڈاکٹر مصدق خان گولی لگنے کے واقعہ سے قطعی لاعلمی کا اظہار کر رہے تھے۔ وزارت داخلہ کے بعض اہلکار بھی لیور کو موت کا سبب قرار دے رہے تھے۔ پوسٹمارٹم نہ کرانے کو آصف علی زرداری کی

خواہش کا نتیجہ قرار دے کر ملک کی ایک بڑی شخصیت کو محض ایک شخص کی بیوی کے کردار تک محدود رکھنے کے موقف کو بھی شک کی نظر سے دیکھا گیا۔ جبکہ حادثے کی جگہ تو گھنٹوں کے اندر دھونے کے احکامات نے بھی کئی سوالات کو جنم دیا۔ مجموعی طور پر جن کم عمر لڑکوں کو حملہ آور قرار دے کر گرفتار کیا گیا ان میں اعتزاز شاہ، رفاقت اور حسنین شامل تھے۔ مرکزی ملزم اعتزاز شاہ کی عمر 16 سال تھی جس کو عمر کی رعایت دلانے کے لیے ایک درخواست بھی عدالت میں جمع کرائی گئی۔ سب سے حیرت کی بات یہ سامنے آئی کہ ایف آئی آر میں بعض اشاروں کے باوجود مشرف کا نام شامل نہیں کیا گیا۔ بے نظیر بھٹو اور مشرف کے اختلافات اپنی جگہ تاہم اس حقیقت کو بھی مدِ نظر رکھنے کی ضرورت تھی کہ انتہا پسند اس سے قبل دوسری بے شمار شخصیات کے علاوہ جنرل مشرف، شوکت عزیز، اسفندیار ولی خان، افراسیاب خٹک، آفتاب خان شیر پاؤ اور متعدد دوسروں پر براہِ راست قاتلانہ حملے کر چکے تھے۔

محض اس دلیل کی بنیاد پر طالبان کو اس واقعہ سے بری الذمہ اس لیے قرار دیا جا سکتا کہ طالبان پشتون ہیں اور پشتون خواتین پر ہاتھ نہیں اٹھاتے حالانکہ یہاں پر یہ دعویٰ اور دلیل بھی حقیقت اور واقعات کے تناظر میں درست نہیں۔ وہ خواتین تو کیا بچوں پر بھی اس سے قبل اور اس کے بعد قاتلانہ حملے کرتے آئے تھے۔ دوسری بات یہ کہ بے نظیر عام خاتون نہیں بلکہ وہ خاتون تھیں جو اقتدار میں آنے کے بعد دونوں اطراف کے طالبان، القاعدہ اور ان کے حامیوں کے لیے بڑا خطرہ بننے والی تھیں بعد کے ادوار میں نہ صرف امریکہ بلکہ ان کے شوہر اور صدرِ پاکستان آصف زرداری کے علاوہ طالبان کے بعض منحرف کمانڈروں اور متعدد دوسرے متعلقہ افراد نے بھی طالبان (بیت اللہ گروپ) کو اس سانحے کا ذمہ دار قرار دیا۔

ماضی کے تجربات اور طالبان کے خلاف دعوؤں کے برعکس عملاً مشرف حکومت کی ہمدردیوں کے تناظر میں اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ ایک فریق نے مناسب سکیورٹی نہ فراہم کرنے اور دوسرے نے عملی حملے کی صورت میں مشترکہ ہدف کے طور پر اتنی بڑی لیڈر کو درمیان میں سے ہٹانے اور جمہوریت پسند قوتوں کو سخت پیغام دینے کے مشترکہ پلان کی صورت میں یہ منصوبہ بندی کی تھی۔

فاٹا کی صورتحال اور آپریشن ناتمام کے بارے میں مختلف طبقہ ہائے فکر کی رائے

غیرت بھیر سے مکالمہ اور حزب اسلامی کی ترجیحات

حزب اسلامی افغانستان کے سربراہ گلبدین حکمت یار کے داماد اور ان کے ترجمان ڈاکٹر غیرت بھیر کو حزب اسلامی میں وہ مقام حاصل ہے جو کہ القاعدہ میں ڈاکٹر ایمن الظواہری کا ہے۔ وہ کابل میں ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکومت کے خاتمے کے بعد بننے والی مجاہدین کی دوسری باقاعدہ حکومت کے دوران اسلام آباد میں پاکستان کے سفیر رہے ہیں۔ کابل پر طالبان کے قبضے کے بعد وہ اسلام آباد میں مقیم رہے۔ نائن الیون کے بعد جب امریکیوں نے پاکستان کے ساتھ مل کر طالبان اور دوسری جہادی تنظیموں کے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کیا تو غیرت بھیر کو اسلام آباد میں ان کی رہائش گاہ سے گرفتار کر کے بلگرام ایئر بیس منتقل کیا گیا جہاں وہ چھ سال تک امریکی فورسز اور تفتیشی اداروں کی تحویل میں رہے۔

کچھ عرصہ قبل ان کو افغان صدر حامد کرزئی کے زبردست دباؤ پر رہائی مل گئی تو وہ اسلام آباد پہنچنے کے بعد ایک اہم سفارتی مشن پر یورپ کے دورے پر نکل پڑے۔ سیاسی مبصرین کا کہنا تھا کہ وہ حزب اسلامی، طالبان اور کرزئی انتظامیہ کے درمیان ایک ایسے فارمولے پر کام کر رہے ہیں جس کے ذریعے امریکیوں کے افغانستان سے انخلا کو پرامن طریقے سے ممکن بنا کر افغانستان میں ایک وسیع البنیاد نمائندہ حکومت کا قیام یقینی بنایا جا سکے

گا۔ اسلام آباد میں ان سے کیا گیا خصوصی اور غیر معمولی انٹرویو اس مقصد کے لیے شامل اشاعت کیا جا رہا ہے کہ افغانستان کی اعلیٰ قیادت پاکستانیوں کے مقابلے میں اپنے ملک کے دفاع اور استحکام کے لیے کن خطوط پر سوچ رہی ہے۔ بین السطور میں ان کی باتوں سے بہت سی تبدیلیوں کے اشارے مل سکتے ہیں۔ اس انٹرویو کو اس تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے کہ دہشت گردی کے نام پر جاری عالمی مہم جوئی کے حوالے سے اوبامہ حکومت کے قیام کے بعد بہت سی عسکری اور سیاسی تبدیلیوں کے اشارے اب اندرون خانہ حقیقت بنتے دکھائی دے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر 29 اکتوبر 2009ء کو برطانوی وزیراعظم گورڈن براؤن نے کہا کہ ان کا پہلا ہدف طالبان کے بجائے القاعدہ ہے اور یہی وہ پس منظر ہے جس میں طالبان کے ساتھ مذاکرات کی خبریں بھی گردش میں ہیں تو اس سے پہلے گڈ اور بیڈ طالبان کی بحث بھی میڈیا کا حصہ رہی ہے۔ امریکہ چاہتا ہے کہ طالبان کے ساتھ مفاہمت کا راستہ اختیار کیا جائے جس کے لیے پاکستان کی خواہش کو بھی مدنظر رکھا گیا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ حزب اسلامی کے سربراہ گلبدین حکمت یار نے 7 نومبر کو کہا کہ وہ اور دوسرے افغان گروپس امریکہ کو افغانستان سے نکلنے کا باعزت راستہ دینا چاہتے ہیں۔

س:۔ امریکیوں کے قبضے میں گزرا چھ سال کا عرصہ کیسا تجربہ ثابت ہوا؟

ج:۔ ان چھ سالوں کے دوران اتنے تلخ واقعات اور تجربات سے گزرا ہوں کہ ان کی یادداشتیں بیان کرتے خود کو مزید ذہنی اذیت سے دوچار کرنا نہیں چاہتا۔ امریکیوں کے لیے انسانی اور سیاسی حقوق کی کوئی اہمیت نہیں۔ میں نے ذاتی طور پر اس عرصہ کے دوران جہاں امریکیوں کی ذہنی پستی کے کئی مظاہر دیکھے وہاں اپنی سرزمین افغانستان، مسلمانوں اور پوری دنیا کی سیاست پر بہت سوچ کر نئے نتائج اخذ کیے۔ مجھے قید میں رکھنے کا امریکیوں کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ میں تو آرام سے اسلام آباد میں فیملی کے ہمراہ قیام پذیر تھا اور امریکہ کا معاملہ بھی براہ راست حزب اسلامی کے بجائے طالبان کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے باوجود مجھے اٹھوایا گیا اور چھ سال تک محض اس کوشش میں قید وظلم کا شکار بنایا کہ میں ان کے ساتھ سودے بازی کرلوں۔ چھ سال کے بعد امریکہ نے رہا کر دیا تو اس کے افسران نے معافی مانگتے ہوئے خود اعتراف کیا کہ میرے ساتھ زیادتی کی گئی ہے۔ میری گرفتاری، تشدد، تفتیش

اور دوسرے تمام معاملات امریکیوں کے ہاتھ میں تھے۔ مجھ پر ایسی حالت بھی گزری کہ میں تشدد اور درد کے باعث تلاوت کرتے وقت قرآن مجید بھی ہاتھوں میں اٹھانے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ نہ تو میرا کسی کے ساتھ رابطہ ممکن تھا اور نہ ہی مجھے اپنے خاندان کا کوئی علم تھا کہ کہاں اور کیسا ہے۔ میں نے ان کے ساتھ نہ تو کوئی سیاسی مفاہمت کی، نہ تعاون کیا اور نہ ہی رہائی کے لیے کوئی سودے بازی کی چونکہ میں بے قصور تھا اس لیے انہوں نے چھ سال بعد 29 مئی 2008ء کو رہا کر دیا۔ ابتدا میں تشدد کی وجہ سے چند ہی مہینوں کے اندر میرے وزن میں 30 کلو کی کمی واقع ہوگئی۔

س:۔ آپ کو دوران قید افغانستان کے سیاسی حالات کی اطلاعات تو مل رہی ہوں گی؟

ج:۔ مجھے بہت اندھیرے میں رکھا جاتا تھا۔ ذرائع ابلاغ تک رسائی ناممکن تھی۔ ملاقاتوں کی اجازت بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود مجھے پختہ یقین تھا کہ امریکہ اور اس کے اتحادی افغانستان میں پھنس گئے ہیں کیونکہ مجھے افغانوں کی تاریخ، فطرت اور جذبہ حریت کا علم تھا۔ مجھے اس بات کا بہت دکھ تھا کہ مظلوم افغان بہت تکلیف اور ظلم برداشت کر رہے ہوں گے۔ اس کے باوجود یہ بھی یقین تھا کہ وہ مزاحمت سے باز نہیں آئیں گے کیونکہ افغانوں کو مغلوب کرنا تو ممکن ہے تاہم ان پر قبضہ کرنا یا ان کو شکست دینا ممکن نہیں ہے۔ امریکہ اب واقعتاً پھنس کر رہ گیا ہے۔

س:۔ آپ کے خیال میں افغان مسئلے کا پائیدار حل کیا ہوسکتا ہے؟

ج:۔ یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ طاقت اور سازشوں کے ذریعے افغانوں کو شکست نہیں دی جا سکتی۔ جلد یا بدیر اس مسئلے کے حل کے لیے مغربی قوتوں کو تمام افغان نمائندہ قوتوں سے مذاکرات کا راستہ اپنا کر اپنی افواج نکالنا ہوں گی۔ ملٹری پالیسی سے حالات نہ صرف اور پیچیدہ ہو جائیں گے بلکہ امریکہ اقتصادی طور پر بھی جنگ کی طوالت برداشت نہیں کر پائے گا۔ میں اس بات کا قائل ہوں کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو نکلنے کے لیے باعزت راستہ دیا جائے جبکہ ہم اس حقیقت سے بھی آگاہ ہیں کہ ہم بھی اتنی بڑی طاقتوں کو بزور قوت باہر نہیں نکال سکتے۔ اس لیے تمام فریقین کو سیاست، مذاکرات اور لچک کا مظاہرہ کرکے زمینی حقائق تسلیم کرنا ہوں گے۔ تب جا کر مسئلے کا کوئی حل نکل آئے گا۔ حملہ آور قوتوں کو طالبان،

حزب اسلامی اور تمام نمائندہ افغان قوتوں سے بات کرنا ہوگی اور اس کے لیے افواج کو باہر نکالنے کا ارادہ بھی کرنا ہوگا۔ عالمی طاقتوں کو افغان گروپوں کے درمیان رابطوں کے سلسلے کو یقینی بنانے میں بھی اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ عبوری حکومت کا قیام ایسے مسلمان ممالک کی امن فورس کا قیام جن کی سرحدیں افغانستان سے نہیں ملتیں اور آزادانہ الیکشن کے انعقاد جیسے اقدامات وقت کا تقاضا ہیں اور ایسا کیے بغیر خطے میں نہ تو امن قائم ہوگا اور نہ ہی استحکام آئے گا۔ میں ذاتی طور پر امریکہ اور اتحادیوں کے ساتھ حقائق کی بنیاد پر مذاکرات کا حامی ہوں۔

س:۔ کیا آپ اب بھی افغان سیاست میں حزب اسلامی کا کوئی فعال کردار دیکھتے ہیں؟

ج:۔ حزب اسلامی نہ صرف افغان جہاد میں مرکزی کردار ادا کر چکی ہے بلکہ یہ لاکھوں افغانیوں کی ایک موثر سیاسی جماعت کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ بلاشبہ حزب اسلامی کی نظریاتی، سیاسی اور تنظیمی جڑیں بہت گہری اور مضبوط ہیں۔ باشعور، اہل دانش اور تعلیم یافتہ طبقوں کی موثر تعداد اس پارٹی سے وابستہ ہے۔ اس کے ہمہ گیر سیاسی کردار کو اس کے مخالفین بھی نظرانداز نہیں کر سکتے۔ حزب اسلامی کے لیڈر گلبدین حکمت یار کو ایک عالمی لیڈر کا مقام حاصل ہے۔ ان کے کردار، نظریات اور سیاسی بالادستی کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں۔ ان کو اعتماد میں لیے بغیر کوئی بھی پلان یا فیصلہ عملاً ممکن نہیں ہے۔ ہم سیاسی، جمہوری اور عملی لوگ ہیں۔ ہم افغانستان میں اپنے کردار اور اس کے تقاضوں سے بخوبی واقف ہیں۔

س:۔ بعض حلقے حکمت یار کو افغان حکومت کی جانب سے معافی دلانے کے کسی پلان کا ذکر کر رہے ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟

ج:۔ یہ افواہیں وہ لوگ پھیلا رہے ہیں جو کہ حکمت یار کی شخصیت، کردار اور سیاسی وابستگی سے واقف نہیں ہیں۔ وہ ایک جرأت مند، مستقل مزاج اور نظریات کے پکے شخص ہیں۔ معافی جیسی چیزیں ان کی فطرت میں شامل نہیں۔ وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہتے ہوئے اپنی سیاست کرنے کے قائل ہیں۔ ہم مفاہمت اور سودے بازی کے فرق کو سمجھتے ہیں۔

س:۔ حالیہ افغان الیکشن میں آپ کی پارٹی نے بھی غیر اعلانیہ حصہ لیا۔ کیا آپ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں؟

ج:۔ ہم تجربات سے سیکھ چکے ہیں کہ اگر کوئی مسئلہ بلٹ کی بجائے بیلٹ سے حل ہوسکتا ہے تو

اچھی بات ہے۔ ہم افغان معاشرے کا حصہ ہیں۔ جمہوری عمل اور رائے پر یقین رکھتے ہیں۔ اگر حزب کے ساتھیوں نے الیکشن میں تمام تر تحفظات کے باوجود حصہ لیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود کو معاشرے اور عوام سے الگ نہیں رکھ سکتے۔ ہم کوئی لسانی یا علاقائی گروپ کا پس منظر نہیں رکھتے۔ ہم پورے افغانستان میں عوامی نمائندگی رکھتے ہیں۔ پچھلے الیکشن میں بھی ہمارے ساتھیوں نے انفرادی طور پر حصہ لیا تھا کیونکہ ہم سیاسی اور جمہوری عمل کے حامی ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ اعتراضات کے باوجود الیکشن کے عمل سے باہر رہ کر خود کو عوام سے دور رکھیں۔

س:۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ حالیہ الیکشن کو آزاد، غیر جانبدارانہ اور نمائندہ سمجھنے کا سیاسی اعتراف کر رہے ہیں؟

ج:۔ الیکشن مشکوک، جانبدارانہ اور غیر نمائندہ تھے۔ عوام کی اکثریت اس سے بوجہ لاتعلق رہی۔ ٹرن آؤٹ بہت کم رہا اور طالبان کی دھمکیاں بھی اثرانداز ہوئیں۔ اس کے باوجود اس کی اہمیت سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ افغانستان کے لوگوں میں گولی کے بجائے ووٹ ڈالنے کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ وہ جنگیں کر کر کے نہ صرف بدحال ہو گئے ہیں بلکہ تھک بھی گئے ہیں۔ وہ امن اور استحکام چاہتے ہیں اور ہم ان کی اس خواہش کا احترام کرتے ہیں۔ ہم طالبان اور دوسرے تمام لوگ افغانستان کو ایک وحدت میں قائم دیکھنا چاہتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ہم مزاحمت، جہاد اور عملی جدوجہد کے ساتھ ساتھ ہر سیاسی عمل کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے افغانستان کے ان باشندوں کو بھی ووٹ ڈالنے کا حق ملنا چاہیے تھا جو پاکستان اور ایران کے علاوہ متعدد دوسرے ممالک میں رہائش پذیر ہیں لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ ان کو محروم رکھا گیا۔

س:۔ آپ نے یورپ کا حال ہی میں دورہ کیا۔ اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ آپ پھر سے متحرک ہو گئے۔ یہ تاثر عام ہے کہ آپ سیاسی مفاہمت کا راستہ تلاش کر رہے تھے؟

ج:۔ میرے ان دوروں کے سیاسی مقاصد نہیں تھے بلکہ میں ذاتی کام نمٹانے اور لوگوں سے ملنے مختلف ممالک میں گیا تھا۔ اس کے باوجود کہ اب میں زیادہ وقت اپنے خاندان کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں، میری متعدد سیاسی، سفارتی اور حکومتی نمائندوں سے ملاقاتیں ہوتی رہتی

ہیں۔ ان ملاقاتوں کے دوران لازمی بات ہے کہ افغانستان کے معاملات پر بات کرنے سے ہم الگ نہیں رہ سکتے۔ ان غیر رسمی ملاقاتوں کے دوران میں نے اس بات پر دوسروں کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو مناسب ماحول بنا کر افغانستان سے نکل جانا چاہیے۔ ہم ان کو باعزت راستہ دینے کی خواہش رکھتے ہیں۔ میں ان کو بتاتا رہتا ہوں کہ ایک مستحکم، آزاد، غیر مسلح مگر مضبوط سیاسی نظام کا حامل افغانستان سب کے مفاد میں ہے اور عالمی برادری کو ایسا ممکن بنانے کے ٹھوس اور دیرپا فارمولے پر کام کرنا چاہیے۔ ہم دوسروں کو بھی قائل کر رہے ہیں کہ جنگ، تشدد اور سازش کے ذریعے قیام امن کی کوششیں یا خواہشیں کبھی پوری نہیں ہوں گی مگر میں فی الحال عملی سیاسی اور جماعتی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی بجائے زیادہ وقت اپنے بچوں کو دینا چاہتا ہوں اور اپنی نقل و حرکت کو محدود رکھنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہوں۔

غیرت بھیر حزب اسلامی کے ترجمان اور گلبدین حکمت یار کے ترجمان ہونے کی بنا پر اگر افغانستان کی سیاست پر گہری نظر رکھتے ہیں تو ان کے سسر اور جماعت کے قائد گلبدین حکمت یار افغانستان کی سیاست کے ایک پرانے اور کہنہ مشق کھلاڑی ہیں۔ انہوں نے سوویت یونین کے خلاف جہاد میں بھی اہم کردار ادا کیا اور پھر بعد کی سیاسی صورتحال میں بھی بہت زیادہ متحرک اور فعال رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب انہیں کچھ عرصہ کے لیے ایران میں بھی پناہ گزین ہونا پڑا تھا لیکن ان کے سیاسی نظریات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ وہ آج بھی اپنی دھرتی سے جڑے ہوئے ہیں اور اس کے روشن مستقبل کے خواب آنکھوں میں سجائے ہوئے ہیں جو سیاسی اور جمہوری عمل سے منسلک ہیں۔

غیرت بھیر کے انٹرویو کو اگر حزب اسلامی یا گلبدین حکمت یار کے سیاسی خیالات اور مستقبل بینی کے نظریات میں دیکھا جائے تو بہت ساری باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

O......سوویت یونین کی طرح امریکہ کو بھی بالآخر افغانستان سے نکلنا پڑے گا لیکن مزید تباہی اور بربادی کے بجائے اس کو نکلنے کا محفوظ راستہ دیا جانا چاہیے جس کے لیے تمام افغان گروپوں کو ایک متفقہ فارمولا بنانا چاہیے اور اس کے لیے امریکہ اور اتحادی فوجوں کے ساتھ

مذاکرات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

O......گلبدین حکمت یار کی خواہش ہے کہ افغانستان میں قیام امن کے لیے اسلامی ممالک جن کی سرحدیں افغانستان سے نہیں ملتیں ان کی ایک مشترکہ فوج کو یہ ذمہ داری سونپی جانی چاہیے۔

O......افغانستان میں سیاسی جمہوری عمل کو فروغ ملنا چاہیے۔ یہی وہ راستہ ہے جو افغانستان اور اس کے عوام کو سیاسی اور معاشی تحفظ فراہم کر سکتا ہے۔

O......افغانستان کے عوام جنگ کی مزید مشکلیں اور مصیبتیں برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ ان کے اعضا شل ہو چکے ہیں اور اب ان کو امن اور خوشحالی کی اشد ضرورت ہے۔

O......یہ جنگ ہتھیاروں اور طاقت سے نہیں جیتی جا سکتی۔ اب اس جنگ کو سیاسی اور مفاہمت سے ہی نتیجہ خیز بنایا جا سکتا ہے۔

محمود اچکزئی سے ایک مکالمہ

پاکستان اپنی تاریخ کے مشکل ترین دور سے گزر رہا ہے تو اس کی مغربی سرحد پر موجود قبائلی علاقہ جات کی صورتحال پر پوری دنیا کی توجہ مرکوز ہے جو ایک طرف تو دہشت گردی اور انتہاپسندی کا مرکز بنا ہوا ہے تو دوسری طرف پاکستان کی مسلح افواج اور اس کے اداروں کو یہاں بدترین مزاحمت کا بھی سامنا ہے۔ اس پس منظر میں اس علاقے کا مستقبل بھی ایک سوالیہ نشان بنا ہوا ہے۔

لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ بہت کم سیاستدان ہیں جو اس کا ادراک رکھتے ہیں جبکہ اکثریت تو ان لوگوں کی ہے جو اس علاقے کا تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی پس منظر بھی نہیں جانتے اور خود ساختہ دانش کے جوہر ٹیلی ویژن کی سکرینوں پر لٹاتے نظر آتے ہیں جبکہ وہ لوگ جو نہ صرف اس علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں، اس کی تاریخ اور تہذیب سے بھی آگاہ ہیں۔ انہیں یہ مصنوعی دانشور اپنے پاس بٹھانا بھی پسند نہیں کرتے بلکہ ستم تو یہ بھی ہے کہ اخبارات میں بھی ان کی حقائق پر مبنی گفتگو کو کانٹ چھانٹ کر اور پھر مخصوص لبادے پہنا کر شائع کیا جاتا ہے لیکن وہ پھر بھی سچ بیان کرنے سے باز نہیں آتے بلکہ وہ اور بھی اونچی آواز میں اپنا موقف بیان کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں ایک نام محمود خان اچکزئی کا بھی ہے۔

محمود اچکزئی کا تعلق بلوچستان کی پشتون بیلٹ سے ہے اور وہ ایک قوم پرست پشتون کی شہرت بھی رکھتے ہیں۔ ان کا پشتون تاریخ اور تہذیب کے حوالے سے گہرا مطالعہ ہے اور اس خطے میں جاری جنگ کے نہ صرف عینی شاہد ہیں بلکہ پچھلے تیس سال میں اس خطے

میں جو بین الاقوامی سازشیں ہو رہی ہیں۔ ان کے شدید ترین ناقد بھی ہیں۔ اس جنگ میں کون کیا کر رہا ہے اور کس کا کیا کردار ہے، وہ اس کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں۔ محمود خان اچکزئی سے ہونے والا یہ مکالمہ نہ صرف معروضی صورتحال کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے بلکہ اس میں مستقبل کے خدوخال بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

محمود خان اچکزئی پختونخواہ ملی عوامی پارٹی کے سربراہ ہیں جس کی جڑیں بلوچستان میں ہیں اور ایک نقطہ نظر تو یہ بھی ہے کہ قبائلی علاقوں کے بعد یہ جنگ بلوچستان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔ چنانچہ ضروری تھا کہ ان سے اس حوالے سے بھی بات کی جائے اور بلوچستان میں کسی بھی تبدیلی کے حوالے سے ان کی پارٹی کا موقف بھی سمجھا جائے۔ آیئے دیکھتے ہیں وہ کیا کہتے ہیں:

س: پاکستان خصوصاً پشتون بیلٹ آج جس دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے، اس کا ذمہ دار کون ہے؟

ج: اس کی ذمہ داری ان حکمرانوں اور انٹیلی جنس اداروں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے ذاتی مفادات اور حکومتوں پر قابض رہنے کے لیے پاکستان کو انتہا پسندوں اور دہشت گردوں کے ٹھکانے میں تبدیل کیا۔ پاکستان نے اپنی خارجہ پالیسی انٹیلی جنس اداروں خصوصاً آئی ایس آئی کے ذریعے چلائی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام سیاستدانوں یا پارلیمنٹ کی خواہشات کے برعکس فوجی حکمت عملی کے تحت دوسرے ممالک خصوصاً پڑوسیوں کی مخالفت کی بنیاد پر پالیسیاں بنائی گئیں جس کے سبب آج پاکستان بدترین سیاسی، معاشی اور معاشرتی مشکلات اور پیچیدگیوں سے دوچار ہے۔ افغانستان اور بھارت کے ساتھ جان بوجھ کر حالات خراب کیے گئے اور اب تو حالت یہ ہے کہ ہم عالمی گھیراؤ اور مزاحمت کی صورتحال سے دوچار ہو کر رہ گئے ہیں۔ کسی کو سمجھ نہیں آ رہا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور ہمارا مستقبل کیا ہے؟

س: آپ آئی ایس آئی پر بار بار تنقید کیوں کرتے ہیں۔ آج بھی آپ کا فوکس یہی ادارہ لگتا ہے؟

ج: دیکھیے جب تک آئی ایس آئی سیاسی اور حکومتی معاملات میں انٹیلی جنس ادارے کی مینڈیٹ سے تجاوز کر کے فریق بننے کی پالیسی پر چلتی رہے گی ہر پاکستانی کو اس کی مخالفت

کرنی ہوگی۔ انٹیلی جنس اداروں کا کام حکومتوں کو گرانا، بٹھانا اور دبانا نہیں ہوتا۔ آئی ایس آئی کو بدقسمتی سے اس مقصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ ہم اس ادارے کے سیاسی کردار کی مخالفت کرتے ہیں اور اس کردار کو پاکستان کی تباہی اور نقصان کا سبب سمجھتے ہیں۔ اس ادارے کو اپنے مینڈیٹ کا احترام کرتے ہوئے اپنے کردار کو محض اطلاعات کی فراہمی تک محدود رکھنا چاہیے تھا۔

جن حکمرانوں نے اس ادارے کو اقتدار کے حصول اور طوالت کے لیے استعمال کیا انہوں نے بھی اس ادارے کی ساکھ اور شہرت کو نقصان پہنچایا۔ ہمارا مشورہ ہے کہ آئی ایس آئی سیاسی اور حکومتی معاملات اور دوسرے ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے گریز کرے۔ ایسا کرنے سے پاکستان کو درپیش داخلی اور خارجی مسائل اور مشکلات میں کمی واقع ہوگی اور اس ادارے کی ساکھ بھی بہتر ہوگی۔

س: آپ انتہاپسندی اور دہشت گردی کی ذمہ داری آئی ایس آئی پر کس طرح ڈال سکتے ہیں؟

ج: افغانستان میں امریکہ، عربوں اور دوسروں کی جنگ افغان عوام اور پڑوسی ملک سوویت یونین کے خلاف کس نے لڑی؟ افغانستان کے لیے مجاہدین کی بھرتی اور اسلحہ کی فراہمی کا کام کس نے کیا؟ افغانستان کے لیے پشاور اور اسلام آباد میں عبوری حکومتیں کس نے قائم کیں۔ افغان اور دوسرے مجاہدین کو تربیت کس نے دی۔ مجاہدین کے بعد طالبان کو افغانستان بھیجنے کا اقدام کس نے اٹھایا۔ یہ وہ تمام سوالات ہیں جن کے جوابات آپ سمیت سب کو معلوم ہیں۔ آئی ایس آئی ان تمام واقعات کی ایک فریق رہی ہے۔ ہم اس ادارے کے کیے کی سزا ابھی تک بھگت رہے ہیں۔ یہ حکومت، عوام اور پارلیمنٹ سے ماورئی کردار ادا کرتی آئی ہے۔ ایک پاکستانی کی حیثیت سے یہ ہمارا آئینی اور انسانی حق بنتا ہے کہ ہم ایسے اداروں کو ان کا مینڈیٹ یاد دلائیں۔

س: کیا اس تمام صورتحال کی ذمہ داری محض اس ادارے ہی پر عائد کرنا مناسب ہوگا؟

ج: عملی کارروائیاں تو یہی ادارہ کرتا رہا ہے۔ یہ اطلاعات کی فراہمی اور مشاورت، تجاویز کے کام تک محدود رہتا ہے تو اس کی مخالفت نہیں کی جائے گی۔ اس ادارے کو ان پاکستانی

حکمرانوں نے بطور خاص استعمال کیا جن کو عوام اور پارلیمنٹ کا مینڈیٹ حاصل نہ تھا۔ ایسے حکمرانوں نے اپنے اقتدار کے جواز کے لیے پڑوسیوں کے ساتھ تعلقات خراب کیے جبکہ دوسری طرف ملک کے اندر ایسے گروپوں کی سرپرستی کی جو کہ مذہب اور جہاد کے نام پر سیاست کر کے منافرت پھیلاتے تھے۔ فوجی حکمران اور انٹیلی جنس ادارے ہی موجودہ دہشت گردی، سیاسی عدم استحکام اور اقتصادی بدحالی کے ذمہ دار ہیں۔ آج اگر ہم اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں تو یہ اس ملک کے ساتھ دشمنی کے مترادف بات ہوگی۔ ہمیں تلخ حقائق اور غلطیوں کا احساس اور اعتراف کرنا ہی چاہیے۔

س: آپ نے دوسروں کے برعکس افغانی طالبان کی ابتداء ہی سے مخالفت کی پالیسی کس بنیاد پر اپنائی ہوئی تھی؟

ج: طالبان کو پاکستان ہی نے مداخلت کی بنیاد پر افغان عوام پر مسلط کر کے ایک جارحانہ اقدام اٹھایا تھا۔ اب یہ بات راز نہیں رہی کہ پاکستان کے بعض مذہبی رہنما اور جاسوس اداروں کے عہدیداران نہ صرف یہ کہ طالبان کی دریافت کا دعویٰ کرتے رہے بلکہ اس کارنامے پر فخر کر کے ایک دوسرے سے بازی لینے میں بھی مصروف عمل رہے۔ آپ کو یہ حق کس نے دیا کہ آپ ایک اور ملک کے اندرونی معاملات اور سیاست میں اس طرح کھلے عام مداخلت کرتے رہے۔ طالبان کو تمام ہدایات پاکستان سے ملا کرتی تھیں۔ ہمیں ان فوجی افسران کے نام ایک ایک کر کے یاد ہیں جنہوں نے طالبان کو بنایا، فنڈز دیئے، احکامات دیتے رہے اور ان کی پالیسیاں ترتیب دیتے رہے۔ ہم افغانستان میں مداخلت کر کے اپنا ریاستی ڈھانچہ اور سیاسی نظام تباہ کر بیٹھے ہیں۔ ہم نے سیاسی معاملات، فوجی اور جاسوسی طریقوں سے نمٹانے کی پالیسی اپنا کر دوسروں کے بجائے خود کو ہی بہت نقصان پہنچایا۔ ہم طالبان کی اس لیے مخالفت کرتے رہے کہ وہ جمہوریت اور انسانیت کی مخالفت کی پالیسیاں اپنا کر افغانستان کے علاوہ پاکستان اور یورپی دنیا کے لیے خطرہ بنے ہوئے تھے۔ وقت اور حالات نے ہمارے خدشات کو حرف بہ حرف درست ثابت کیا۔

س: القاعدہ کے کردار اور عزائم کو آپ کس نظر سے دیکھ رہے ہیں؟

ج: القاعدہ کے بارے میں تو اب کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہی۔ اس قوت نے افغانستان

کی سرزمین کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر کے اس پورے خطے کی سلامتی کو داؤ پر لگایا۔ طالبان کے بقول القاعدہ کے لیڈروں کو انہوں نے مہمانوں کے طور پر ملک میں رہنے دیا۔ تاہم القاعدہ نے اس مہمان نوازی کا یہ صلہ دیا کہ امریکہ پر حملہ کر کے (القاعدہ خود مانتی ہے) افغانستان پر امریکی چڑھائی کا راستہ ہموار کر دیا۔ دنیا بھر کے انتہاپسند القاعدہ اور طالبان کی چھتری تلے افغانستان اور ہمارے قبائلی علاقوں میں جمع ہو گئے اور اب حالت یہ ہے کہ امریکہ سمیت پوری دنیا القاعدہ کے لیڈر امریکی دھمکی اور مطالبے کے بعد افغانستان سے نکل گئے ہوتے تو نہ امریکہ آتا اور نہ ہی یہ خطہ اتنے بڑے خطرے سے دوچار ہوتا۔ القاعدہ کو افغانستان کے جید علماء حتیٰ کہ متعدد طالبان نے بھی افغانستان سے نکلنے کا مشورہ دیا تھا، تاہم ملا عمر نے اس اقدام کو افغان روایات کی خلاف ورزی قرار دے کر اپنے ملک کو عالم برادری کے مدمقابل لا کھڑا کر دیا۔ حالانکہ طالبان کا افغان روایات اور ثقافت سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔

س: آپ کس دلیل کی بنیاد پر افغانستان میں امریکی مداخلت کی حمایت کرتے ہیں؟

ج: پہلی بات تو یہ ہے کہ افغانستان میں بیٹھے القاعدہ اور طالبان رہنما نے نائن الیون کی ذمہ داری قبول کی۔ دوسری بات یہ کہ افغانستان واقعتاً انتہاپسندوں اور دہشت گردوں کا گڑھ بن چکا تھا۔ طالبان اور ان کے استاد نہ تو کسی کو جوابدہ تھے نہ سفارتی آداب کو مانتے تھے اور نہ ہی دنیا سے ڈیلنگ پر یقین رکھتے تھے۔ ایسی صورتحال میں عالمی برادری کے لیے ان کی حکومت کو ہضم کرنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ تاثر ہی غلط ہے کہ صرف امریکہ القاعدہ یا طالبان کے خلاف لڑنے آیا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ پچاس کے قریب ممالک نے اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم سے اس مینڈیٹ کی منظوری دی تھی کہ افغانستان سے انتہاپسندوں کا خاتمہ کیا جائے۔ میں موجودہ حالات کی ذمہ داری ان قوتوں پر بھی ڈالتا ہوں جنہوں نے افغانستان میں عالمی مداخلت کا راستہ ہموار کیا۔ آپ میرے دشمنوں کو اپنے گھر یا گاؤں میں پناہ دیں گے تو مجھے بھی یہ حق حاصل ہے کہ میں اپنے دشمنوں کے علاوہ آپ کو بھی نشانہ بناؤں۔

س: یہ تاثر کہاں تک درست ہے کہ پشتون انتہاپسندی یا تشدد پر یقین رکھتے ہیں؟

ج: یہ تاثر قطعاً غلط ہے۔ پشتونوں کی جمہوریت پسندی اور امن پسندی سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ پشتون کبھی بھی انتہا پسند یا ظالم نہیں رہے۔ اعتدال پسندی، جمہوری مزاج، احترام انسانیت اور شاندار ثقافتی رویئے پشتونوں کے قومی مزاج اور تاریخ سے متعلق وہ حقائق ہیں جن سے ان کے مخالفین بھی انکار نہیں کرتے۔ دوسروں کی مداخلت مذموم مقاصد اور سازشوں کو آپ اس قوم کے کھاتے میں نہیں ڈال سکتے۔ یہ مسلمانوں میں وہ واحد قوم ہے جس کے قریب سے بھی کبھی فرقہ واریت نہیں گزری۔ دوسروں کی رائے، مذہب قومیت اور زبان کا احترام کرنا تو ہماری وہ روایت رہی ہے جو کسی بھی دوسری قوم میں نہیں پائی جاتی۔ اگر آپ طالبان کے نام پر جاری انتہاپسندی اور دہشت گردی کو پشتونوں کا قومی مزاج سمجھتے ہیں تو یہ بڑی زیادتی والی بات ہوگی۔ پشتونوں میں ذبح کرنے، بچوں، بوڑھوں کو مارنے، لاشوں کی بے حرمتی کرنے اور حجروں، مساجد کو اڑانے جیسی بزدلانہ حرکتوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

س: بلوچستان میں جاری مزاحمت کی وجہ کیا ہے اور اگر بلوچ الگ ہوتے ہیں تو پشتونوں کا ردعمل کیا ہوگا؟

ج: بلوچوں کے ساتھ بہت زیادتیاں ہوتی رہی ہیں۔ آپ نہ تو ان کے حقوق مانتے ہیں نہ ان کو برابری کی نظر سے دیکھتے ہیں نہ ان کے وسائل میں ان کا حصہ دیتے ہیں اور نہ ہی ان کی محرومیوں اور قومی مسائل کا نوٹس لیتے ہیں۔ ایسی صورتحال میں آپ ان سمیت کسی سے بھی تعاون، حب الوطنی اور مثبت ردعمل کی توقع نہیں کر سکتے۔ آپ نے بلوچوں سمیت دوسری قومیتوں کے حقوق سلب کر کے محض اسلام آباد اور لاہور کے مفادات کو مقدم رکھ کر ان کو تیسرے درجے کے شہریوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اگر کوئی اپنے حق کی بات کرتا ہے تو اسے نواب اکبر خان بگٹی کی طرح شہید کر دیتے ہیں۔ ایسی صورتحال میں ناراضگی اگر مزاحمت اور بغاوت کی صورت اختیار کرتی ہے تو اس میں حیرت کی کونسی بات ہے۔ مضبوط مرکز نے پاکستان کے وفاقی ڈھانچے، تصور اور مستقبل کو سنگین خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔ جہاں تک سوال کے دوسرے حصے کا تعلق ہے تو کوئی بھی قوم پرست نہیں چاہے گا کہ کوئی بھی قوم موجودہ وفاقی ڈھانچے سے الگ ہو۔ اس کے باوجود اگر بدقسمتی سے ایسا ہوتا ہے تو آپ کو

معلوم ہونا چاہیے کہ بلوچستان دو بڑی قوموں پر مشتمل صوبہ ہے۔ پشتون اور بلوچ الگ الگ جغرافیائی حدود میں اپنی اپنی شناخت اور آبادی کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔ نہ ہمارا ان پر کوئی دعویٰ ہے اور نہ ہی وہ ہمارے مفادات کے راستے میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے علاقوں، مفادات، وسائل اور دوسرے معاملات کا احترام کرتے آئے ہیں۔ اگر پاکستان کو موجودہ فارمولے کے تحت چلایا جاتا رہا تو مسئلہ صرف بلوچستان کی علیحدگی تک محدود نہیں رہے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ 1940ء کی قرارداد مقاصد کے تحت ایک وفاقی پارلیمانی نظام کا قیام عمل میں لایا جائے اور قومیتوں کو ان کے وسائل کی بنیاد پر حقوق دیئے جائیں۔

س: کیا پشتون بھی پاکستان سے الگ ہونے کی بات سوچ رہے ہیں؟

ج: ہم کسی صورت نہیں چاہتے کہ پاکستان کی جغرافیائی ساخت تبدیل ہو۔ یہ ہمارا ملک ہے۔ بات محض ایک دوسرے کے حقوق، سلامتی، احترام اور وسائل کی تقسیم کی ہے۔ چار کروڑ پشتونوں کے جغرافیائی، افرادی، جمہوری اور اقتصادی حقوق کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر افغانستان میں مداخلت کا سلسلہ ختم کیا جائے اور پاکستان کے پشتونوں کا ان کا جائز مقام دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ اہم اور باصلاحیت قوم پاکستان سے علیحدگی کی بات سوچے۔ تاہم ایسا نہ ہونے کی صورت میں کچھ بھی ممکن ہے۔ ماضی میں بھی ایسا ہوتا آیا ہے اور مستقبل میں بھی ایسا ہونے کا امکان اور خدشہ موجود ہے۔ آج کل اگر پشتون قوم دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے تو اس صورتحال کی ذمہ داری سے بھی پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کو بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح یہ بھی اٹل حقیقت ہے کہ ہم افغانستان کے معاملات اور تبدیلیوں سے بھی خود کو الگ تھلگ نہیں رکھ سکتے۔ میرے خیال میں پشتونوں کو آج اپنی بقاء، سلامتی اور مستقبل سے متعلق انتہائی بنیادی مسائل اور پیچیدگیوں کا سامنا ہے اور بہت سے تلخ، فوری اور اہم فیصلے کرنے کا وقت بھی آ پہنچا ہے۔

✿ ✿ ✿ ✿

دہشت گرد فاٹا میں روکے جاتے تو آج پاکستان کی سلامتی خطرے سے دوچار نہ ہوتی: اسفندیار ولی

س: دہشت گردی کی جاری لہر کی ذمہ داری کس پر ڈالی جا سکتی ہے؟

ج: یہ سلسلہ چند برسوں کے حالات کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کی ابتدا 80 کی دہائی میں اُس وقت کی گئی تھی جب پاکستان، امریکہ، خلیجی ممالک اور متعدد دوسری ریاستوں نے افغانستان میں روسی مداخلت کے بہانے پاکستان کو جہادیوں کے مرکز میں تبدیل کر دیا تھا اور پوری دنیا کے جہادی اور اُن کے سرپرستوں کو پاکستان میں اکٹھا کر کے افغانستان بھیجنے کے ایک سلسلے نے ایک باقاعدہ ریاستی پالیسی کی صورت اختیار کر لی۔ پاکستان کے آمر حکمرانوں نے اپنی حکومتوں کے قیام کو جواز فراہم کرنے اور ان کو طول دینے کے لیے ہر دور میں جہاد اور مداخلت کا راستہ اپنا کر اس ملک کو موجودہ خطرناک صورتحال سے دوچار کرنے کی جو حکمتِ عملی اپنائی تھی اُس نے اب اس ملک کی سلامتی اور استحکام کو ایک سوالیہ نشان بنا دیا ہے۔ موجودہ صورتحال کی ذمہ داری ہر اُس فرد، طبقے، گروپ، پارٹی اور حکومت پر ڈالی جا سکتی ہے جس نے جہاد کی پالیسی کو پاکستان نامی ریاست کی بنیادوں میں شامل کر دیا۔ جو لوگ جہاد کے کل سرپرست تھے ان میں سے اکثریت آج بھی جہاد، دہشت گردی، فرقہ واریت اور انتہا پسندی کی سرپرستی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

س: اے این پی پر الزام ہے کہ 80 کی دہائی میں اس پارٹی نے روس کی حمایت کی تھی۔ کیا یہ درست ہے؟

ج: ہم نے روس کی حمایت نہیں کی تھی ہم اس بات کے مخالف تھے کہ افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے گریز کیا جائے اور روس، امریکہ کی جنگ میں فریق بننے کی غلطی نہ کی جائے۔ ہم اُس جنگ کو کفر اور اسلام کی لڑائی کی بجائے دو طاقتوں کی رنجش کی جنگ قرار دے رہے تھے۔ اب کوئی جہاد کے حامیوں سے پوچھے کہ اگر روس کافر تھا تو امریکہ کہاں کا مسلمان ملک تھا؟ کل یہ لوگ روس کے خلاف تھے آج اپنے سابقہ اتحادی امریکہ کے خلاف لڑ رہے ہیں بلکہ اب تو حالت یہ ہے کہ یہ امریکہ سے زیادہ پاکستان اور افغانستان کے مسلمانوں اور معصوم شہریوں کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ اگر انہوں نے امریکہ کو افغانستان سے نکالنا ہے تو ہمارے دوسرے دلائل سے قطع نظر ایک عام آدمی کا سوال یہی ہو سکتا ہے کہ ان دہشت گرد عناصر نے امریکی کتنے مارے ہیں اور بے گناہ مسلمانوں کا کتنا خون بہایا ہے؟ فوجی آمروں کی جہادی اور فسادی پالیسیوں نے پاکستان کو بڑی آزمائش اور صبر آزما جنگ میں دھکیل دیا ہے اور پاکستان کی سلامتی کو شدید مشکلات سے دوچار کیا ہے۔ یہاں میں یہ بھی پوچھنا چاہوں گا کہ جب روس افغانستان سے نکل گیا تو جن جہادیوں نے اُس کے خلاف جہاد کیا تھا انہوں نے افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا کر لاکھوں افراد کا خون کس دلیل کی بنیاد پر بہایا تھا؟

س: کیا آپ کو پاکستان کی خارجہ پالیسی پر اختلاف ہے جبکہ آپ فارن افیئر کمیٹی کے چیئرمین بھی ہیں؟

ج: میں کمیٹی کے چیئرمین کے علاوہ اے این پی نامی اُس سیاسی جماعت کا سربراہ بھی ہوں جس کا ابتداء ہی سے یہ موقف رہا ہے کہ افغانستان اور بھارت سمیت تمام ممالک سے بہتر تعلقات پاکستان کے سیاسی، ریاستی اور اقتصادی مفاد میں ہے ہم اپنے پڑوسیوں کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ ہم برابری اور عدم مداخلت کے فارمولے

پر چل کر اس خطے میں امن اور استحکام لا سکتے ہیں یہی بات ہم دوسرے ممالک کو بھی کہتے آئے ہیں۔

س: آپ کئی برس قبل کہہ رہے تھے کہ افغانستان کی جنگ پاکستان منتقل ہو گی اس کا کیا پس منظر تھا؟

ج: کاش کہ میری یہ بات یا یہ پیشگوئی غلط ثابت ہو جاتی۔ میں ایک سیاسی کارکن اور تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے کئی برس قبل اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ انتہاپسندی کی جو لہر افغانستان سے اُٹھی تھی وہ وہاں تک محدود نہیں رہے گی۔ بنیادی وجہ یہ تھی کہ دہشت گرد ڈیورنڈ لائن کے دونوں اطراف میں موجود تھے بلکہ یہاں سے ماضی میں ان کو سپورٹ بھی فراہم کی جا رہی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ہمیں دوسروں کے برعکس جہادیوں کے عزائم، اہداف اور نیٹ ورک کا علم تھا۔ اگر پاکستان کے ریاستی ادارے ابتدا میں ان عناصر کو فاٹا میں ختم کر دیتے تو یہ لوگ فاٹا سے صوبہ پختونخواہ اور یہاں سے پاکستان کے دوسرے علاقوں میں نہ جاتے۔ ابتدا میں ہماری بات، ہماری فریاد اور ہمارے موقف کو ملک گیر سطح پر سنا اور سمجھا جاتا تو شاید کہ آج ہم موجودہ بدترین صورتحال سے دوچار نہ ہوتے۔ میں واضح کر دوں کہ دوسری سیاسی قوتوں یا دوسرے صوبوں کے عوام کو دہشت گردوں کے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا رہنے کی بجائے جاری جنگ پر دوسرے اختلافات سے قطع نظر یکسو اور متحد ہو کر دہشت گردوں کا مقابلہ کرنا چاہیے ورنہ پاکستان چلنے کے قابل بھی نہیں رہے گا۔ ہم اس وقت اپنے صوبے کے ساتھ ساتھ پاکستان کی سلامتی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

س: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ طالبان سے جنگ کرنے کے بجائے مذاکرات کا سلسلہ شروع ہونا چاہیے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

ج: جو لوگ ایسا کہہ رہے ہیں کیا وہ بھول رہے ہیں کہ ہم نے کئی مہینوں تک خلوصِ دل کے ساتھ مذاکرات ہی کا راستہ اپنایا ہوا تھا۔ آپ سمیت پورا ملک اور عالمی برادری

اس مذاکراتی عمل پر کس قدر ناراضگی اور خدشات ظاہر کرتے رہے۔ ہمیں تو گالیاں بھی سننی پڑی تھیں۔لوگ ہمیں طعنے دے رہے تھے۔ہم نے ان کے جائز مطالبات مانے تھے ان کے جرگے کیے تھے اور اس کے بدلے ملکی اور عالمی رائے عامہ کی سخت مخالفت مول لی تھی۔ مذاکراتی عمل کا صلہ جنگجوؤں نے ہمیں بونیر پر چڑھائی کرنے کی صورت میں دیا۔ جو لوگ مذاکرات کی بات کرتے ہیں وہ جنگجوؤں سے بھی تو پوچھ لیں کہ وہ اس کے لیے تیار ہیں یا نہیں اور اگر ہیں تو سوات معاہدے کے بعد ان لوگوں نے بونیر پر چڑھائی کیوں کی تھی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان لوگوں کے ساتھ اُس وقت تک کوئی بات یا رعایت نہیں کی جائے گی جب تک وہ ریاستی رٹ تسلیم کر کے ہتھیار نہیں رکھتے۔ مذاکرات کی بات کرنے والے کنفیوژن نہ پھیلائیں۔

س: کیا آپ پاک فوج کی کارروائیوں سے ایک بڑے متاثرہ فریق کی حیثیت سے مطمئن ہیں؟

ج: اگر ہم حکومتی اور عسکری قیادت کی پالیسی اور کردار سے مطمئن نہ ہوتے تو اے این پی آج موجودہ ریاستی سیٹ اپ کا حصہ نہ ہوتی۔ ہم سب فریقین کے درمیان بنیادی ایشوز پر اچھی انڈرسٹینڈنگ موجود ہے۔ دیکھیں آج پاکستان غیر معمولی صورتحال سے دوچار ہے اگر ہم نے ایک دوسرے پر اعتماد کر کے ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دیا اور ملک کی سلامتی کے حوالے سے جرأت سے فیصلے نہیں کیے تو ملک سنگین حالات سے دوچار ہو جائے گا۔ مجھے اُن سیاسی قوتوں اور افراد پر حیرت ہوتی ہے جن کو ان خطرات کا ادراک نہیں ہے جن کا آج پاکستان کو سامنا ہے۔ اے این پی نے حقیقتاً بڑی قربانیاں دے کر پاکستان کی سلامتی اور استحکام کی ذمہ داری اس جنگ کے ایک متاثرہ فریق کے طور پر اپنے سر پر لے کر بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ ہم سوات کے بعد وزیرستان آپریشن کے طریقۂ کار اور نتائج سے بھی مطمئن ہیں۔

س: بعض حلقوں کا خیال ہے کہ اے این پی امریکی پالیسیاں آگے بڑھا رہی ہے اس میں کہاں تک صداقت ہے؟

ج: اے این پی کسی اور کے بجائے اپنی وہ پالیسیاں آگے بڑھا رہی ہے جن کی بنیاد عظیم باچا خان نے فلسفہ عدم تشدد اور خان عبدالولی خان نے جمہوریت پسندی کی شکل میں عوام کی رائے کو سامنے رکھ کر رکھی تھی۔ ہم اپنی دھرتی پر امن، جمہوریت اور خوشحالی چاہتے ہیں ایسے میں ہم پر اُس قوت کا خیر مقدم کرتے ہیں جو ہمارے بنیادی موقف کی تائید کرے۔ ہم تو زندگی اور قوت کی صورتحال کا سامنا کر رہے ہیں۔ لاکھوں لوگوں نے امن کے قیام اور صوبے کی ترقی کے نام پر گزشتہ الیکشن میں اے این پی پر اعتماد کیا تھا ان کے ساتھ کیے گئے وعدے پورے کرنا ہمارا فرض اور مقصد ہے۔ میرے خیال میں اب اس بحث کی گنجائش ہی نہیں رہی کہ آیا ہم اپنی جنگ لڑ رہے ہیں یا کسی اور کی۔ ہم اُن لوگوں کے خلاف لڑ رہے ہیں جنہوں نے پشاور، سوات، فاٹا، پنڈی، لاہور اور کراچی میں ہزاروں بے گناہ لوگوں کا خون بہایا ہے۔

س: کیا وجہ ہے کہ حکومت اور فورسز کے اقدامات کے باوجود دہشت گردی ختم نہیں ہو رہی؟

ج: دیکھیں ہمارے آمر حکمرانوں اور بعض قوتوں نے جن جہادیوں کو 30 سال میں پروان چڑھایا ان کا خاتمہ شاید چند مہینوں میں ممکن نہ ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ موجودہ ریاستی قیادت سنجیدگی کے ساتھ ان عناصر کے خاتمے پر متفق ہے۔ اس سے قبل عملاً کوئی بڑی کارروائی نہیں ہوئی۔ ہزاروں کو مارا جبکہ سینکڑوں کو گرفتار کیا جا چکا ہے۔ جہاں ان کی موجودگی کی اطلاع ملتی ہے وہاں کارروائی کی جاتی ہے۔ عوام کی اکثریت نہ صرف ان کی مخالف کر رہی ہے بلکہ ان کے خاتمے اور امن کے قیام کا مطالبہ بھی کر رہی ہے۔ وہ بوکھلاہٹ کی حالت میں کارروائیاں کر رہے ہیں۔ اگر ریاستی اداروں، سیاسی، مذہبی قوتوں اور عوام کا یہ اعتماد اور رابطہ قائم رہا تو بہت جلد ان کا خاتمہ ہو جائے گا۔

س: مختلف لوگ آپ کی غیر موجودگی پر اعتراضات کرتے دکھائی دے رہے ہیں آپ کیا کہنا چاہیں گے اس ضمن میں؟

ج: آپ سمیت سب کو علم ہے کہ مجھ پر نہ صرف ایک بڑا خودکش حملہ کیا گیا بلکہ مجھ سمیت پارٹی کے کئی لیڈروں اور وزراء کو نشانہ بنانے کے علاوہ عملی اقدامات بھی کیے گئے۔ ہمارے دو ایم پی ایز کے علاوہ سینکڑوں کارکنوں کو شہید کیا گیا۔ میں اگر زیادہ سرگرمیوں میں نظر نہیں آ رہا تو اس کی وجہ پارٹی کا وہ فیصلہ ہے جس کے ذریعے مجھے محتاط رہنے کا کہا گیا تھا ہماری پارٹی میدان میں کھڑی ہے، مقابلہ کر رہی ہے، قربانیاں دے رہی ہے اور ظاہر ہے کہ میں اس پارٹی کا ایک حصہ ہوں۔

س: صدر آصف علی زرداری اور آرمی چیف پرویز کیانی کے اقدامات اور ان کے ساتھ آپ کی انڈرسٹینڈنگ پر کیا بتانا پسند کریں گے؟

ج: ہم سب موجودہ سیٹ آپ کا حصہ ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کی جتنی ضرورت ہے اُس کا سب کو علم ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض تبصروں کے برعکس فریقین کے درمیان انڈرسٹینڈنگ موجود ہے سب کو اپنے فرائض، کردار اور حدود کا ادراک ہے۔ میں اس تاثر سے اتفاق نہیں رکھتا کہ جنرل کیانی جمہوری نظام کو پٹڑی سے اُتارنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ میں نے ان کو ایک پیشہ ور سپہ سالار کی شکل میں دیکھا ہے۔ جہاں تک صدر زردای کا تعلق ہے وہ سب کو ساتھ لے کر چلنے پر یقین رکھنے والے شخص ہے۔ ہمیں عوام کی رائے اور اعتماد کا احترام کرتے ہوئے نظام کے استحکام کے لیے مشترکہ کام کرتے ہوئے ماضی کے برعکس مثبت رویہ اپنانا ہوگا۔ این آر او اور صدر کی تقاریر کی آڑ میں ہمیں صدر زرداری کی مخالفت میں اُس حد تک نہیں جانا چاہیے جہاں پر نظام کو خطرہ لاحق ہو سکے۔ میں جمہوریت اور موجودہ حکومت کو کوئی خطرہ آتے نہیں دیکھ رہا کیونکہ نظام کے چلنے میں ہی ملک اور اس کی سلامتی کا راز مضمر ہے۔

✿ ✿ ✿ ✿

دہشت گرد ہتھیار ڈال دیں یا مرنے کیلئے تیار ہو جائیں: اطہر عباس

ڈائریکٹر جنرل انٹر سروسز پبلک ریلیشنز (ڈی جی آئی ایس پی آر)

میجر جنرل اطہر عباس کو پاکستان فوج کے ترجمان کی حیثیت سے انتہائی اہم شخصیت قرار دیا جاتا ہے کیونکہ وہ نہ صرف پوری فورس کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیتے ہیں بلکہ وہ فوجی کارروائیوں سے متعلق ملکی اور عالمی میڈیا کے سوالات' خدشات' تنقید اور تجاویز کا جواب دینے جیسے مشکل ٹاسک کو نبھانے اور نمٹانے کی ذمہ داری بھی نبھا رہے ہیں۔

ایک ایسے وقت میں جبکہ پاکستان آرمی کو ملک کے اندر دہشت گردی اور سازشوں کا سامنا کرنے کے علاوہ عالمی دباؤ اور خدشات کا بھی سامنا ہے' پاک فوج کے ترجمان کی حیثیت سے ان امور کو نمٹانا اور دوسروں کو قائل کرنا یقیناً ایک مشکل کام ہے۔

فوج چونکہ انتہائی منظم ادارہ ہے۔ اس لیے اس سے متعلق معاملات کو ڈیل کرنا کوئی عام آفیسر کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ میجر جنرل اطہر عباس نے انتہائی نامساعد ملکی اور عسکری حالات میں اپنے عہدے کا چارج سنبھالنے کے بعد فوج کا امیج بہتر بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا کیونکہ ان کی بات' دلیل' معلومات اور تجزیے کو محض ایک اعلیٰ فوجی آفیسر کی رائے کے طور پر نہیں لیا جاتا بلکہ ان کی ہر بات کو فوج اور اس کی پالیسیوں کی ترجمانی کے طور پر ذمہ داری اور سنجیدگی سے لیا جاتا ہے۔

اطہر عباس نہ صرف یہ کہ ایک متحرک شخصیت ہیں بلکہ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسروں کے برعکس میڈیا کے لیے آسانی کے ساتھ دستیاب ہو کر میڈیا اور فورسز کے درمیان ایک مضبوط پل کا کردار بھی احسن طریقے سے نبھاتے ہیں۔ وہ کسی بھی سوال کا نہ صرف یہ کہ برانہیں مناتے بلکہ وہ جامع اور موثر طریقے سے مدمقابل کے سوالات یا خدشات کا اعداد و شمار اور حقائق کے تناظر میں جواب دیتے ہیں۔ ان کی کارکردگی' رویئے' ڈیلنگ اور فرینڈلی اپروچ نے ان کی شخصیت کو متعلقہ حلقوں میں کافی مقبول بنا دیا ہے۔

امید ہے کہ اس نشست سے قارئین اور دوسرے متعلق حلقوں کو فوج کی پالیسیوں' اقدامات اور مختلف علاقوں میں جاری فوجی کارروائیوں کے بارے میں کافی مفید معلومات حاصل ہوسکیں گی۔

س:۔ جنرل صاحب یہ بتا دیجیے گا کہ پاک فوج اپنی اہلیت' کمٹمنٹ اور کارکردگی کے لحاظ سے آج عالمی رینکنگ کے حوالے سے کہاں کھڑی ہے؟

ج:۔ پاک فوج کا شمار دنیا کی چند بہترین ڈسپلنڈ اور پروفیشنل فورسز میں ہوتا ہے۔ یہ دنیا کی بہترین فوج کہلاتی ہے کیونکہ ایک چھوٹے ملک میں اتنی پروفیشنل' تربیت یافتہ اور کمیٹڈ آرمی کا ہونا یقیناً کوئی عام یا معمولی بات نہیں۔ یہ پاکستان کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی محافظ ہے اور جب بھی وطن عزیز اور عوام کو اپنی فوج کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے آرمی اپنی کارکردگی کے حوالے سے عوام کی خواہشات اور امیدوں پر پوری اترتی ہے۔ خطے میں اس فورس کی اہمیت اور موجودگی کو دوسری طاقتوں کے لیے نظرانداز کرنا ممکن نہیں کیونکہ تمام تر بحرانوں اور اتار چڑھاؤ کے باوجود اس فورس کی کمٹمنٹ' کارکردگی یا اہلیت میں کوئی کمی یا تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس فورس کا اولین مقصد اور مشن یہی ہے کہ پاکستان کی سرحدوں اور عوام کے دفاع کو ہر صورت میں یقینی بنایا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے فوج نے اب تک بے پناہ قربانیاں دی ہیں اور یہ سلسلہ مستقبل میں بھی جاری رہے گا۔

س:۔ عالمی میڈیا اور بعض ممالک پاک فوج کے خلاف مختلف مواقع پر جو پروپیگنڈہ کرتے آئے ہیں' اس کی وجوہات آپ کی نظر میں کیا ہوسکتی ہیں؟

ج:۔ دیکھیے اس قسم کے پروپیگنڈے' الزامات کا جواب دینا اور اصل حقائق بتانا فوج کا

کام نہیں ہوتا۔ یہ ذمہ داری حکومت اور اس کے متعلق اداروں کو نبھانی پڑتی ہے۔ فوج کو دفاع سے متعلق امور پر ہی توجہ مرکوز رکھنی پڑتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ فوجی قیادت نے اس قسم کے الزامات یا خدمات کا بطور ادارہ نوٹ لینا یا جواب دینا زیادہ تر مواقع پر نظرانداز کرنے ہی کو ترجیح دی۔ جہاں تک میڈیا خصوصاً مغربی ذرائع ابلاغ کے رویئے کا تعلق ہے۔ ان کے مقاصد اور عزائم پر کسی لمبی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں بھی ان کے کسی الزام یا پروپیگنڈے کا جواب دینا ضروری سمجھا جاتا ہے وہ مناسب طریقے سے پاک فوج کے وقار کو سامنے رکھ کر دیا جاتا ہے۔ فوج اپنے مینڈیٹ اور پیشہ ورانہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے معاملات چلا رہی ہے۔ جب کسی ادارے کا مینڈیٹ' کردار اور اہداف واضح ہوں تو اس پر مخالفانہ رویوں' تبصروں یا پریشر کا کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔

س:۔ پاکستان کے ایٹمی اثاثوں اور مراکز پر بار بار خدشات کا اظہار کیا جاتا ہے کہ یہ محفوظ ہاتھوں میں نہیں ہیں؟

ج:۔ کیوں کا جواب دینے کی بجائے اگر اس کے نظام اور دفاع پر بات کی جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ دیکھئے پاکستان ایک مضبوط اور اہم ملک ہے۔ اس کے ایٹمی اثاثے اس ملک کے دفاع کے لیے حاصل کیے گئے ہیں۔ عوام ان اثاثوں اور اپنی فوج کی قوت کے بل بوتے پر اپنے ملک کی سلامتی اور دفاع سے مطمئن ہیں اور وہ اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ اس قسم کی افواہوں یا الزامات کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ فوجی اور حکومتی ذمہ داران بار بار یہ کہتے رہے ہیں کہ جو ملک تمام تر عالمی اور علاقائی دباؤ اور مشکلات کے باوجود ایٹم بم بنا سکتا ہے وہ اس کی حفاظت بھی کر سکتا ہے اور اس کی اہمیت اور دفاع سے بھی غافل نہیں ہو سکتا۔ افواہوں سے قطع نظر یہی بتانا کافی ہے کہ پاکستان کے ایٹمی اثاثے ایک مربوط' مضبوط اور محفوظ نظام کے باعث انتہائی حد تک محفوظ ہیں۔ اس سوال کا جواب دینا شاید اتنا ضروری نہیں کہ اس قسم کے خدشات کا اظہار کون لوگ کر رہے ہیں اور ان کے مقاصد اور دلائل کیا ہیں۔

س:۔ کیا یہ ضروری نہیں کہ اس قسم کی باتوں کا سخت نوٹس لیا جائے؟

ج:۔ حکومتی سطح پر سفارتی حدود اور پروٹوکول کے اندر رہتے ہوئے ہر موقع پر ایسی باتوں کا

مناسب طریقے سے جواب دیا جاتا رہا ہے۔ چونکہ آرمی حکومت اور عوام کا ایک ادارہ ہے اس لیے آرمی کی قیادت حکومت کے کام کو اپنے ہاتھ میں لینے کا غیر ضروری حصہ بننے سے اکثر مواقع پر گریز ہی کرتی ہے۔ یہ حکومت ہی کا کام ہے کہ وہ سفارتی سطح پر متعلقہ چینلز کے ذریعے ایسے معاملات پر اپنا ردعمل ظاہر کریں۔ اس کے باوجود ایسا بھی متعدد بار ہوا ہے کہ اعلیٰ عسکری قیادت نے بوقت ضرورت خود بھی اس قسم کے رویوں' بیانات' الزامات یا تبصروں پر ردعمل ظاہر کر کے اپنی پوزیشن کی وضاحت کی ہے۔

س:۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ فاٹا اور صوبہ سرحد میں دہشت گردی کا سلسلہ یکدم تیز کیوں ہوا؟

ج:۔ اس پر بہت کچھ کہا گیا ہے اور کہا بھی جا سکتا ہے۔ اس کی متعدد سیاسی' اقتصادی اور انتظامی وجوہات ہیں۔ ایک اہم خطے میں واقع ہونے کے باعث پاکستان کو بعض غیر ملکی طاقتوں کے رویئے اور پالیسیوں کے نتائج بھی بھگتنا پڑتے ہیں۔ سیاسی اور اقتصادی معاملات پر تبصرہ کرنا چونکہ میرے لیے مناسب نہیں اس لیے میں صرف اس بات پر توجہ مرکوز رکھ سکتا ہوں کہ پاکستان کو افغانستان کی تبدیلیوں' وہاں موجود مسلسل عدم استحکام اور اس پڑوسی ملک کے ساتھ لمبی اور ناقابل کنٹرول سرحد کی وجہ سے متعدد مشکلات اور پیچیدگیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ نائن الیون کے بعد پاکستان کے لیے سب سے اہم ایشو یہ رہا کہ وطن عزیز کے سرحدی اور نظریاتی مفادات کا تحفظ کیا جائے اور اپنی سرزمین کو محفوظ بنایا جائے۔ بدقسمتی سے اس سے قبل روس کی واپسی کے بعد جب افغانستان اور پاکستان کو عالمی برادری نے تنہا چھوڑ دیا تو اس سے مزید پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں۔ امریکہ اور دوسرے ممالک نے اس ذمہ داری اور معاونت کا مظاہرہ نہیں کیا جس کی اس خطے کو ضرورت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان اور افغانستان کے دونوں اطراف میں موجود علاقے غیر محفوظ ہو گئے اور نائن الیون کے بعد ان مشکلات یا پیچیدگیوں میں مزید اضافہ ہوگیا۔ اس کے علاوہ پاکستان کی حکومتوں اور فورسز کی کوشش رہی کہ معاملات کو مفاہمت' مذاکرات اور ڈائیلاگ کے ذریعے نمٹایا جائے۔ حکومتیں کوششیں کرتی رہیں کہ کسی بھی قبائلی علاقے میں فوجی کارروائیوں سے گریز کیا جائے کیونکہ ایسا ہونے سے مدعیان کے علاوہ عام آبادی بھی متاثر ہوتی ہے۔ تاہم اس مثبت

رویے اور پالیسی کو کمزور سمجھتے ہوئے حکومتی اور ریاستی رٹ کو کچھ اس طریقے سے چیلنج کیا گیا کہ بعض علاقے ہاتھ سے نکلتے دکھائی دینے لگے تو پھر فوج نے جب بھی پیش قدمی سے روکا یا مذاکرات کا راستہ اپنایا فوج نے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے حکومتی پالیسیوں کا احترام کیا کیونکہ فوج بذات خود حرکت نہیں کرتی' وہ عوام کے مطالبے پر حکومت کے فیصلے کے بعد ہی کوئی قدم اٹھاتی ہے۔ چونکہ فاٹا اور صوبہ سرحد کے علاقے افغان سرحد کے قریب واقع تھے اس لیے وہ دہشت گردی سے زیادہ متاثر ہوئے۔

س:۔ سوات آپریشن کی نوبت کیوں پیش آئی اور اس کی کامیابی کے اسباب کیا تھے؟

ج:۔ سوات میں کئی بار کارروائیوں کا آغاز کیا گیا۔ تاہم درمیان میں حکومتوں کے کہنے پر یہ کارروائیاں روکنی پڑیں۔ اس کے باوجود فوج وہاں موجود رہتے ہوئے حالات کے تناظر میں سول حکومتوں کے اقدامات اور احکامات کا انتظار کرتی رہی کیونکہ حکومت معاملات کو مذاکرات اور مفاہمت کے ذریعے حل کرنے میں مصروف تھی۔ آرمی نے اس کے باوجود مفاہمتی عمل کے دوران کارروائیوں سے گریز کیا کہ دہشت گرد فوجی دستوں اور مراکز پر حملے بھی کر رہے تھے کیونکہ فورسز نہیں چاہتی تھیں کہ مفاہمی یا سیاسی عمل کو کسی ردعمل کے باعث نقصان پہنچ جائے۔ اس تمام تر جذبے اور پالیسی کے باوجود جب مذاکراتی عمل ناکام ہوا اور حکومت نے عوام کے مطالبے پر علاقے کے تحفظ کے لیے فورسز کو کارروائی کی اجازت دے دی تو فوج کو اس فیصلے کا احترام کرنا پڑا اور پھر دنیا نے دیکھا کہ پاک فوج نے کتنی قربانیوں اور بہترین حکمت عملی سے اس علاقے میں دہشت گردوں کا خاتمہ کر کے حکومتی رٹ کو یقینی بنایا۔ اس تمام پراسس میں حکومت کی نیک نیتی کے علاوہ عوام کی معاونت نے بھی بنیادی کردار ادا کیا کیونکہ فوج عوام کی مدد اور سول حکومت کی مکمل معاونت کے بغیر اہداف حاصل نہیں کر سکتی۔ پاک فوج نے انتہائی مہارت سے چند ہی ہفتوں کے اندر علاقے کو محفوظ بنا کر یہ ثابت کیا کہ دہشت گرد کتنے ہی طاقتور کیوں نہ ہوں' وہ عوام' حکومت اور فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

س:۔ اگر سوات میں امن قائم ہو گیا ہے تو فوج وہاں سے نکلتی کیوں نہیں؟

ج:۔ فوج ایک بھی دن کے لیے سوات سمیت کسی بھی شورش زدہ علاقے میں ٹھہرنے کا

ارادہ نہیں رکھتی۔ چونکہ وہاں پر سول ادارے تاحال پوری طرح فعال اور متحرک نہیں ہوئے۔ اس لیے فوج کو وہاں ٹھہرنا پڑا ہے۔ آرمی چیف متعدد بار کہہ چکے ہیں کہ سوات کے عوام کو مکمل طریقے سے تحفظ فراہم کرنے اور دہشت گردوں کے مکمل خاتمے تک آرمی سوات میں رہے گی۔ یہ اس اجانب اشارہ ہے کہ فوج نے ہرصورت میں حکومت کی مدد کرکے عوام کے تحفظ کو یقینی بنانے کی پالیسی اپنائی ہوئی ہے۔ سوات کے عوام اور خود حکومت کے نمائندے یہی چاہتے ہیں کہ سول اداروں خصوصاً قانون نافذ کرنے والے سول اداروں کی فعالیت تک فوج وہاں موجود رہے گی۔ جب بھی عوام کو تحفظ کا احساس ہوگا اور حکومت نے چاہا فوج نکل آئے گی۔

س:۔ بعض حلقے فوج پر ماورائے قانون ہلاکتوں اور بعض عناصر کو غائب کرانے کے الزامات لگاتے ہیں۔ اس پر آپ کیا تبصرہ کریں گے؟

ج:۔ فوج ایک موثر نظام اور ڈسپلن کے تحت کام کرتی ہے۔ فوج کسی بھی بے گناہ یا غیر متعلق شخص کے خلاف کارروائی نہیں کرتی۔ جو لوگ ریاست کے خلاف اور عوام کے خلاف لڑتے ہیں اور حکومتی رٹ سرے سے مانتے ہی نہیں ان سے نمٹنا فوج کے فرائض میں شامل ہے۔ ابھی تک حقائق کی بنیاد پر ماورائے قانون ہلاکتوں کے ٹھوس شواہد اور ثبوت سامنے نہیں آئے۔ فورسز کے ہاتھوں چند ایک واقعات کا گھنٹوں کے اندر ہی نوٹس لیا گیا جو فوجی جوان تشدد یا غیر قانونی کارروائیوں میں ملوث تھے ان کے خلاف کارروائیاں کی جارہی ہیں اور ان کے ساتھ فوجی قوانین کے تحت سلوک کیا جائے گا۔ جہاں تک بعض لوگوں کی گمشدگی کا تعلق ہے اس میں بھی ابہام ہے۔ متعدد لوگوں کو حکومت کی خواہش پر محض اس لیے گرفتاریوں کے بعد عدالتوں میں پیش نہیں کیا گیا کہ بعض عدالتی نقائص کے باعث رہائی کے احکامات موجود ہوتے ہیں۔ حکومت نے دہشت گردی سے متعلق قوانین پر نظر ثانی کرکے ایک موثر آرڈی نینس کا ڈرافٹ تیار کیا ہے جیسے ہی وہ پاس ہوگا زیرحراست لوگوں کو عدالتوں میں پیش کیا جائے گا۔

س:۔ وزیرستان میں آپریشن کا فیصلہ کس بنیاد پر کیا گیا۔ اگر دہشت گرد وہاں سے نکلتے ہیں تو آپریشن کا کیا فائدہ ہوگا؟

ج:۔ وزیرستان وہ علاقہ تھا جو ٹی ٹی پی کے علاوہ غیر ملکی بھی بطور بیس کیمپ استعمال کر رہے تھے۔ وہاں تو ان لوگوں نے عملاً ایک طرح سے اپنی ریاست قائم کر رکھی تھی۔ وہ معاہدے اور وعدے توڑتے رہے۔ مخالفین کو مارتے گئے اور آبادی کو یرغمال بناتے گئے۔ ابتداء میں ان کی سرگرمیاں وزیرستان یا قریبی علاقوں تک محدود رہیں' تاہم بعد میں انہوں نے اپنے حامیوں اور اتحادیوں کے ساتھ مل کر اپنا سلسلہ پورے ملک تک پھیلا دیا۔ جہاں بھی کوئی واردات کی گئی تفتیش کے بعد پتہ چلا کہ اس کی پلاننگ وزیرستان میں کی گئی تھی۔ علاقے کو واگزار کرانا' وہاں حکومتی رٹ قائم کرنا اوران دہشت گردوں کے محفوظ ٹھکانے ختم کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ یہ بات بہت ضروری ہوگئی تھی کہ ان کو ان کے مرکز یعنی ہیڈ کوارٹر سے محروم کر دیا جائے۔ فورسز اور فضائیہ نے ان کے 70 فیصد علاقے قبضے میں لے لیے ہیں۔ اب ان سے ان کا مرکز چھینا جا چکا ہے۔ اب وہ نہ تو اسلحہ محفوظ کر سکتے ہیں نہ کوئی موثر پلاننگ کر سکتے ہیں اور نہ ہی دوسرے دہشت گردوں کی معاونت کر سکتے ہیں۔ جہاں تک ان کی منتقلی کا تعلق ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ پورے علاقے کی نگرانی یا گھیراؤ کافی مشکل ہوتا ہے۔ تاہم اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان کے خاتمے تک ہر جگہ ان کا پیچھا کیا جائے گا۔ دوسری ایجنسیوں میں بھی کارروائیاں شروع ہیں۔ وہ یا تو بھاگ رہے ہیں یا مر رہے ہیں۔ مضبوط بیس نہ ہونے کے باعث اب ان میں پلاننگ اور پریکٹس کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ یہ فیصلہ بالکل اٹل ہے کہ ان کے خاتمے تک کارروائیاں کسی تعطل کے بغیر جاری رہیں گی۔

س:۔ کیا اس کارروائی میں اتحادی افواج بھی آپ کا ساتھ دے رہی ہے۔؟

ج:۔ قطعاً نہیں۔ پاک فوج میں اتنی قوت اور صلاحیت موجود ہے۔ ہمیں کسی اور کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ سوات کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ کیا وہاں کسی نے ہماری معاونت کی تھی؟ ہمیں ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اتحادی ممالک ایک طریقہ کار کے مطابق وسائل خصوصاً آلات اور ضروریات کی فراہمی میں ہمارے ساتھ تعاون کریں کیونکہ ہم ایک مشکل جنگ لڑ رہے ہیں اور ہمارے وسائل بہت محدود ہیں۔ ہم اپنی مٹی کی حفاظت کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں۔

س:۔ فوجی کارروائیوں کے باوجود دہشت گردوں کی کارروائیوں میں کمی نہیں آ رہی' اس کی

کیا وجہ ہے؟

ج:۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ پہلا یہ کہ وہ بوکھلاہٹ اور انتشار کا شکار ہو کر انتقام کے تحت عام لوگوں اور فورسز کو نشانہ بنا رہے ہیں تا کہ ریاست پر دباؤ ڈالا جا سکے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان پر یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ خودکش حملے اور پرتشدد کارروائیاں ہی ان کے پاس واحد راستہ رہ گیا ہے۔ میدان میں تو وہ مقابلہ کر نہیں سکتے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اب ان کو اپنی موت سامنے دکھائی دے رہی ہے کیونکہ مفاہمت اور رعایت کے امکانات ختم ہو گئے ہیں۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ وہ پاکستان کی بعض دشمن قوتوں کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں اور وہ ریاست کو کمزور کرنے کی خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ فورسز کا مقابلہ کرنے کی بجائے عام شہریوں کو نشانہ بنا کر عوام سے اس بات کا انتقام لے رہے ہیں کہ عوام حکومت اور فوج کے ساتھ کیوں کھڑے ہیں۔ شہریوں پر دباؤ بڑھانے کا مقصد یہی ہے کہ خوف کی فضا قائم کر کے اپنی موجودگی کا احساس دلایا جائے اور فورسز پر دباؤ بڑھایا جائے۔ ان تمام ہتھکنڈوں اور بعض پاکستان دشمن قوتوں کی معاونت کے باوجود نہ تو ان کے ساتھ رعایت کی جائے گی اور نہ ہی ان کو پاکستان میں زندہ رہنے دیا جائے گا۔ ان کے پاس واحد آپشن یہ رہ گیا ہے یا تو ہتھیار ڈال دیں یا مرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

کیا پشتون واقعی انتہا پسند ہیں؟

نائن الیون کے بعد عالمی سطح پر سماجی اور عسکرین ماہرین کے علاوہ ریاستوں اور انٹیلی جنس کی سطح پر جہاں شدت پسندی اور انتہا پسندی سے متعلق کئی دیگر ایشوز پر تحقیقی کام کا آغاز ہوا وہاں یہ سوال بھی شدت سے سر اٹھانے لگا کہ قبائلی پس منظر رکھنے والی پشتون یا افغان قوم کی نفسیات، مسائل اور عزائم پر بھی درپیش حالات کے تناظر میں نئی تحقیق کی جائے کیونکہ عام تصور یہ تھا (اب بھی ہے) کہ نائن الیون کے واقعہ کی منصوبہ بندی طالبان کے زیرکنٹرول افغانستان میں کی گئی تھی۔ برطانیہ اور متعدد دوسرے ممالک پر اس انداز میں کیے گئے حملوں کے تانے بانے بھی افغانستان میں موجود گروپوں کے ساتھ جوڑے گئے جبکہ فال آف طالبان کے بعد بھی امریکہ سمیت متعدد دوسرے ممالک کسی وقفے کے بغیر یہ کہتے پائے گئے کہ افغانستان میں بیٹھے گروپ اب بھی دنیا کے امن کے لیے بڑا خطرہ ہیں۔

پشتونوں کی تاریخ کو مخصوص عینک سے دیکھنے کے عادی عالمی اور علاقائی دانشوروں نے چار کروڑ سے زائد کی آبادی رکھنے والی ایک قوم کو انتہا پسند اور تنگ نظر اور جاہل ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی حالانکہ اتنی بڑی آبادی سے اگر طالبان کی شرح نمائندگی کا تناسب نکالا جاتا تو ثابت ہو جاتا کہ کروڑوں پشتونوں کا بطور طالبان اور انتہا پسند تعارف کرانا نہ صرف یہ کہ ناانصافی پر مبنی رویہ ہے بلکہ علمی، سیاسی اور نفسیاتی طور پر اس رویئے یا عمل کو کسی بھی فارمولے کے تحت درست یا مناسب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ طالبان کی اکثریت پشتون آبادی پر مشتمل تھی، تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سب پشتونوں یا اکثریتی پشتونوں کو طالبان ہی قرار دیا جائے۔ اگر القاعدہ کے پس

منظر میں سارے عربوں کو انتہا پسند قرار دینے کی کوئی شعوری کوشش اب تک سامنے نہیں آئی تو پشتونوں کو طالبان یا انتہا پسند قرار دینے کے تصور کو محض غلط بیانی یا یکطرفہ پروپیگنڈے کے سوا دوسرا اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

اس حوالے سے پشتونوں کی تاریخ سے اس معاملے پر جو نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ ان پر بحث کرنے سے قبل نائن الیون سے متعلق چند بنیادی نکات کا جائزہ لیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ تاریخ کا رخ تبدیل کرنے والے اس واقعہ میں پشتون کبھی براہ راست ملوث نہیں رہے۔

-1 افغانستان میں 80 کی دہائی میں جہاد کے نام پر جو جنگ شروع کی گئی وہ جہاد یا افغانستان کی آزادی سے زیادہ امریکی مفادات کو سامنے رکھ کر روس سے بدلہ لینے اور اس کو کمزور کرنے کی عالمی پالیسی کے تحت لڑی گئی۔ اس جنگ میں افغانوں کی موجودگی محض ایک محدود آبادی سے تعلق رکھنے والے پیادوں تک محدود تھی۔

-2 اب تک کی تحقیق سے بھی یہ ثابت ہو چکا ہے کہ افغان جنگ میں مغرب کے علاوہ مرکزی کردار افغانوں کے بجائے عربوں ہی نے ادا کیا تھا اور اسی کردار کے تسلسل میں القاعدہ جیسی تنظیم نے جنم لیا۔ روس کی واپسی اور مجاہدین کی حکومت کے قیام کے بعد کابل کو برباد کرنے کا سہرا ان لوگوں کے سر ہے جو کہ عملاً واشنگٹن' اسلام آباد' ریاض اور تہران کے ایجنڈوں کو آگے بڑھا رہے تھے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ یہ کوئی مبالغہ نہیں کہ فیصلہ سازی اور عملی جہادی قیادت کے تمام معاملات میں مجاہدین سے لے کر طالبان تک کے تمام ادوار کے دوران پشتونوں کا کردار انتہائی محدود رہا۔

-3 افغان جنگ کے دوران ڈیورنڈ لائن کے اس جانب پاکستان میں موجود دو کروڑ سے زائد پشتون خان عبدالغفار خان+ عبدالصمد خان اچکزئی اور ولی خان+ محمود خان کی قیادت میں اس جنگ کے نہ صرف ناقد رہے بلکہ اتنی بڑی آبادی اس لڑائی کو روس اور امریکہ کی جنگ تصور کر کے اس پر تشویش کا اظہار بھی کرتے رہے۔ فاٹا نامی جس علاقے سے اس جنگ یا جہاد کے حق میں آواز اٹھی وہ بہت محدود اور ہلکی تھی۔

-4 پشتون آبادی کے ایک محدود حلقے کو اس تمام گیم میں شامل کرنے کا کریڈٹ

امریکہ اور پاکستان کے علاوہ اس مذہبی طبقے کو جاتا ہے جس کو پشتون معاشرے میں کسی بھی الیکشن کے دوران سات فیصد سے زائد ووٹ نہیں ملے اور ان طبقات کو وسیع تر تناظر میں سوسائٹی کی نمائندگی کا کبھی حق حاصل نہیں ہوا۔ یاد رہے کہ 2002ء کے انتخابات میں مذہبی لوگوں کی کامیابی اور ایم ایم اے کی حکومت کا قیام جنرل مشرف اور ان کے ساتھیوں کی وہ گیم تھی جو وہ اس کے ذریعے اور امریکہ اور مغربی ممالک سے کھیلنا چاہتے تھے اور جس کی بازگشت بالآخر بین الاقوامی میڈیا میں بھی سنائی دی اور پھر یہی ان کی اقتدار سے علیحدگی کا باعث بھی بنی۔

5- مجاہدین اور طالبان عام پشتون آبادی کی نمائندگی کے برعکس غیر ملکی جاسوسی اداروں اور تنظیموں سے وابستہ ہو کر لانچ کیے گئے۔ امریکہ اور دوسرے اتحادی ممالک ہی نو مجاہد تنظیموں اور ان کے بعد طالبان نامی قوت کو متعارف کرانے کے ذمہ دار ہیں۔ پشتونوں نے تو محض ایک سپاہی کا ہی کردار ادا کیا تھا۔

6- نائن الیون کے واقعہ میں ملوث جتنے بھی نام تحقیقات کے بعد سامنے آئے ان میں کوئی بھی افغان یا پشتون نہیں تھا بلکہ ان میں سے اکثریت عربوں کی تھی۔ اگر حامد میر کی اس بات پر یقین کیا جائے کہ ملا عمر سمیت طالبان اس واقعہ کی ابتداء میں مذمت کر رہے تھے تو صورتحال اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔

7- پشتونوں کو انتہاپسند یا طالبان قرار دینے والے یہ حقیقت مسلسل نظر انداز کرتے رہے کہ پشتون مزاجاً تاریخی طور پر جرگہ سسٹم سے لے کر موجودہ انتخابی سیٹ اپ تک کے تمام ادوار کے دوران اپنے لیڈروں یا نمائندوں کو انتخاب ہی کے ذریعے آگے لانے کی روایت پر قائم رہے اور اس کی بڑی مثال جنگ زدہ افغانستان میں سال 2004ء اور 2009ء کے دوران عوام کی انتخابی عمل میں بھرپور شرکت کے طور پر دی جاسکتی ہے جبکہ پاکستانی پشتون بھی جمہوریت کے علمبردار بنے رہے۔

8- پشتون معاشرے میں چند ایک واقعات کے علاوہ مجموعی رویے کے تناظر میں مخالفین کے خلاف جدوجہد کرنے یا جنگ لڑنے کے لیے بہت واضح اور ٹھوس ضابطہ اخلاق موجود رہے ہیں جبکہ موجودہ لڑائیوں کے دوران مخالفین کو ذبح کرنے اور بچوں سمیت خواتین

کو انتقام کا نشانہ بنانے کی ذمہ داری خود طالبان کے بعض حلقوں کی جانب سے غیر ملکیوں پر ڈالی جاتی رہی۔ غیر ملکی خصوصاً سنٹرل ایشین اور عرب ہی نے مقامی طالبان کو ایسے واقعات کے ارتکاب کی طرف راغب کیا۔

-9 98فیصد سنی اور حنفی مسلمان ہونے کے پس منظر کے باعث پشتونوں میں مسلکی اور فرقے کے بنیاد پر تقسیم کا عمل کبھی بھی تاریخ کا حصہ نہیں بنا۔ دوسری طرف پشتونوں یا افغانوں نے تاریخ میں جتنی بھی لڑائیاں لڑی ہیں وہ اسلام اور اپنی سرزمین کے دفاع کے تصور پر مبنی تھیں۔ اقتصادی مفادات یا قبضے سے متعلق جتنے تصورات مخالفین کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں' وہ اجتماعی معاشرے کی عکاسی نہیں کرتے۔ یہ الگ بات ہے کہ جن پشتونوں کو حالیہ ادوار میں اس مقصد کے لیے بڑی کم تعداد میں استعمال کیا گیا ان میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جنہوں نے محض تنخواہ داروں کی طرح اپنے اقتصادی مفادات کے تناظر میں اپنی خدمات پیش کیں۔ ان یکطرفہ الزامات یا پروپیگنڈے کے ذریعے حریت پسندی اور انتہا پسندی کے درمیان موجود بنیادی فرق کی وضاحت کو مجرمانہ طور پر نظرانداز کیا جاتا رہا۔

موجودہ تناظر اور پروپیگنڈے سے متعلق ان بعض حقائق اور نکات کے علاوہ اگر ہم ہزاروں سال پر محیط پشتون تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو کسی بھی بحث یا حوالہ جات سے قطع نظر مجموعی خلاصہ یہی نکلتا ہے کہ مضبوط قبائلی بنیادوں اور انتہائی موثر ثقافتی' سماجی اقدار کے باعث پشتون کبھی بھی انتہا پسند یا تنگ نظر نہیں رہے۔''دی پٹھان'' کے مصنف اولف کیرو' سابق گورنر سرحد جارج برنگھم اور ونسٹن چرچل کے علاوہ یونانی' ہندوستانی اور مغل تاریخ دانوں کے رقم کردہ بے شمار واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ پشتون معاشروں کی اخلاقی اور ثقافتی اقدار نے ان کو نہ صرف یہ کہ اجتماعیت اور جمہوریت کے دائروں سے باہر نکلنے نہیں دیا بلکہ یہ لوگ مخالفین یہاں تک کہ ذاتی دشمنوں کے ساتھ بھی انتہائی اعتدال پسندی' درگزر اور رواداری کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔

دور حاضر میں ہم خدائی خدمتگار تحریک کی مثال دے سکتے ہیں۔ جس نے جدوجہد آزادی کے دوران عدم تشدد کا فلسفہ اپنا کر سیاسی اور علمی فارمولے کے تحت نہ صرف بے پناہ

قربانیاں دیں بلکہ معاشرے میں تعلیم عام کرنے کے اپنے مقصد کو اسی تحریک کا بنیادی نکتہ بنایا۔ سال 1947ء کے دوران پورے ہندوستان کی جیلوں میں قید سیاسی لیڈروں اور کارکنوں کی مجموعی تعداد میں اس تحریک کی شرح نمائندگی پچاس فیصد سے زائد تھی۔ سیاسی تحاریک اور پارٹیاں پشتون معاشرے میں بحیثیت مجموعی ہر دور میں انتہائی اہمیت کی حامل رہی ہیں اور یہی پس منظر ہے کہ اب بھی موجودہ پاکستان کی دستیاب پارٹیاں کسی نہ کسی شکل میں پشتون معاشرے میں نہ صرف موجودہ ہیں بلکہ قومی سوچ اور انفراسٹرکچر کی حامل پارٹیاں صوبہ سرحد اور فاٹا کی نمائندگی کی بنیاد پر مختلف اوقات میں برسراقتدار بھی رہیں ہیں۔ ویسے بھی جو لوگ جمہوریت پر یقین رکھتے ہیں وہ انتہاپسندی یا تشدد کو پسند نہیں کرتے۔

اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ پشتون معاشرے میں مذہبی لوگوں، پیشواؤں یا روایتی طالبان کو معاشرتی طور پر کبھی مسجد سے باہر کے کسی اہم کردار کی ذمہ داری نہیں سونپی گئی بلکہ اگر یہ کیا جائے کہ یہ لوگ محض نماز دینی علوم اور نکاح پڑھوانے تک محدود رکھے گئے تو غلط نہیں ہوگا۔ پشتونوں کی اجتماعی زندگی میں ان کو ان کی حدود کے اندر رکھنے کی بے شمار مثالیں موجود ہیں یہاں تک کہ مقامی سطح پر مذہبی گھرانوں سے تعلق رکھنے والے افراد مساجد کی امامت کرنے سے بھی گریز کرتے رہے کیونکہ ان کو بری نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ ہر چھوٹے بڑے حجرے میں مسجد کی تعمیر کی روایت اس روّیے کی عکاسی کرتی تھی کہ یہ لوگ مسجد کو بھی ایک طرح سے حجرے کا حصہ سمجھا کرتے تھے۔ یہ روّیے اس جانب بھی اشارہ تھے کہ پشتون سوسائٹی نے صدیوں سے مولوی کو دوسرے پیشہ ور افراد سے زیادہ بڑھ کر کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس صورتحال کو مدنظر رکھ کر یہ نتیجہ اخذ کرنا کوئی مشکل کام نہیں رہتا کہ پشتونوں نے بحیثیت ایک قوم یا سوسائٹی مسجد یا مدرسے کے بجائے حجرے کو مرکزی حیثیت دے کر مولوی کو بھی رہنمائی کے سٹیٹس سے نہیں نوازا۔ اکثر لوگ مساجد میں امامت کرنے والوں کو اجناس یا وظیفے کی شکل میں ایک طریقہ کار کے مطابق دوسرے ملازمین کی طرح تنخواہ دیا کرتے تھے۔ قبائلی بنیادیں رکھنے کے پس منظر کے باعث پشتون سوسائٹی میں حجرہ اور جرگہ ہی اختیارات کے وہ مراکز ہیں جہاں سے پورے معاشرے یہاں تک کہ بادشاہوں اور سرداروں کی نامزدگی جیسے معاملات بھی نمٹائے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ پشتونوں کی

جدید ریاست اور ریاست کے تصور کے بانی احمد شاہ ابدالی کو اقتدار دینے کا فیصلہ بھی ایسے ہی ایک جرگے کے ذریعے کیا گیا تھا اور جرگہ کے اسی تصور کو اکیسویں صدی میں بون کانفرنس کے انعقاد تک قائم رکھا گیا۔

پشتونوں کا فطری جذبہ قوم پرستی جن خطوط اور اسباب پر استوار تھا اس میں اپنی مٹی سے لازوال محبت، اپنی روایات اور ثقافت سے غیر متزلزل وابستگی، جرگہ کی شکل میں جمہوریت پسندی، معاشرے میں برابری کی بنیاد پر احترام انسانیت اور علم، ادب اور موسیقی سے ان کی غیر مشروط، پائیدار محبت جیسی خصوصیات اور مضبوط بنیادوں نے لے لی مرکزی کردار ادا کیا جن کے ہوتے ہوئے دنیا کی کوئی بھی قوم یا سوسائٹی انتہاپسندانہ رجحانات کی بھینٹ نہیں چڑھ سکتی۔ اس حقیقت کے حق میں دلائل دینا کوئی نئی بات نہیں ہوگی کہ برصغیر پر چند ایک کو چھوڑ کر زیادہ تر افغانی حکمرانوں نے نہ صرف اچھی حکمرانی کی مثالیں قائم کیں بلکہ شیر شاہ سوری سمیت متعدد دوسرے حکمرانوں نے اس خطے کو ترقی کے جدید تصورات سے بھی آگاہ کیا جہاں اور جب بھی اسی قوم نے اپنی مٹی یا اپنے مذہب کے لیے دوسروں کے خلاف لشکر کشی کا قدم اٹھایا۔ اُس کی منظوری جرگہ کی شکل میں ایک نمائندہ (دی جاتی تھی) پلیٹ فارم کے ذریعے دی جاتی تھی۔ برصغیر کی تاریخ اس بات کی گواہ رہی ہے کہ اس خطے میں اسلام جیسے عظیم مذہب کے پھیلاؤ میں افغان حکمرانوں اور صوفیائے کرام ہی کا مرکزی کردار رہا ہے۔ صوفیاء کرام کے ساتھ بحیثیت قوم پشتونوں کی عقیدت اور وابستگی کی اس سے بڑی مثال اور کیا دی جاسکتی ہے کہ نامور شاعر رحمان بابا کا شعری کلام پڑھے لکھے لوگوں کے علاوہ غیر تعلیم یافتہ خواتین قرآن کے بعد سب سے زیادہ پڑھے جانے والے مواد کی صورت میں ایک ناگزیر ضرورت سمجھتی تھیں چنانچہ جس قوم میں صوفی ازم کو اتنی مقبولیت حاصل ہو وہاں تشدد کی فصل کیونکر جنم لے سکتی ہے۔

یہاں ایک اور روّیے کو بھی ہم بطور مثال پیش کر سکتے ہیں کہ صدیوں پر محیط پشتون سرزمین پر مختلف ادوار میں لڑی جانے والی جنگوں کے دوران پشتونوں نے فاتحین ہو کر بھی مخالفین کے ساتھ انصاف پر مبنی رویہ اپنایا۔ بڑے بادشاہوں نے ہندوستان جیسی جنگی مہمات میں کامیابیاں حاصل کرنے کے باوجود کابل اور قندھار کی طرف واپس لوٹ جانے کو

ترجیح دی حالانکہ وہ چاہتے تو اپنی طاقت کی بنیاد پر ہندوستان میں اپنے قیام کو طول دے سکتے ہیں۔ انگریزوں کے خلاف مزاحمت کے دوران پالے شاہ (بلوچستان) اور عجب خان کی شکل میں محدود مزاحمتی گروپوں نے جب ایک مرحلے کے دوران انگریز افسران کی خواتین کو دباؤ یا ہتھیار استعمال کرنے کے لیے اغواء کیا تو ان کے خاندانوں اور قبیلوں نے ان اقدامات پر اتنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا کہ ان کمانڈروں کو وہ خواتین واپس کرنی پڑیں۔ اپنے ہم مذہب تو دور کی بات افغانوں یا پشتونوں نے اپنی اقلیتوں کے ساتھ بھی ہمیشہ برابری کا بنیادی پر مذہب کی تفریق کے بغیر انتہائی مثبت تعلقات رکھے۔ اس کی مثال ہم یوں دے سکتے ہیں کہ تقسیم ہند کے بعد جب مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان فسادات کا آغاز ہوا تو بڑے شہروں میں پشاور وہ واحد شہر تھا جس کے ہندو اور سکھوں کو نہ صرف یہ کہ تحفظ حاصل تھا بلکہ مقامی آبادی نے ان کے گھروں اور دکانوں کے باہر چوکیدار بن کر فرائض انجام دیئے۔ شورش زدہ فاٹا کی پانچ ایجنسیوں کے علاوہ سوات، بونیر، دیر، کوہاٹ اور پشاور میں یہ لوگ آج بھی ہزاروں کی تعداد میں صدیوں سے رہائش پذیر ہیں اور کاروبار کرتے ہیں اور حالیہ طالبان کی لہر سے قبل ان غیر مسلموں کو پشتون علاقوں میں مکمل تحفظ حاصل تھا۔ اس ضمن میں کابل کی مثال بھی دی جا سکتی ہے جہاں کے 50 فیصد کاروبار پر ہندوؤں اور سکھوں کا قبضہ ہے بلکہ طالبان کے دورِ حکومت میں بھی ان کو بڑی حد تک تحفظ اور احترام حاصل تھا۔

جب امریکہ کے نائن الیون کے بعد پاکستان کی طرف سے افغان حکمرانوں کو مشورہ دیا گیا کہ وہ اُسامہ بن لادن کو افغانستان سے نکال دیں تو شاید کہ متوقع امریکہ حملہ ٹل جائے اور اس ضمن میں طالبان کے حمایت یافتہ 100 سے زائد علماء نے اتفاق رائے سے اس تجویز کی حمایت کر کے اُسامہ بن لادن کو افغانستان سے باہر نکالنے کی سفارش کر دی تو ملا عمر نے دو دلائل کی بنیاد پر ایسا کرنے سے انکار کر دیا پہلی دلیل یہ تھی کہ اُسامہ بن لادن افغانیوں کے مہمان ہیں اور افغان یا پشتون اپنی روایات کے مطابق اپنے مہمانوں کو دوسروں کے حوالے نہیں کرتے۔ اس واقعہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ روایتی اور اکثریتی پشتونوں کے علاوہ طالبان بھی اپنی ایسی روایات کا پاس رکھتے تھے۔ اس سے قبل جب افغان مجاہدین کی حکومت ڈاکٹر نجیب کے اقتدار کے خاتمے کے بعد قائم ہوئی تو اخوان المسلمین کے فلسفہ سے

متاثر گلبدین حکمت یار کے حکم پر جلال آباد میں موجود اے این پی کے بانی لیڈر خان عبدالغفار خان (باچا خان) کی قبر کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے سے گریز کر کے نہ صرف احکامات جاری کر دیئے گئے بلکہ حکمت یار کے کہنے پر وہاں دو چوکیدار بھی مقرر کیے گئے۔ طالبان کے دورِ حکومت میں بھی اس کے باوجود قبر کی حرمت قائم رکھی گئی حالانکہ طالبان اپنے بعض مخالفین کی لاشیں نکال کر ان کو پھانسیاں دیا کرتے تھے۔

اس سلسلے میں ہم اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ پشتون بحیثیت مجموعی بعض دوسری قومیتوں یا قبائل کی طرح قانون کا بھی بہت احترام کرتے آئے ہیں۔ ایک سروے کے مطابق دنیا کے 75 ممالک ایسے ہیں جہاں پر افغان اور پشتون روزگار اور ملازمتوں کے سلسلے میں رہائش پذیر ہیں تاہم عام تاثر یہ ہے کہ یہ لوگ ان ممالک کے مروّجہ قوانین کا دوسری مہذب قوموں کی طرح ہی احترام کرتے ہیں۔ اس ضمن میں اقوام متحدہ کے ایک ادارے نے نائن الیون کے بعد ایک سروے بھی کیا جس کے بعد اعتراف کیا گیا کہ پشتون یا افغان ایک شورش زدہ قبائلی علاقے سے تعلق رکھنے کے باوجود ریاستی قوانین کا بہت احترام کرتے ہیں۔

امریکہ سے تعلق رکھنے والے عالمی شہرت یافتہ مصنف ڈائیٹرچ منشر نے اپنی ایک تحقیق ''خیالات کی طاقت اور دفاع کے غیر عسکری پہلو'' میں جو نتائج اخذ کیے ہیں اُن کے مطابق جس سوسائٹی، قومیت یا ریاست میں شاعر، ادیب اور فنکار بڑی تعداد میں پیدا ہوئے ہیں وہ کبھی بھی تنگ نظری، تعصب اور مذہبی انتہا پسندی کی طرف راغب نہیں ہوا کرتے۔ اُس وقت تک جب بعض نادیدہ مگر طاقتور اور غیر مقامی قوتیں ان کو فکری اور معاشرتی سطح پر غیر محسوس طریقے سے یرغمال نہیں بناتیں اگر ہم اس عظیم مفکر کے اس فارمولے کو موجودہ تناظر میں پشتونوں کے حالات یا ان کے خلاف کیے گئے پروپیگنڈے کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ پشتون کبھی متعصب، تنگ نظر اور تشدد پسند ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ دستیاب اعداد و شمار کے مطابق جن شعراء کے صرف پشتو زبان میں شعری مجموعوں کی شکل (میں شاعری) موجود ہے ان کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے ان میں خوشحال خان خٹک، رحمان بابا، علی خان بابا، احمد شاہ ابدالی، پیر روخان، حفیظ

الپوری، امیر گروڑ کے علاوہ اور جدید دور کے عظیم شعراء اجمل خٹک، غنی خان، حمزہ شنواری، قلندر مومند، رحمت شاہ سائل۔ قمر راہی، درویش دُرانی، ملنگ جان، حبیب اللہ رفیع، احمد فراز، محسن احسان، فاطر غزنوی، ایوب صابر، زیتون بانو، سلمیٰ شاہین، ڈاکٹر اسرار اور متعدد دوسرے شاعر عالمی شہرت کے حامل ہیں جنہوں نے شاعری کے علاوہ نثر، تحقیق اور تنقید کے شعبوں میں قابل ذکر کارنامے انجام دینے کے علاوہ قوم پرست سیاست میں بھی انتہائی اہم کردار ادا کر کے اقتدار کے ایوانوں میں اپنے معاشرے اور لوگوں کی نمائندگی کا حق بھی ادا کیا۔ اسی طرح اگر ہم منشر سمیت ایسے دوسرے عظیم مفکرین کے فارمولے کو فالو کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ برصغیر میں فلم، ڈرامہ اور تھیٹر سے وابستہ شعبوں میں قندھار، پشاور اور کوئٹہ کے پشتونوں نے نہ صرف کلیدی کردار ادا کیا بلکہ بھارت کی فلم انڈسٹری آج جس مقام پر کھڑی ہو کر دنیا پر راج کر رہی ہے اُس کی بنیادیں پشتونوں نے رکھی تھیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اس ضمن میں ہم گل حمید، پرتھوی راج کپور، دلیپ کمار، رفیق غزنوی، ضیاء سرحدی (پروڈیوسر، ڈائریکٹرز) سریندر کپور اور محبوب خان سے لے کر موجودہ دور کے بے شمار پروڈیوسرز، ڈائریکٹرز، رائیٹرز اور خان فیملی پر مشتمل نئی نسل کے سپر اسٹارز کی مثالیں دے سکتے ہیں۔ بھارت اور افغانستان کے علاوہ ان لوگوں نے پاکستان میں بھی ان شعبوں میں بہت بڑے بڑے نام پیدا کیے۔ ان شعبوں کے علاوہ اس خطے نے علم، ٹیکنالوجی، مصوری، فونا میڈیکل اور سپورٹس سمیت زندگی کے تمام شعبوں میں نہ صرف نام کمایا بلکہ ان شعبوں کو اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر عالمی اور ملکی اعزازات بھی حاصل کیے۔

یہاں ہم اپنی پشتون خواتین کی خدمات اور کردار کا بھی حوالہ دے سکتے ہیں۔ جنہوں نے مختلف شعبوں میں نمایاں کارکردگی کی بنیاد پر خود کو منوایا۔ اس ضمن میں مالالہ

(انگریزوں کے خلاف میوند کی لڑائی جیتنے والے افغان حکمران ایوب خان کی خوش آواز، بہادری بیٹی) میرمن زرمینہ بی بی

(احمد شاہ ابدالی کی والدہ اور ان کی ہمشیرہ)..............بیگم نسیم ولی خان، کلثوم سیف اللہ، ڈاکٹر گلالئی

زری سرفراز ....اور کئی دیگر کی مثالیں دے سکتے ہیں۔ چنانچہ اس

تناظر میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پشتون یا افغانوں کو انتہاپسند، تنگ نظر، ظالم اور جاہل قرار دینے کے دعووں یا الزامات کی حالیہ مہم کو یکطرفہ پروپیگنڈے کم عملی یا بدنیتی کے سوا دوسرا کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ جس میں سب سے بڑی کمزوری اور کوتاہی پشتون دانشوروں اور سیاسی لیڈروں ہی پر ڈالی جا سکتی ہے جنہوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر پشتونوں اور ان کے خطے سے متعلق قائم منفی تاثر کو زائل کرنے کے لیے کوشش ہی نہیں کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ منفی اور انتہا پسند قوتوں نے اپنے فکری استادوں کی گائیڈ لائن پر عمل کر کے اس قوم کی خصوصیات اور اجتماعی صلاحیتوں پر پردہ ڈالتے ہوئے پشتونوں کو نہ صرف ذہنی طور پر ہائی جیک کر لیا بلکہ ان سے ان کی شناخت، ثقافت، جرگہ، حجرہ اور یقینا بہت سی اور بھی چیزیں چھین لیں۔ اس پر میں نے مختلف شعبوں کے صاحب الرائے لوگوں سے ان کا موقف جاننے کی کوشش کی۔

۱۔ فدا اللہ صحرائی (ماہر آرکیالوجی)

70 سالہ پروفیسر صحرائی اپنی تحقیق اور تجربے کی بنیاد پر کہتے ہیں ''میں اس تصور کو الزام سے بڑھ کر دوسرا نام نہیں دے سکتا کہ پشتون انتہاپسند ہیں یا کبھی رہے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ خطہ لمبے عرصے تک متمدن اور پرامن تہذیبوں کا گڑھ رہا ہے۔ ان ادوار میں ہم بدھ کے سنہرے زمانے کو کیونکر بھول سکتے ہیں۔ بدھ مت عدم تشدد، صبر، محبت اور قربانی کے ایک ضابطۂ زندگی کا نام تھا اور یہ خطہ اس عظیم تہذیب کا گہوارا رہا ہے۔ اب بھی سوات، دیر، بونیر، چترال، مردان، صوابی اور متعدد دوسرے علاقوں میں بدھ مت کے آثار اصل حالت میں موجود ہیں جبکہ درجنوں کی تعداد میں صوبہ سرحد کے مختلف علاقوں میں سٹوپے بھی موجود ہیں۔ ہم اگر تہذیب اور اس کے وسیع المدت نفسیاتی اثرات کا جائزہ لیتے ہیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اثرات اس تہذیب یا مذہب کی تعلیمات یا رویوں کے تناظر میں صدیوں تک قائم رہتے ہیں۔ سوات یا ملاکنڈ ڈویژن کے لوگ صدیوں سے اس لیے پرامن اور نرم خو واقع ہوئے ہیں کہ یہ علاقہ بدھ مت کا مرکز تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک مخصوص طبقے نے نہ صرف اس خطے کو بارود کے ڈھیر میں تبدیل کیا بلکہ بدھ مت کے قیمتی اثاثے بھی تباہ کر دیئے۔''

2- رحمت شاہ سائل (پشتون پرائیڈ آف پرفارمنس شاعر)

''میں موجودہ حالات اور پروپیگنڈے کو حالات اور تاریخ کے جبر کے علاوہ عالمی استعماری قوتوں کی سازشوں کا نتیجہ قرار دیتا ہوں۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ پشتون خوبصورت خطے کے مالک ہونے کے باعث معصوم اور پاکیزہ احساسات، جذبات رکھنے والے لوگ ہیں ان سے تشدد اور ظلم کی توقع اس لیے بھی نہیں کی جاسکتی کہ یہ ذہنی اور جسمانی طور پر صاف گو اور بہادر لوگ ہیں اور بہادر لوگ نہ تو کسی پر پیچھے سے وار کرتے ہیں نہ کسی مظلوم پر ہاتھ اٹھاتے ہیں اور نہ ہی کسی سازش کا حصہ بنتے ہیں۔ ہم یہ جاننے کو کیسے تیار ہو جائیں کہ کوئی پشتون یا افغان کسی انسان کو ذبح کر سکتا ہے؟ چونکہ ہمارا خطہ جغرافیائی طور پر ایک انتہائی اہم خطہ ہے اس لیے ہم ہر حملہ آور کا نہ صرف نشانہ بنے بلکہ ہم نے اپنے دفاع میں جو بھی اقدام اٹھایا مخالفین نے اُس کو ہماری مجبوری کی بجائے منفی انداز میں پیش کر کے ہمیں بدنام کیا۔

3- سعد اللہ جان برق (شاعر، کالم نگار)

بہت سی کوتاہیوں کے ہم خود بھی ذمہ دار ہیں۔ ایک مخصوص ذہنیت نے مختلف ادوار میں ہمارے ذہن میں یہ خوش فہمی ڈال دی ہے کہ گویا دنیا میں ہم سے بہادر قوم دوسری کوئی ہے ہی نہیں۔ ہمیں تھپکی دے کر متعدد بار دوسروں کی جنگوں یا لاحاصل لڑائیوں میں جھونک کر دوسروں نے اپنے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ میری نظر میں ہماری نام و نہاد بہادری کو استحصالی بنیادوں پر استعمال کیا گیا حالانکہ ہم ہر دور میں دوسروں کے زیرِ عتاب رہے۔ اب تو ہمیں یہ دن بھی دیکھنے پڑ گئے ہیں کہ سوات کے جو لوگ مرغ ذبح کرنے کے لیے مہمانوں کے ہاتھوں میں چھری دیا کرتے کہا گیا وہ انسانوں کو ذبح کرتے ہیں۔

4- ڈاکٹر محمد فاروق خان (نفسیاتی معالج، مصنف)

میں نے بطور ڈاکٹر پشتونوں کے عام لوگ تو ایک طرف نفسیاتی مریضوں کو بھی انتہائی بااخلاق، نرم خو اور انسانیت سے محبت کرتے دیکھا ہے ان میں سے 90 فیصد کو تشدد اور جنگ پر بدترین تشویش لاحق تھی۔ طالبان کی سرگرمیوں سے لاکھوں لوگ نفسیاتی مریض بن گئے تھے اگر یہ لوگ تشدد پسند ہوتے یا زندگی سے محبت نہ کر رہے ہوتے تو ان پر بدترین

نفسیاتی دباؤ اس حد تک نہ بڑھتا کہ ان کو جنگ کی حالت میں ڈاکٹروں سے رجوع کرنے کی نوبت پیش آتی۔ جس معاشرے کی دینی، اخلاقی اور ثقافتی اقدار مضبوط ہوں وہ انتہا پسندی یا ظلم کی بھینٹ نہیں چڑھا کرتا۔

5- جمال شاہ (فنکار، رائیٹر، ڈایریکٹر)

میں ہر اس شخص کی مذمت کرتا ہوں جس کی رائے ہے کہ پشتون عام اصطلاح کی رو سے انتہاپسند ہیں۔ میں اس پروپیگنڈے کی ذمہ داری اُس مخصوص طبقے پر ڈالتا ہوں جس کو نہ صرف پشتونوں سے نفرت ہے بلکہ وہ پشتونوں کی تاریخ، روایات اور روّیوں سے بھی آگاہ نہیں۔ اس کی ایک بنیادی ذمہ داری پاکستانی میڈیا اور اس کے دانشوروں پر بھی عائد ہوتی ہے انہوں نے میڈیا پر پشتونوں کو سمگلر، ظالم، اغواء کار اور جاہل کے طور پر پیش کر کے اس قوم کے امیج کو انہی منفی کرداروں تک محدود کر رکھا ہے۔ ایسے طبقوں کا یہ افسوسناک روّیہ محض موجودہ دور کی پیداوار یا عکاس نہیں ہے یہ کام بہت پہلے سے ایک مستقل پالیسی کے تحت جاری ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یقیناً یہ بھی ہے کہ پشتونوں کا اپنا میڈیا یا موثر مطبوعاتی ادارہ نہیں ہے اس روّیے کو ردّ کرنے کے علاوہ اس کی مذمت بھی کرتا ہوں۔

✿ ✿ ✿ ✿

کوئٹہ شوریٰ، حقیقت یا افسانہ

سال 2009ء کے وسط میں جہاں ایک طرف پاکستانی فورسز ملاکنڈ ڈویژن میں طالبان کے خلاف کارروائیوں میں مصروف تھیں تو دوسری طرف امریکہ نے پاکستان میں کوئٹہ شوریٰ کے نام سے طالبان کی اعلیٰ قیادت کی موجودگی کا شور مچا کر نہ صرف یہ کہ ایک نئے محاذ کی نشاندہی کی بلکہ اعلیٰ ترین امریکی حکام نے بلوچستان پر ڈرون حملوں کی دھمکیاں بھی دینا شروع کر دیں۔ کوئٹہ شوریٰ کی موجودگی پر نیویارک ٹائمز اور واشنگٹن پوسٹ نے بے شمار خبریں، رپورٹس اور تبصرے شائع کر کے اس کی موجودگی پر سخت تشویش کا اظہار کرنے کے علاوہ اوبامہ انتظامیہ سے شدت کے ساتھ یہ مطالبہ بھی شروع کر دیا کہ شوریٰ سے نمٹنے یا اس کے خاتمے کے لیے مؤثر اور فوری کارروائی کی جائے۔

اس صورتحال نے پاکستانی حکومت اور انٹیلی جنس اداروں کو شدید تشویش میں مبتلا کر دیا کیونکہ فورسز نہ صرف یہ کہ ملاکنڈ ڈویژن میں فیصلہ کن کارروائیاں کر رہی تھیں بلکہ وہ حکومت کی خواہش کے مطابق طالبان کے گڑھ وزیرستان کا گھیراؤ کرنے کی پلاننگ میں بھی مصروف تھیں بلکہ حکومت کے لیے صورتحال اس حوالے سے تشویشناک تھی کہ حکمران بلوچستان کی داخلی شورش کا سیاسی حل نکالنے کی کوشش کے علاوہ عالمی برادری پر زور دینے میں مصروف تھے کہ وہ بھارت اور بعض دوسرے ممالک کی جانب سے بلوچستان میں مداخلت کا نوٹس لے۔ اس صورتحال میں کوئٹہ شوریٰ کی موجودگی اور اس کے خاتمے کے لیے ڈرون حملوں کی دھمکیوں نے حالات اور ماحول کو اور بھی پیچیدہ اور پریشان کن بنا دیا۔

امریکی میڈیا کی اطلاعات کے علاوہ مغربی انٹیلی جنس کی رپورٹس کو بنیاد بناتے ہوئے امریکی حکام کا رویہ روز بروز جارحانہ ہوتا گیا اور حالت یہ ہوئی کہ حکومت پاکستان اور عوام کے علاوہ بلوچستان کی سیاسی قوتوں اور پاکستان کی عسکری قیادت کو بھی ڈرون حملوں کی مزاحمت کے بیانات دینے پڑے۔ امریکہ کے کئی سفارتی حکام نے کوئٹہ کے علاوہ بلوچستان کے متعدد شہروں اور علاقوں کے دورے کر کے وہاں صاحب الرائے حلقوں سے براہ راست مکالمے اور ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ ان کی دیدہ دلیری کا یہ عالم تھا کہ سال 2009ء کے وسطی مہینوں کے دوران کراچی میں امریکی قونصلر جنرل نے کوئٹہ جا کر نہ صرف ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا بلکہ انہوں نے متعدد سیاسی لیڈروں سے ملاقاتیں بھی کیں۔ موصوف نے ان ملاقاتوں کے دوران سفارت کاری کے آداب کی خلاف ورزی کرتے ہوئے امریکہ کے لیے باقاعدہ لابنگ کرنے اور بعض افراد کو مختلف قسم کی ترغیبات دینے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اس قسم کے ردِعمل، الزامات اور لابنگ کے بعد یہاں تک کہا گیا کہ طالبان کی اعلیٰ قیادت نہ صرف یہ کہ بلوچستان میں موجود ہے بلکہ ملا عمر سمیت متعدد دوسرے اہم لیڈروں نے کراچی کے بھی متعدد دورے کیے ہیں۔ ان دعوؤں نے بلوچستان اور سندھ کی سیاسی قوتوں اور عوام کو بھی تشویش سے دوچار کر دیا اور دونوں صوبوں میں بے چینی کی ایک نئی لہر نے کروٹ لی کیونکہ یہ لوگ فاٹا اور ملاکنڈ ڈویژن میں طالبان کے کارنامے سن اور دیکھ چکے تھے۔

اس بات سے قطع نظر کہ کوئٹہ شوریٰ واقعتاً بلوچستان میں ہے یا نہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ بلوچستان کی پشتون بیلٹ اور افغانی طالبان یا افغانیوں کے درمیان ماضی کے روابط اور تعلقات کا جائزہ لیا جائے۔ افغانستان کے اندر بے نظیر بھٹو کی دوسری حکومت کے دوران جب پاکستان کی مقتدر قوتوں نے اپنی پسند کی حکومت کے قیام کے ایک فارمولے کے تحت طالبان کے نام پر ایک نئی قوت افغانستان میں داخل کرنے کا پلان بنایا تو اس پلان کی تشکیل اور عملی ہونے کے لیے کراچی اور کوئٹہ کے ایک مخصوص طبقۂ فکر کے سیاسی علماء نے مرکزی کردار ادا کیا۔ طالبان کے متوقع نظام اور قیادت کو چلانے کے لیے جن افغان علما یا مولویوں کا ابتدا میں انتخاب کیا گیا ان میں سے اکثریت کوئٹہ اور کراچی میں پہلے ہی سے

موجود تھے اور پاکستان کے خفیہ ادارے جامعہ بنوریہ کراچی کے سربراہ مفتی شامیزئی اور ان کے تین رفقاء کے ذریعے ان افراد کے ساتھ مہینوں رابطوں میں رہے۔ ایک نظریاتی گروپ کی تشکیل کے بعد دو درجن کے قریب ان افغان علما کو پاکستانی اداروں کی پلاننگ کے تحت چمن اور سپین بولاک کے راستے قندھار پہنچایا گیا۔ اس عرصے کے دوران ان افراد کا ساتھ دینے کے لیے افغانستان کے مختلف شہروں میں موجود پرو پاکستان عناصر کو پہلے ہی ذمہ داریاں سونپی جا چکی تھیں۔ ان کو پاکستان کی طرف سے رعایتیں دینے کا یہ عالم تھا کہ ان کے رشتہ دار افغانستان میں ان کی وجودگی کے دوران کوئٹہ اور پشاور کے کوڈ ملا کر ٹیلی فون کیا کرتے تھے (یہ سلسلہ مجاہدین کے دور سے جاری تھا) متضاد معلومات کو نظر انداز کرتے ہوئے بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ صوبہ سرحد اور فاٹا کے اسلام پسند گروپ، جہادی طالبان کی کامیابیوں کے بعد ان کی حمایت کا حصہ بنے تھے ابتداء میں طالبان کی پیشقدمی کامیابیوں اور مجوزہ نظام کی پلاننگ جن شہروں میں کی گئی تھی وہ کوئٹہ اور کراچی ہی تھے۔

بلوچستان کی پشتون بیلٹ میں جے یو آئی (ف) کو ہر دور میں بھرپور عوامی حمایت اور طاقت حاصل رہی ہے چونکہ مجاہدین کی زیادہ تر تنظیموں پر جے یو آئی کے بجائے جماعت اسلامی اور بعض دوسرے گروپوں کا ہولڈ تھا اس لیے اب کے بار پاکستانی مقتدر قوتوں نے جے یو آئی کے بلوچستان میں پہلے سے موجود ہولڈ کو استعمال میں لانے کا تجربہ کر لیا اور اسی تجربے میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہو گئیں۔ مجاہدین کے برعکس اب کے بار حاوی ہونے والی اس اسلامی تنظیم کے لانچنگ پیڈ پشاور کی بجائے کوئٹہ اور جلال آباد کی جگہ قندھار بن گئے۔ اس قوت کو نظریاتی اور سیاسی سپورٹ کراچی سے فراہم کی جا رہی تھی جبکہ آئی ایس آئی کے تین اعلیٰ افسران نے نہ صرف کوئٹہ میں ڈیرے ڈال دیئے بلکہ وہ قندھار تک بھی وقتاً فوقتاً اس قوت کے ساتھ ہمسفر رہے۔ جے یو آئی بلوچستان کے بعض رہنما طالبان کے فکری نظریے سے اختلاف کے باعث ان کی لانچنگ سپورٹ کے عمل کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہے تھے تاہم ان کی مزاحمت یا مخالفت کو نظر انداز کیا گیا۔

افغانستان سے روسی جنگ کے دوران جو لاکھوں افغان ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے انہوں نے صوبہ سرحد اور فاٹا کے علاوہ بڑی تعداد میں کوئٹہ، چمن، پشین، لورالائی،

قلعہ سیف اللہ اور کئی دوسرے پشتون شہروں میں قیام کیا تھا جہاں پر ان کو پشتون ہونے کے باعث جے یو آئی اور عام لوگوں کے علاوہ ابتدائی دور میں پشتون قوم پرستوں کی محدود حمایت اور ہمدردی بھی حاصل رہی۔ دوسرے علاقے تو ایک طرف کوئٹہ شہر کے مختلف علاقوں خصوصاً سٹیلائٹ ٹاؤن (پشتون آباد) ریلوے کالونی، سرد یاب روڈ اور متعدد دوسرے ان علاقوں میں بھی عام افغانیوں کے علاوہ مجاہد کمانڈروں کی ایک بڑی تعداد رہائش پذیر تھی جہاں پر پشتون اور بلوچ قوم پرستوں کی اعلیٰ قیادت رہا کرتی تھی۔ اس زمانے کا سٹیلائٹ ٹاؤن ایک طرح سے افغان کمانڈروں کے لیے پشاور کا یونیورسٹی ٹاؤن تھا۔ افغانیوں اور پشتون قوم پرستوں کے درمیان لمبے عرصے تک غیر اعلانیہ تعاون کا ایک سلسلہ بھی جاری رہا۔ یہ سلسلہ اُس وقت اختلاف میں بدل گیا جب بعد کے ادوار میں پشتونخواہ ملی عوامی پارٹی نے تاجک کمانڈروں یعنی پروفیسر برہان الدین ربانی اور احمد شاہ مسعود کے حق میں ایک باقاعدہ مہم چلائی۔ جبکہ افغانیوں کی اکثریت پشتون تھی۔ اس لیے وہ نسلی بنیادوں پر پشتونخواہ میپ کے مخالف ہو گئے۔ کیونکہ پشتون آبادی پاک افغان سرحد پر واقع تھی اور اس کو افغانستان کے ساتھ تجارت کے لیے افغانیوں کی حمایت بھی درکار تھی۔ اس لیے یہ کاروباری مفاد بھی فریقین کے درمیان لمبے عرصے تک ممکنہ بہتر تعلقات کا ایک سبب بنا رہا۔

افغانی اور پاکستانی پشتونوں کے درمیان مذکورہ معاملات پر بعض اختلافات کے باوجود تعلق کسی نہ کسی حد تک بہتر ہی رہا۔ اس ضمن میں فریقین نے ایک دوسرے کی مزاحمت نہ کرنے اور افغانیوں کی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہ لینے کی یقین دہانی کے فارمولے پر بھی اتفاق کیا تھا لیکن طالبان چونکہ کوئٹہ چمن روٹ استعمال کر کے افغانستان میں داخل ہو رہے تھے اس لیے پشتونخواہ میپ نے اس موقع پر خاموش رہنے کی بجائے مخالفت کی پالیسی اختیار کر لی کیونکہ یہ پارٹی سیکولر اور قوم پرستانہ طرزِ فکر کی نہ صرف حامی تھی بلکہ ڈاکٹر نجیب اللہ اور ان کے بعد احمد شاہ مسعود کے ساتھ اس پارٹی کے گہرے روابط اور مراسم بھی تھے۔ اس دور کی محمود خان اچکزئی کی تقاریر ریکارڈ کا حصہ ہیں جن میں پارلیمنٹ کے اندر بھی طالبان اور پاکستانی خفیہ اداروں کی مخالفت کرتے سنے گئے تھے۔

طالبان نے سپین بولاک اور اس کے بعد قندھار پر قبضہ کر لیا تو رہے سہے افغانی

بھی (کوئٹہ والے) اُن کے ہمدرد بن گئے کیونکہ ان کو تجارت اور آمدورفت کے معاملے پر مقامی افغان کمانڈروں سے بہت شکایات رہا کرتی تھیں جو جہادی کمانڈر جہادی لیڈرشپ کے آپس کی لڑائیوں سے تنگ آ کر کوئٹہ میں خاموش زندگی گزار رہے تھے وہ بھی موقع پا کر نہ صرف طالبان کے ساتھ مل گئے بلکہ انہوں نے کوئٹہ میں بھرتی کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ کوئٹہ میں موجود بعض قوم پرست بھی طالبان کے حامی تھے یہ وہ لوگ تھے جو شمالی اتحاد کے مخالف تھے اور نسلی بنیادوں پر ایران اور شمالی اتحاد کی شدید مخالفت کر رہے تھے یوں طالبان کو بلوچستان سے جے یو آئی، سابق افغان جہادیوں اور محدود تعداد میں پشتون قوم پرستوں کی حمایت دستیاب ہوگئی۔

افغانستان میں طالبان کی حکومت کے قیام کے بعد جو شہر فکری اور سیاسی طور پر سب سے زیادہ متاثر ہوا وہ کوئٹہ ہی تھا تاہم پشتونخواہ میپ اور اے این پی کے علاوہ بلوچ قوم پرستوں کی موثر قوت کی موجودگی نے کوئٹہ میں طالبان یا ان کے حامیوں کو کھل کر نظریات کے پرچار یا عملی اقدامات کی اجازت نہیں دی۔ چونکہ 1988ء سے لے کر اب تک کے تمام عرصہ کے دوران (بلکہ 1973ء سے) پشتون بیلٹ میں جے یو آئی، اہم عوامی اور پارلیمانی قوت چلی آ رہی ہے اس لیے یہ پارٹی ہر دور میں صوبائی حکومت کے اہم فریق کے طور پر بلوچستان میں موجود رہی اور یہی موجودگی نہ صرف طالبان کے داخلے بلکہ بعد کے تمام ادوار تک طالبان کے لیے بہت سودمند ثابت ہوئی۔ جے یو آئی کے متعدد رہنما جن میں صوبائی امیر محمد خان شیرانی بھی شامل ہیں متعدد بار طالبان کے خالف پائے گئے اس کے باوجود نچلی سطح پر طالبان کے لیے نہ صرف پہلے بلکہ بعد میں بھی حمایت موجود رہی اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔

طالبان حکومت کے استحکام کے بعد امریکہ کے بعض حکام نے بعض دوسرے اقدامات کے علاوہ طالبان کو ایران کے خلاف اُکسانے کی ایک مہم کا آغاز کیا تو ان کی سرگرمیوں کا مرکز بھی کوئٹہ شہر ہی تھا۔ ممتاز برطانوی اخبار ڈیلی ٹائمز نے 1998ء کی اپنی کئی اشاعتوں میں ان رابطوں کے بارے میں رپورٹس شائع کیں۔ جن میں یہ اطلاعات بھی موجود تھیں کہ اس مہم کی ملاقاتوں کے دوران اسرائیلی خفیہ ادارے موساد کے بعض اہلکار بھی

موجود رہا کرتے تھے۔ (20 جون 1998ء) چونکہ ایران کی سرحد کوئٹہ یا بلوچستان کے قریب تھی اور طالبان ایران کے مخالف تھے اس لیے امریکہ اور اسرائیل نے بلوچستان میں نہ صرف اپنا جاسوسی نظام فعال بنایا بلکہ ڈیلی ٹائمز ہی کی ایک رپورٹ کے مطابق اسرائیلی وزارت خارجہ کے فارن ڈائریکٹر ائین بین زر نے دسمبر 1998ء میں نیویارک میں طالبان کے ایک اہم عہدیدار سے باقاعدہ ملاقات بھی کی۔ چونکہ امریکہ بھی ابتدا میں اندرون خانہ طالبان کا حامی تھا۔ اس لیے اس عالمی طاقت کو ابتدائی دور سے نہ صرف طالبان کی سرگرمیوں کا بلوچستان میں علم تھا بلکہ امریکہ اور اسرائیل کے علاوہ بھارت نے نائن الیون کے بعد بھی اپنے نیٹ ورکس کے ذریعے بلوچستان میں جاری طالبان کی سرگرمیوں اور آمدورفت کو مانیٹر کیے رکھا۔ یہ رپورٹ بھی شامل ہوئی ہے کہ اس وقت کے وزیر داخلہ جنرل بابر اور امریکی سفیر نے طالبان کی تخلیق سے پہلے کوئٹہ کا دورہ کیا تھا جنرل بابر طالبان کو اپنے ہی بچے قرار دیتے رہے تھے۔

سال 2002ء سے لے کر سال 2009ء تک پاکستانی اداروں نے اخوند کے 11 چھپے والے تین طالبان وزراء اور مرکزی شوریٰ کے نو دوسرے افراد کے علاوہ کوئٹہ اور بعض دوسرے شہروں میں پچاس کے لگ بھگ طالبان کمانڈر گرفتار کر لیے بعض رپورٹس کے مطابق کوئٹہ، پشاور، فیصل آباد اور ملتان کی طرح ان شہروں میں شامل ہے جہاں سے متعدد اہم القاعدہ ارکان کی گرفتاریاں عمل میں لائی جا چکی ہیں۔ اس لیے اس امکان کو کلی طور پر رد نہیں کیا جا سکتا کہ کوئٹہ میں طالبان کمانڈرز موجود نہیں ہوں گے تاہم کوئٹہ شوریٰ کی موجودگی، فعالیت اور کراچی تک عمل دخل کی اطلاعات اُس وقت تک تصدیق کا مرحلہ طے نہیں کر سکتیں جب تک ان تمام ایشوز کو ثبوتوں کی بنیاد پر ثابت نہیں کیا جاتا۔ متعدد ان رپورٹس کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا جن کی رو سے طالبان کے بعض اضلاع میں باقاعدہ کارروائیاں بھی دیکھی جا چکی ہیں۔ ایسی ہی ایک کارروائی کے دوران چند برس قبل طالبان کمانڈر (پاکستانی) عبداللہ محسود کو ضلع ژوب میں ہلاک کیا گیا تھا جبکہ ملا داد اللہ اور صفور داداللہ کے علاوہ بعض اہم کمانڈروں کے خلاف بھی بلوچستان ہی میں کارروائیاں کی جا چکی ہیں۔ اس ضمن میں پاک افغان بارڈر چمن پر نیٹو کی سپلائی لائن پر 20 سے زائد کامیاب حملوں کے واقعات کو بھی

نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جبکہ ان درجنوں افراد کی گرفتاریوں کو بھی ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے جن کو پاکستانی حکام نے 2009ء کے دوران ہلمند آپریشن کے دوران وہاں سے یہاں آتے ہوئے اور اتحادی فورسز نے یہاں سے وہاں جاتے وقت گرفتار کیا تھا۔

بلوچستان میں طالبان کے روٹس، تعداد اور اثر رسوخ کے بارے میں نیوز لائن کی ایک رپورٹ

آنکھوں پر چشمہ لگائے، سیاہ پگڑی کے باہر نکلے ہوئے بھاری لمبے بالوں والا حافظ بسم اللہ دیکھنے میں جنگجو سے زیادہ ایک سکالر لگتا ہے وہ ایک مدرسے میں استاد ہے اس کی عمر لگ بھگ 35 سال ہے۔ وہ تربیت یافتہ گوریلا ہے اور حال ہی میں افغانستان سے آیا ہے جہاں وہ طالبان کے ساتھ مل کر لڑتا ہے وہ پنج پیری افغان مہاجر کیمپ کے احاطہ میں کچے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا درس دے رہا تھا کہ جہاد میں حصہ لینا ہم سب کا مذہبی فریضہ ہے۔ کوئٹہ سے کوئی 60 میل شمال مغرب میں یہ کیمپ وسیع چٹانی میدان میں واقع ہے اور طالبان کے مضبوط گڑھ افغان صوبہ قندھار کا علاقہ سلراٹ یہاں سے 25 میل سے بھی کم فاصلے پر ہے۔ درمیان میں بنجر پہاڑی علاقہ ہے یہ کیمپ 30 سال قبل افغانستان پر روسی قبضے کے بعد وہاں سے آنے والے پناہ گزینوں کو ٹھہرانے کے لیے قائم کیا گیا تھا اور اب بھی وہاں 25 ہزار کے قریب افغان مہاجرین مٹی سے بنے کچے گھروں میں مقیم ہیں۔ ان کی اکثریت طالبان کی زبردست حامی ہے۔

ان میں سے بہت سے اسی کیمپ میں پروان چڑھے۔ 28-29 سالہ پیر نامی شخص جس کے والدین 1980ء کے اوائل میں قندھار سے ہجرت کر کے یہاں آئے کا کہنا ہے کہ ''ہم اپنے ملک کو قبضے سے آزاد کرانے کے لیے جنگ کر رہے ہیں تاکہ وہاں صحیح اسلامی نظام قائم کیا جا سکے۔ عسکریت پسند بارڈر کے دونوں اطراف آسانی سے آجا سکتے ہیں کیونکہ بارڈر فورسز بہت دور دور متعین ہیں۔ افغانستان میں لڑائی بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہاں کے نوجوانوں کی بڑی تعداد طالبان کے ساتھ جا ملتی ہے۔ حافظ بسم اللہ کا کہنا ہے کہ اس سے پہلے کبھی اتنی بڑی تعداد میں نوجوان ہمارے ساتھ شامل نہیں ہوئے تھے جتنے اب ہو رہے ہیں۔ پنج پیری بلوچستان میں بارڈر پر پھیلے نصف درجن سے زائد مہاجر کیمپوں میں سے ایک

جنگجوؤں کی نئی نسل پروان چڑھا رہے ہیں۔ چمن میں افغان اب کل آبادی کا 50 فیصد بنتے ہیں لیکن ان کے اور اچکزئی اور نورزئی قبائل کے مقامی پشتونوں کے درمیان فرق کرنا مشکل ہے۔ یہ قبائل سرحد کے دونوں طرف آباد ہیں۔ بہت سے طالبان کمانڈر اپنے خاندانوں کے ساتھ چمن میں آباد ہو چکے ہیں۔ اسی طرح سے سابق طالبان حکومت کے اعلیٰ عہدیدار بھی شناخت بدل کر یہاں رہائش اختیار کر چکے ہیں۔ طالبان کے سپریم کمانڈر ملا عمر کا نائب برادر اکثر اس علاقے میں نظر آتا ہے۔ محکمہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے نائب وزیر ملا سلیم کو بھی یہیں دیکھا گیا۔ نورزئی قبیلے سے تعلق رکھنے کے باعث اس کے لیے مقامی افراد میں گھل مل جانا مشکل نہیں ہے افغان بارڈر فورس کے سربراہ جنرل عبدالرزاق سمیت افغان سپیشل آرمی اور بارڈر فورس کے بہت سے افسر بھی اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ یہاں بس چکے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق افغان بارڈر فورس سے تعلق رکھنے والے تقریباً 50 فیصد اہلکاروں نے پاکستانی علاقے میں گھر بنا لیے ہیں۔

اس موجودگی کے باوجود پاکستانی حکام یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ طالبان نے نیٹو فورسز پر حملے کے لیے کبھی پاکستانی علاقہ استعمال نہیں کیا۔ وزارت داخلہ کے ایک اعلیٰ عہدیدار کا کہنا ہے کہ طالبان جو کچھ کرتے ہیں سرحد پار افغان علاقے سے کرتے ہیں۔ پاکستانی سیاسی رہنما اور تجزیہ نگار انتباہ کرتے ہیں کہ گنجان آباد علاقوں میں واقع ان مہاجر کیمپوں میں طاقت کے استعمال کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ وڈرو ولسن سنٹر واشنگٹن کی سنیئر فیلو امریکہ میں پاکستان کی سابق سفیر ملیحہ لودھی کا کہنا ہے کہ اگر ان کیمپوں میں صابرہ اور شتیلا کیمپوں جیسا آپریشن کیا گیا تو اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

2010ء اور دہشت گردی کی جنگ

سال 2009ء کے دوران پاکستان کو اپنی سلامتی اور مستقبل کے حوالے سے جس تشویشناک صورتحال سے دوچار ہونا پڑا اُس نے سال 2010ء کے بارے میں بھی مختلف قسم کے نئے اندیشوں اور پیچیدگیوں کو جنم دے کر متعدد نئے مگر خطرناک سوالات کا راستہ ہموار کر دیا ہے۔ متعدد دفاعی اور سیاسی تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ سال 2010ء پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے دو اہم ترین ایشوز یا نکات کے حوالے سے ایک فیصلہ کن صورتحال سے دو چار ہو گا۔

پہلا یہ کہ آیا پاکستان میں ان پارٹیوں پر مشتمل حکومت قائم رہ پائے گی جو کہ دہشت گردی کے خلاف یکسو ہو کر بہت سی قوتوں اور بااثر حلقوں کے لیے زیادہ پسندیدہ یا قابل قبول نہیں۔

دوسرا یہ کہ اگر پی پی پی، اے این پی اور ایم کیو ایم جیسی سیکولر پارٹیوں پر مشتمل یہ حکومت گرا دی گئی تو دہشت گردی کے خلاف جنگ کیا شکل اختیار کرے گی اور ایسا ہونے کی صورت میں عالمی اتحادیوں خصوصاً امریکہ اور برطانیہ کا ردِعمل اور لائحہ عمل کیا ہو گا۔

بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ دوسری تمام پارٹیاں اُس آگ کو اب بھی غیر ملکی مداخلت کا نتیجہ قرار دینے پر تلی ہوئی ہیں جس نے فاٹا، پختونخواہ اور پنجاب کو گھیرے میں لے کر اسلام آباد کی حاکمیت اور مرکزیت کو بھی سوالیہ نشان بنا کر سندھ اور بلوچستان کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا اور اس کی تازہ مثال کراچی میں عاشورہ کے جلوس میں دھماکہ یا حملہ ہے۔

مصدقہ اطلاعات یہ ہیں کہ اگر فورسز نے وزیرستان سمیت تمام قبائلی ایجنسیوں

سے انتہا پسند جنگجوؤں کا خاتمہ نہیں کیا اور کارروائیوں کے سلسلے کو جنوبی پنجاب اور بلوچستان تک نہیں پھیلانے دیا تو دہشت گرد پہلے سے مفلوج صوبہ پختونخواہ کو نہ صرف یہ کہ عملاً اپنے قبضے میں لینے کی کوشش کریں گے بلکہ دوسرے مرحلے کے طور پر بلوچستان کی پشتون بیلٹ، سندھ اور پنجاب کو بھی پشاور کی طرح بدترین صورتحال سے دوچار کر دیں گے۔ اگر دہشت گردوں کی قوت، تعداد، کمٹمنٹ اور ہتھیاروں کا کھلی آنکھوں سے جائزہ لیا جائے اور اس تمام فیکٹر میں القاعدہ کے نیٹ ورک کا احساس کیا جائے تو کوئی وجہ نظر نہیں آرہی کہ یہ لوگ پاکستان کے ایک بڑے حصے پر قابض رہنے یا قبضہ کرنے کے لیے ایک فیصلہ کن جنگ کا آغاز نہ کریں۔

سوات آپریشن کی کامیابی کو جو مبصرین شرپسندوں کی مکمل پسپائی اور خاتمے کا نام دے رہے تھے وہ بعد کی مزاحمت اور حملوں کو محض ردِعمل کا نام دے کر ایک بار پھر قوم کو گمراہ کرنے پر تلے نظر آتے ہیں۔

لاہور، کراچی، اسلام آباد اور پشاور کے علاوہ پورے ملک کو جس جس طریقے سے دہشت گردی کا نشانہ بنایا گیا وہ یہ سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ فیصلہ کن جنگ لڑنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں بلکہ وہ ایسا کرنے کی بھرپور قوت اور صلاحیت بھی رکھتے ہیں اور وہ ایسا کرنے کے اعلانات بھی کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔

طالبان اور ان کے غیر ملکی اتحادیوں کے نہ صرف یہ کہ لیڈر اور ٹاپ کمانڈرز زندہ اور محفوظ ہیں بلکہ ان کی افرادی قوت، اسلحہ اور روٹس بھی تاحال بچے ہوئے ہیں۔ کئی سیاسی قوتیں نام ونہاد امریکی مخالفت کی آڑ میں اب بھی ابہام، منافقت اور دوہری پالیسی کا شکار ہو کر فوجی قیادت اور حکومت کو وہ حمایت اور معاونت فراہم نہیں کر رہے جن کا حالات تقاضا کر رہے ہیں۔ مذہبی جماعتوں کے علاوہ مسلم لیگ (ن) جیسی پارٹی بھی کسی نہ کسی حد تک طالبان ہی کو عملاً اسپورٹ فراہم کرتے نظر آرہی ہے کیونکہ یہ پارٹی ماضی میں جہاد اور جہادیوں کی زبردست حامی رہی ہے۔

دوسری طرف اے این پی اور ایم کیو ایم جیسی پارٹیوں کو خدشہ ہے کہ 2010ء میں جنگجوؤں کی کارروائیاں مزید تیز ہوں گی۔ دونوں پارٹیوں کے اس موقف کو اگر محرم کے

دوران کراچی اور یکم جنوری کو لکی مروت کے حملوں کی صورت میں دیکھا جائے تو یہ خدشہ یقین میں آتا ہے کہ اگر وفاق پرست دینی اور سیاسی قوتوں کے علاوہ دانشوروں اور سول سوسائٹی نے بعض اختلافات سے قطع نظر دہشت گردی کے معاملے پر پی پی پی اور اے این پی جیسی پارٹیوں کے علاوہ پاک فوج کا کھل کر ساتھ نہیں دیا تو یہ بات ماضی کے واقعات کی روشنی میں حقیقت کی صورت اختیار کر جائے گی کہ منظم اور کمٹیڈ دہشت گرد پاکستان کو ممکنہ حد تک کمزور کر کے اپنے مقاصد کی تکمیل کی حتی المقدور کوشش کریں گے۔ اگر سوات میں کارروائی کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھی تو اس کی بڑی وجہ اے این پی کی وہاں مکمل سیاسی موجودگی گڈ ویل اور دوسری سیاسی قوتوں کی حمایت بھی تھی کیونکہ فورسز کے بل بوتے پر کوئی فوجی کارروائی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے سیاسی اور عوامی حمایت اور اقدامات انتہائی ضروری امر سمجھا جاتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ پاکستان کی پنجاب اور سندھ سبسیڈ سیاسی قوتیں اُس جنگ کا ادراک ہی نہیں رکھتیں جو کہ جہاد کے ایک عالمگیر مگر متشدد فلسفے کی بنیاد پر ایک اسلامی اِمارت کے قیام کے لیے اس خطے خصوصاً ڈیورنڈ لائن کے دونوں اطراف میں لڑی جارہی ہے یا لڑی جائے گی۔

ملک گیر سیاسی پارٹیوں کی حالت یہ ہے کہ ان کے لیڈر کوئٹہ، پشاور اور فاٹا میں ڈرائنگ رومز کے اندر بھی اجلاس منعقد کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ ایسے میں یہ کہنا کہ فاٹا، پختونخواہ اور بلوچستان میں ریاستی عملداری واقعتاً قائم رہے گی، ممکن دکھائی نہیں دے رہا۔

حقیقت پسند تبصرہ نگاروں اور سیاسی رہنماؤں کو علم ہے کہ وزیرستان سے طالبان جن علاقوں میں آپریشن سے قبل منتقل ہو چکے ہیں ان میں فاٹا کی دوسری ایجنسیوں کے علاوہ جنوبی پنجاب اور بلوچستان کے پشتون علاقے بھی شامل ہیں۔ ان مصدقہ اطلاعات پر یقین نہ کرنے والے وہ لوگ ہی ہو سکتے جو درحقیقت لاہور اور اسلام آباد کے محلات میں بیٹھ کر ٹی وی مباحثوں اور مذاکروں ہی پر انحصار کرتے ہیں۔ اسی حقیقت میں اب کوئی شک ہی نہیں رہا کہ افغانستان میں امریکہ نواز قوتوں اور مزاحمتی گروپوں کی مصالحت کے بعد اگر عالمی قوتیں اس خطے میں اپنی موجودگی کو جواز بنائیں گی تو اس کے لیے واحد آپشن یہ ہے کہ پاکستان کے حالات کو مزید بگاڑ کی جانب لے جایا جائے اور اس وقت ایسا ہو بھی رہا ہے۔ ایسی

حالت میں اس خدشے کو حقیقت میں بدلتے دیر نہیں لگے گی کہ عالمی قوتیں پڑوسی ممالک اور دہشت گرد گروپس اپنے اپنے ایجنڈوں کی تکمیل کے لیے پاکستانی علاقوں ہی کو اپنی سرگرمیوں اور سازشوں کا مرکز بنا کر نئے مگر پاکستان کش پلان کا آغاز کر سکتے ہیں۔ اسلام آباد، لاہور اور کراچی میں بیٹھے لیڈر اگر اس جنگ کو محض وادی پشاور یا فاٹا تک محدود رہنے والی لڑائی سمجھ کر نان ایشوز میں الجھے رہیں گے تو پاکستانی ریاست کو اس کی بھاری قیمت چکانا پڑے گی اور بدقسمتی سے اب تک ایسا ہی رویہ دیکھنے کو ملتا آیا ہے۔ پشاور میں اے این پی کی موجودگی، قبائلی پس منظر رکھنے والی آبادی اور جرأت مند بہادر پولیس فورس کی موجودگی کے باوجود اگر دارالحکومت کو کہیں اور منتقل کرنے کی افواہیں پھیل سکتی ہیں تو یہ محض افواہیں نہیں کہلائی جا سکتیں بلکہ یہ اس جانب اشارہ کرتی ہیں کہ حملہ آور واقعی بہت، طاقتور اور منظم ہیں۔

اگر اس قسم کی صورتحال اسلام آباد، لاہور اور ملتان میں پیدا ہوتی ہے تو سوال یہ ہے کہ وہاں کے بااثر لوگ، سیاسی لیڈر، حکام اور سب سے بڑھ کر عوام کتنی دیر تک کس طرح ایسے حملوں کا مقابلہ کر سکیں گے اس سوال کا جواب فی الوقت تو نہ اور شاید کبھی نہیں کی صورت ہی میں ملتا دکھائی دے رہا ہے۔ دوسری طرف امریکہ کے ڈرون حملوں میں نہ صرف اضافہ ہو رہا ہے بلکہ حقانی گروپ کے معاملے پر امریکہ اور پاکستان کے اختلافات بھی زیر بحث ہیں۔ سال 2010ء کو ہم قومی سلامتی کے حوالے سے 2009ء کے واقعات، کوتاہیوں اور منصوبہ بندیوں سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے کیونکہ اس برس نہ صرف یہ کہ فریقین کے درمیان فیصلہ کن جنگ کے امکانات دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں بلکہ ابھی سے اس کی تیاری ہو بھی رہی ہے۔ اس جنگ کے شعلے یقینی بات ہے کہ محض موجودہ علاقوں یا حدود و اہداف تک محدود نہیں رہیں گے۔

ٹی ٹی پی کی صف بندی کا یہ عالم ہے کہ درۂ آدم خیل کے انتہا پسند جنگجو کمانڈر طارق آفریدی کو بیت اللہ محسود کی ہلاکت کے بعد محض اس شرط پر اہم کمانڈرز کی فہرست میں شامل رکھنے دیا گیا کہ وہ پشاور کو تباہ کرنے کے لیے عملاً کتنی کارروائیاں کر سکتا ہے۔ اس ڈیل کو دوسرے الفاظ میں کچھ اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ محض ایک شخص کو اُس پشاور کی تباہی کا مشروط ٹھیکہ دیا جاتا ہے جس کی حفاظت کے لیے سات ہزار پولیس فورس اور چار ہزار سے

زائد فوجی جوان اور پوری حکومتی مشینری مامور ہے اور سب نے دیکھ لیا کہ اس تمام مشینری کو کس طریقے سے بے دست و پا کر کے رکھ دیا گیا اس تناظر میں مزید کیا کچھ کرنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اگر وزیرستان کے طالبان نے ابھی تک مزاحمت نہیں کی اور وہ دوسرے علاقوں خصوصاً پنجاب اور بلوچستان کی طرف نکل گئے ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب کراچی میں ملا عمر اور کوئٹہ شوریٰ کی موجودگی کی باتیں کی جا رہی ہیں یہ سوال کرنا غیر مناسب نہیں کہ جو کھلاڑی پاکستان کو میدانِ جنگ بنانے پر تلے ہوئے ہیں ان کے اہداف محض فاٹا یا پختونخواہ تک محدود ہیں یا وہ پورے پاکستان کو لپیٹنے کی مذموم سازش میں مصروف ہیں؟

2010ء کے دوران طالبان اور ان کے اتحادیوں کے جو عزائم، فیصلے اور اقدامات مصدقہ اطلاعات کی بنیاد پر متوقع ہیں ان میں اے این پی اور پی پی پی کی ٹاپ لیڈر شپ کو نشانہ بنانا، وزراء اور ممبران اسمبلی کو قتل کرنا یا اغوا کرنا، اہم شخصیات کو ٹارگٹ کلنگ کے ذریعے مروانا، حکومت کے خلاف نفرت بڑھانے کے لیے حسبِ سابق عام شہریوں کو حملوں، دھماکوں سے ہلاک کروانا، غیر ملکیوں کو قتل کرنا یا اغوا کرنا، فورسز خصوصاً پولیس اور ایف سی پر حملے تیز کرنا، سفارتخانوں کو نشانہ بنانا۔ شیعہ اور دوسرے مخالف مسالک کے مراکز اور لیڈروں کو نشانہ بنانا، سول سوسائٹی اور میڈیا کے متعدد اہم افراد کے خلاف ایکشن لینا، اعلیٰ سرکاری افسران کو اغوا کر کے ان کے بدلے گرفتار دہشت گردوں کو رہا کروانا اور حکومتی سرگرمیوں کو مکمل اور ممکنہ حد تک مفلوج کرنا شامل ہیں۔ دیکھا جائے تو اس صورتحال کی ابتدا کی بھی گئی ہے اور نئی صف بندی کے بعد اس پر عمل درآمد کا سلسلہ بھی شروع ہو جائے گا۔ اگر افغانستان میں فریقین کے درمیان مفاہمت ہو جاتی ہے تو لازمی بات ہے کہ اس کے منفی اثرات پاکستان ہی میں عملی شکل میں نمودار ہونا شروع ہوں گے کیونکہ پاکستانی طالبان اور ان کے اتحادیوں نے حکومت یا فورسز کے ساتھ مذاکرات یا مفاہمت کا کوئی دروازہ ہی کھلا نہیں رکھا۔ افغانستان میں ہونے والی متوقع پیشرفت میں القاعدہ کی افغان سرحدوں اور علاقوں سے بے دخلی بھی شامل ہے اگر ایسا ہوتا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ القاعدہ سمیت 8 سے زائد ان غیر ملکی تنظیموں کی جائے پناہ کون سی ہو گی جو نہ تو اپنے اپنے ممالک کو قابل قبول ہیں اور نہ ہی وہ افغان طالبان کی طرح بڑے ممالک میں کسی سیاسی یا حکومتی سیٹ اپ کا حصہ بن سکتے

ہیں۔ اطلاعات یہ ہیں کہ یہ لوگ ڈیورنڈ لائن ہی پر موجود رہیں گے۔ دوسری طرف قاضی حسین کے اُس اعلان کو بھی ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے جس میں اس نے 180 خودکش بمباروں کی بات کی۔ دہشت گردی سے متعلق معاملات پر مختلف سیاسی قوتوں اور فورسز کے درمیان ہم آہنگی کے فقدان کے علاوہ پاکستانی فوج اور امریکہ کے درمیان بعض اختلافات کے اثرات بھی مرتب ہو رہے ہیں۔ پاک فوج کسی حد تک طالبان نامی قوت کو پاکستان سے نکالنے کے فارمولے پر تو متفق نظر آ رہی ہے تاہم افغانستان میں اس منظم قوت کی ترجیحات اب بھی پہلے سے مختلف نہیں ہیں۔ پاکستان کی فوج اور اس کے خفیہ ادارے ذہنی اور عملی طور پر اس بات کے لیے ابھی بھی تیار نہیں کہ افغانستان میں امریکہ کے خلاف جاری مزاحمت ختم ہو۔ یہ ادارے اب بھی طالبان اور ان کے اتحادیوں کو فعال اور متحرک رکھنا چاہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب جنوری 2010ء کے اوائل میں خوست میں طالبان کے ہاتھوں سی آئی اے کے ایک درجن کے قریب اہلکار مارے گئے اور امریکہ نے اس کی ذمہ داری طالبان کے مقامی گروپ پر ڈال کر پاکستان سے اس گروپ کے خلاف فیصلہ کن کارروائی کا تقاضا کیا تو پاکستان نے ایک بار پھر تعاون کے بجائے مزاحمت کا راستہ اختیار کر لیا۔ اس مزاحمت کو اگر حکومت کے بجائے پاک فوج کی پالیسی کا نتیجہ قرار دیا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ امریکہ اور پاک فوج کے درمیان ڈرون حملوں کے معاملے پر 2009ء کے سوات اور وزیرستان آپریشنز کے بعد مزید اختلافات پیدا ہونے لگے کیونکہ امریکہ نے سوات آپریشن پر اطمینان کے باوجود قبائلی علاقوں پر ڈرون حملے جاری رکھے۔ ایک اندازے کے مطابق فاٹا کے مختلف علاقوں خصوصاً وزیرستان کی دو ایجنسیوں میں سال 2009ء کے دوران 44 ڈرون حملے کیے گئے۔ ان حملوں کے نتیجے میں پاکستان کے دعوؤں کے مطابق 708 افراد جاں بحق ہو گئے جبکہ طالبان یا دوسرے گروپوں کے ہلاک ہونے والوں کی تعداد انتہائی کم رہی۔ پاکستان اور امریکہ کے درمیان کیری لوگر بل اور ڈرون حملوں کے معاملے پر پیدا ہونے والے اختلافات کو دراصل پینٹاگون اور جی ایچ کیو کے اختلاف اور دوریوں کے تناظر میں دیکھا گیا۔ سیاسی حکومت اندرونی دباؤ اور الزامات کے باعث عملاً اس معاملے سے الگ تھلگ رہی۔ حقانی گروپ کے خلاف کارروائی نہ ہونے پر امریکہ کی ناراضگی مستقبل میں کیا صورت

اختیار کر سکتی ہے اس پر فی الحال کچھ کہنا قبل از وقت ہو گا تاہم یہ بات طے شدہ ہے کہ حکومت میں سی آئی اے اہلکاروں کی ہلاکت کے بعد امریکہ کے لیے حقانی گروپ کو معاف کرنا شاید کہ ممکن نہ رہے اور اگر ایسا ممکن نہیں تو پاکستان کے حامی اس گروپ کے اُن ٹھکانوں کو نشانہ بنانے سے کشیدگی میں مزید اضافہ ہو گا جو پاکستان کے قبائلی علاقوں میں موجود ہیں اور پاکستانی فورسز اس گروپ کے خلاف کارروائیوں سے تاحال گریزاں ہیں۔ دوسری طرف فوج اور پاکستانی حکومت کے درمیان دہشت گردی کے خلاف جنگ کے بعض معاملات پر اختلاف رائے نے اس جنگ کے مستقبل سے متعلق بعض اہم سوالات کے علاوہ طالبان کی سب سے بڑی دشمن سیاسی قوت اے این پی کو بھی شدید مشکلات سے دوچار کر دیا ہے کیونکہ یہ پارٹی امریکہ، افغانستان، پاکستان اور سب سے بڑھ کر پاک فوج کے ساتھ بیک وقت معاملات چلانے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے اور جب فریقین کے درمیان اختلافات میں شدت پیدا ہو گئی تو اے این پی کی بہترین چوائس کا مسئلہ ایک گھمبیر صورت اختیار کرتا نظر آئے گا۔ دہشت گردی کی جاری اس جنگ نے اگر کسی ایک سیاسی قوت کو زندگی اور موت سے دوچار کر دیا ہے تو وہ اے این پی ہی ہے۔ ان پیچیدگیوں اور مختلف الخیال ترجیحات سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سال 2010ء کے دوران حالیہ جنگ فریقین کے درمیان ہم آہنگی پیدا نہ کرنے کے باعث مختلف محاذوں پر مختلف شکلوں میں چلتی نظر آئے گی اور اس کا سب سے منفی پہلو یہی نکلتا دکھائی دے رہا ہے کہ ہاتھیوں کی اس لڑائی میں نہ صرف پاکستان کے مزید ہزاروں بے گناہ لوگ مارے جائیں گے بلکہ پاکستان کا داخلی، سیاسی اور معاشی استحکام مزید خطرات سے دوچار ہو کر رہ جائے گا۔

ملک کے کئی نامور تجزیہ نگاروں اور دفاعی ماہرین نے پاکستان کو سال 2010ء کے دوران درپیش خطرات پر مندرجہ بالا اسباب کے تناظر میں اُجاگر کرتے ہوئے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اگر سیاسی قوتوں، حکمرانوں، فورسز، انٹیلی جنس ایجنسیوں، سول سوسائٹی اور میڈیا نے دہشت گردی کی اس جنگ پر کوئی ٹھوس، واضح اور متفقہ سٹینڈ نہیں لیا تو سال 2010ء حالیہ کشمکش کے حوالے سے پاکستان کے لیے بہت خطرناک سال ثابت ہو گا۔ اس سلسلے میں بڑے ایشوز کو اُجاگر کرنے کے علاوہ متبادل انتظامات اور اقدامات پر مشتمل جن تجزیہ نگاروں

نے ٹھوس نکات پیش کیے ہیں وہ یہ ہیں:

○ سلیم صحافی (مصنف، تجزیہ نگار)

حالات دن بدن پیچیدہ اور خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو اس پلاننگ کا شاید ادراک بھی نہیں جو کہ اس خطے کے حوالے سے انڈر پراسس ہے اور اس پلاننگ کے پاکستان کی سلامتی کے حوالے سے انتہائی منفی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ سیاسی قوتوں میں بے اتفاقی، جوڑ توڑ اور ہم آہنگی کا فقدان دہشت گردی کے معاملے پر بری طرح نظرانداز ہو رہا ہے۔ ملک کو باجرأت اور بالغ نظر قیادت کے مسئلے کا بھی سامنا ہے۔ ایسے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ قومی اتفاق رائے کے لیے اپنے اپنے طور پر آگے بڑھ کر اپنا کردار ادا کیا جائے۔

○ ایمل خان (صحافی، تبصرہ نگار)

حالات واقعی خراب ہو گئے ہیں اور ان پر قابو پانے کے لیے اس گڈ ویل کا مظاہرہ دیکھنے کو نہیں مل رہا جس کی ضرورت ہے۔ محض فوجی کارروائیوں پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ قوم کو اعتماد میں لینے کے ساتھ ساتھ پڑوسی ممالک کے خدشات ختم کرنے پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ حکومت اُس کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر رہی جس کی توقع کی جا رہی تھی۔ طالبان اب بھی ایک حقیقت ہیں اور ان کی موجودگی سے انکار کرنا ممکن نہیں۔ سیاسی قیادت کو اب ایک واضح اور دو ٹوک موقف اپنا کر قوم کو اعتماد میں لے کر پاکستان کی سلامتی کی فکر کرنا ہوگی۔

○ محمد عامر رانا (ڈائریکٹر PIPS)

ہم اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتے کہ ہم عسکری جہاد کے مکمل نرغے میں آ چکے ہیں اور اس سے نکلنے کے لیے ہماری شعوری، سیاسی اور عسکری تیاری اُس سطح کی نہیں جو ہونی چاہیے۔ ہم نے فاٹا سے لاتعلقی اختیار کر کے صوبہ سرحد کو آگ میں جھونک دیا اور اب سرحد سے بے پراوہ ہو کر پاکستان کی سلامتی سے لاپرواہی برت رہے ہیں۔ ہم اپنی غلطیوں اور ناکام ریاستی پالیسیوں سے کوئی سبق نہیں سیکھتے۔ ہم اپنے پڑوسیوں اور اتحادیوں کا اعتماد پانے میں بھی ناکام رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام متاثرہ اور متعلقہ فریقین کے ساتھ

مل کر کوئی لائحہ عمل تیار کریں۔

○ رستم شاہ مہمند (سابق سفیر)

اگر امریکی افغان طالبان کے ساتھ مذاکرات کر سکتے ہیں تو پاکستان کو بھی ایسا کرنے میں ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ اگر طالبان کے جائز مطالبات مان کر ان کو مذاکرات اور پرامن بات چیت کے ذریعے معاملات نمٹانے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے تو اس سے بے گناہ لوگوں کی مزید اموات کا راستہ رُک سکے گا جنگ اور بداعتمادی کی آگ دوسرے علاقوں تک پھیلنے سے بھی رُک جائے گی۔ المیہ یہ ہے کہ اس لڑائی میں بڑی تعداد میں عام لوگ مر رہے ہیں۔

○ اقبال خٹک (صحافی)

میری ذاتی رائے میں طالبان کسی بھی علاقے یا شہر کو مفلوج بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ منظم اور کمٹیڈ بھی ہیں ان کے برعکس دوسرے فریقین میں ہم آہنگی اور اعتماد کا فقدان ہے۔ وزیرستان آپریشن سے قبل راز داری اور تیاری سے کام نہیں لیا گیا جس کے باعث طالبان نکل گئے۔ اے این پی کی مزاحمت اور مخالفت کی مستقل پالیسی عسکریت پسندوں کے لیے خطرے کی وجہ بنی ہوئی ہے۔ محض فورسز کے ذریعے امن قائم نہیں ہو گا۔ حکومت کو بھی سیاسی، آئینی اور اقتصادی اصلاحات کی طرف توجہ دینی ہو گی۔ طالبان کا اگر تمام علاقوں میں پیچھا کیا جائے تو ان کی قوت اور نیٹ ورک کو توڑا جا سکتا ہے تاہم یہ کام فورسز پر نہیں ڈالا جا سکتا۔ اس کے لیے عوام کو اور سیاسی قوتوں کو بھی میدان میں نکلنا ہو گا۔ مجھے نہیں لگ رہا کہ اگر یہ سلسلہ پنجاب یا ملک کے دوسرے علاقوں تک پھیل گیا تو وہاں کے عوام مقابلہ کر سکیں گے۔ اس لیے اس کو یہیں پر روکنا لازمی ہو گیا ہے۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ وزیرستان کی صورت میں عسکریت پسندوں کا مضبوط بیس کیمپ اب فورسز کے ہاتھوں میں ہے کیونکہ گوریلا جنگوں میں اُس زمین کی بہت اہمیت ہوتی ہے جہاں پر جنگجو قیام اور پلاننگ کرتے ہیں۔

❁ ❁ ❁ ❁

آپریشن ناتمام

2010ء کے پہلے دو ماہ میں فورسز کی جانب سے ملاکنڈ، باجوڑ اور وزیرستان میں فوجی کارروائیوں کی کامیابی کے دعوؤں کے باوجود بم دھماکوں، خودکش حملوں اور ٹارگٹ کلنگ کے بے شمار واقعات رونما ہوئے۔ حملہ آوروں نے یکم جنوری سے صرف ایک روز قبل لکی مروت میں خودکش حملہ کر کے سو سے زائد شہریوں کو شہید کر کے پیغام دیا کہ نیا سال پچھلے برسوں سے مختلف نہیں ہو گا۔ یکم جنوری کو وزیرستان میں قیام کرنے اور ایک ویڈیو میں حکیم اللہ محسود کے ساتھ بیٹھے یمن کے ایک القاعدہ ممبر نے خوست میں موجود امریکی سی آئی اے کے دفتر میں خودکش حملہ کر کے تین اعلیٰ افسران سمیت آٹھ اہلکاروں کو ہلاک کر کے پاکستان کو ایک اور مشکل صورتحال سے دوچار کر دیا کیونکہ سی آئی اے کی تاریخ میں 1983ء کو بیروت میں موجود امریکی سفارتخانے پر حملے کے بعد یہ دوسرا بڑا حملہ تھا اور اس حملے کے بعد امریکہ نے پاکستان پر حقانی گروپ کے خلاف سخت کارروائی کرنے کا دباؤ بے حد بڑھا دیا۔

امریکہ نے جنوری اور فروری کے دو ماہ کے دوران وزیرستان کی دونوں ایجنسیوں میں تقریباً 35 ڈرون حملے کیے ان حملوں کے نتیجے میں حقانی نیٹ ورک کے ٹھکانوں کو بار بار نشانہ بنایا گیا جبکہ ایسے ہی ایک حملے کے دوران ٹی ٹی پی کے امیر حکیم اللہ محسود کو 20 جنوری کو ہلاک کیا گیا۔ 18 جنوری کو وزیرستان میں کیے گئے ایک حملے کے نتیجے میں فلپائن کی ایک جہادی تنظیم ابوسیاف گروپ کے لیڈر عبدالباسط عثمانی کو نشانہ بنایا گیا جبکہ 16 فروری کے ایک ڈرون حملے کے دوران تین غیر ملکیوں سمیت جلال الدین حقانی کے ایک بیٹے کو بھی مارا گیا۔ انہی دنوں سنگاپور کی ایک معتبر تھنک ٹینک نے سو کے لگ بھگ ان جہادی کمانڈروں کی ایک

فہرست جاری کر دی جو کہ 2004ء سے لے کر اب تک پاکستان کے قبائلی علاقوں میں کیے گئے ڈرون حملوں کے دوران ہلاک کیے جا چکے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں اکثریت عرب ممالک کے کمانڈروں کی تھی اور ان ممالک میں سعودی عرب، سوڈان، یمن، کویت، عراق، فلسطین، لبنان، مصر اور قطر سرفہرست تھے۔ مراکش اور ترکی جیسے ممالک کے کمانڈروں کے نام بھی فہرست میں شامل تھے۔ ان ہلاکتوں کے بعد دنیا کی جانب سے اس دعوے کو ایک طرح سے سند مل گئی کہ پاکستان کے قبائلی علاقے واقعتاً غیرملکی جنگجوؤں کے ٹھکانے ہیں۔

11 فروری کو امریکی نائب صدر جو بائیڈن نے واشنگٹن میں کہا کہ پاکستان میں سیکورٹی کی حالت عراق، افغانستان اور ایران سے زیادہ خراب اور خطرناک ہے اور امریکہ اس صورتحال سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔

2010ء کے ابتدائی 50 دن کے دوران انتہا پسندوں نے پشاور، بنوں، کراچی، دیر، لکی مروت، سوات، ڈی جی خان اور کئی دوسرے علاقوں میں حملے اور دھماکے کر کے 45 سیکورٹی اہلکاروں اور متعدد اعلیٰ افسران سمیت 310 سے زائد لوگوں کو شہید کر کے ثابت کیا کہ فوجی کارروائیوں کی کامیابی کے دعوؤں کے باوجود دہشت گرد نہ صرف یہ کہ موجود ہیں بلکہ وہ جب چاہیں حملہ کر کے بے شمار لوگوں کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔

10 فروری کو انتہا پسندوں نے خیبر ایجنسی میں خاصہ دار فورس کی گاڑی پر خودکش حملہ کر کے 18 افراد کو موت کی نیند سلا دیا جبکہ اسی روز وادی تیراہ میں دو مختلف کارروائیوں کے دوران بریگیڈیئر حسین عباس سمیت متعدد افسران اور اہلکاروں کو بھی شہید کر دیا گیا۔ چند ہی دنوں کے وقفے کے بعد باڑہ خیبر ایجنسی میں ایک اور خودکش حملے کے نتیجہ میں درجنوں افراد کو مارا گیا۔ ان کارروائیوں سے ثابت ہوا کہ انتہا پسند قوتیں نہ صرف یہ کہ موجود ہیں بلکہ ان کی موجودگی پاکستان کے کسی بھی علاقے میں عملی کارروائیوں کی بھرپور قوت اور صلاحیت سے بھی مالا مال ہے۔ پاکستان عملاً اس عرصہ کے دوران شمالی وزیرستان میں کسی بڑی کارروائی سے گریز کرتا رہا حالانکہ ڈرون حملوں کے دوران اہم کمانڈروں کی ہلاکتیں شمالی وزیرستان ہی میں رپورٹ ہوتی رہیں۔ اس پالیسی سے عالمی برادری نے یہ تاثر لیا کہ پاکستان گڈ طالبان

کو نہ صرف یہ کہ سہولتیں فراہم کر رہا ہے بلکہ یہ ملک غیر ملکی جنگجوؤں کے خلاف کارروائی سے بھی گریزاں ہے۔ امریکہ نے ردِ عمل کے طور پر شمالی وزیرستان پر ڈرون حملوں کی تعداد بڑھانی شروع کر دی اور اس کا اندازہ محض اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 2 جنوری سے لے کر 9 جنوری تک کے ایک ہفتے کے دوران سات ڈرون حملے کیے گئے۔ ان حملوں کے دوران حقانی نیٹ ورک کے ٹھکانوں کو بغور خاص نشانہ بنایا جاتا رہا۔ امریکہ نے عین اسی عرصے میں 12 فروری کو افغانستان کے دو اہم صوبوں ہلمند اور قندھار میں ''آپریشن مشترک'' کے نام سے کارروائی کا آغاز کیا تو واضح ہو گیا کہ امریکہ اور اُس کے اتحادی فی الحال افغانستان سے نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے اور وہ طالبان کو انتہائی کمزور کر کے مفاہمت کی میز پر لانے کے آپشن کے علاوہ ان کو شکست دینے کی بھرپور کوششوں کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔

یہ تاثر بہت عام ہونے لگا کہ امریکہ طالبان کی مزاحمت کے باوجود یہ جنگ جیتنے کا ارادہ کیے بیٹھا ہے اور وہ سپر پاور کی اپنی سٹیٹس کو تباہ کرنے کی بجائے افغانستان ہی کو تباہ کرنے کے آپشن کو ترجیح دینا چاہے گا۔ 2010ء کے ابتدائی دو ماہ کے دوران ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان کے 20 شہروں اور علاقوں میں فورسز اور عوام کے خلاف حملے کیے گئے۔ ایسے ہی ایک حملہ کے نتیجے میں بنوں کو 11 فروری کے روز نشانہ بنایا گیا جس کے باعث 10 پولیس اہلکاروں سمیت 18 افراد کو شہید کیا گیا۔ ایک اور حملے کے دوران ڈی پی او، اقبال مروت، بنوں کو شدید زخمی کر دیا گیا اور وہ کئی روز زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہو گئے۔

مجموعی طور پر یہ عرصہ افغانستان کے مقابلے میں پاکستانی ریاست اور عوام کے لیے زیادہ تباہ کن ثابت ہوا۔ پاک فوج کے سربراہ اشفاق پرویز کیانی نے 2 فروری کو آرمی ہاؤس میں صحافیوں کو خود بتایا کہ حملہ آوروں نے افغانستان کے مقابلے میں پاکستان کو زیادہ نقصان پہنچایا ہے ان کا کہنا تھا کہ دہشت گردوں نے 2226 افسران اور جوانوں کو شہید کرنے کے علاوہ انٹیلی جنس اداروں کے تہتر (73) افراد کو نشانہ بنایا جبکہ اس کے برعکس اس تمام عرصہ کے دوران افغانستان میں ایساف اور افغان سیکورٹی اداروں کے پندرہ سو (1500) اور انٹیلی جنس اداروں کے محض 11 اہلکاروں کو مارا گیا۔

انتہا پسندوں نے فروری کے آخری 10 روز کے دوران سوات میں فورسز کی

کانوائے پر خودکش حملہ کرنے کے علاوہ پولیس کی ٹارگٹ کلنگ کے نتیجے میں 20 سے زائد افراد کو شہید کر کے پیغام دیا کہ وہ اب بھی سوات میں موجود ہیں۔ ایسے ہی دو حملوں میں ہزارہ ڈویژن کے مانسہرہ اور بالاکوٹ کے علاقوں میں خودکش حملے کر کے متعدد پولیس اہلکاروں کو شہید کیا گیا۔ ان حملوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ دہشت گرد چمن اور طورخم کی سرحدوں پر امریکی سپلائی لائن کو ٹارگٹ بنانے کا تجربہ اب شاہراہ ریشم پر آزمانے کا پلان بنا چکے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلا کہ شاہراہ ریشم کے ملحقہ علاقوں کالاڈھاکہ، بالاکوٹ، بشام اور مانسہرہ میں حملہ آوروں کی ایک بڑی تعداد جمع ہوگئی ہے اور ان میں چیچن، فلپائن اور وسط ایشیا کے جنگجو بھی شامل ہیں۔ بیت اللہ محسود، حکیم اللہ اور کئی دوسرے کمانڈروں کی ہلاکت اور متعدد کی گرفتاریوں کے باوجود طالبان یا ان کے غیرملکی اتحادیوں کی مسلسل کارروائیوں سے جو نتیجہ اخذ کیا گیا وہ یہ تھا کہ مزاحمت کار پوری قوت اور حکمت عملی کے ذریعے نہ صرف میدان میں موجود ہیں بلکہ ان کی صلاحیت میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ بعض حلقوں کی جانب سے یہ بھی کہا گیا کہ القاعدہ کے متعدد ٹاپ کمانڈرز ٹی ٹی پی کے معاملات چلانے پاکستان میں خود بیٹھے ہیں اور وہ پاکستان کو معاف کرنے یا رعایت دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ اس عرصے کے دوران دوسرے علاقے تو ایک طرف پشاور جیسے مرکزی شہر کی سیکورٹی کی یہ حالت رہی کہ نیم فوجی دستوں اور پولیس نے 25 فروری کو اس شہر کے مضافات میں کارروائیاں کر کے 50 کے لگ بھگ دہشت گردوں کو مار ڈالا۔ فروری کے آخری دنوں میں نہ صرف یہ کہ پشاور پر راکٹ پھینکے گئے بلکہ نیٹو کی سپلائی لائن کو ایک بار پھر متعدد بار نشانہ بنایا گیا اس دوران 30 افراد گرفتار بھی کیے گئے۔ عالمی دباؤ کے باعث پاکستان کی پالیسی میں فروری کے مہینے میں بعض اہم تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔ پاکستانی انٹیلی جنس اداروں نے سی آئی اے کے ساتھ مشترکہ کارروائیاں کر کے متعدد افغان کمانڈروں اور شیڈو گورنرز سمیت ایک درجن کے قریب افراد کو کوئٹہ، نوشہرہ، فیصل آباد اور کراچی جیسے شہروں سے گرفتار کر لیا۔ گرفتار شدگان میں افغانستان کے طالبان امیر ملا عمر کے نائب اور افغانستان کے سابق وزیر دفاع عبدالغنی برادر اخوند بھی شامل تھے۔ وہ طالبان کے عسکری اُمور کے انچارج رہے ہیں اور ہلمند آپریشن کے بعد پناہ کی تلاش میں کوئٹہ اور وہاں سے کراچی جا کر رہائش پذیر ہو گئے تھے۔

امریکی حکام اور ذرائع ابلاغ نے ان کی گرفتاری سے قبل دعوے کیے تھے کہ پاکستان کے دو بڑے شہر کوئٹہ اور کراچی طالبان خصوصاً کوئٹہ شوریٰ کے کمانڈروں کے مرکز بن گئے ہیں۔ جن دوسرے لوگوں کو گرفتار کیا گیا ان میں افغان طالبان کے چار کمانڈروں کے علاوہ تین شیڈو گورنر بھی شامل تھے۔

معتبر امریکی اخبار نیویارک ٹائمز نے 25 فروری کی اپنی اشاعت میں لکھا کہ سی آئی اے دہشت گردی کے خلاف جنگ پاکستان لے گئی ہے۔ اخبار نے لکھا کہ سی آئی اے اور آئی ایس آئی طالبان کے خلاف متحد ہوگئی ہیں۔ لکھا گیا کہ سی آئی القاعدہ اور طالبان کے خلاف جاری امریکی جنگ کو پاک افغان سرحدی پہاڑی علاقوں سے پشاور اور کوئٹہ کے شہروں تک لے گئی ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ پاکستان ایک پالیسی کے تحت طالبان کو محض اتنا کمزور کرنا چاہتا ہے کہ وہ مذاکرات کی میز پر آجائیں اور افغانستان میں پاکستان کے مفادات کے تحفظ میں مدد فراہم کریں۔ پاکستان اس عرصہ کے دوران جہاں مسلسل امریکی دباؤ کا شکار بنا رہا وہاں افغانستان، ایران اور چین کے ساتھ اس کی سرحدوں پر دہشت گردوں کی سرگرمیاں بھی اس کے لیے پریشانی کی وجہ بنتی رہی۔ 23 فروری کو جنداللہ نامی تنظیم کے سربراہ عبدالمالک ریگی کے ایک ایرانی علاقے میں گرفتار کیا گیا۔ ان پر ایرانی صوبے سیستان میں چند ماہ قبل کیے گئے ایک خودکش حملے کا الزام تھا اس حملے میں 40 افراد مارے گئے تھے۔ ایرانی حکام نے دعویٰ کیا کہ موصوف اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک پاکستانی جہاز کے ذریعے سعودی عرب جا رہے تھے کہ جہاز کو اُتارا گیا اور اس کی گرفتاری عمل میں لائی گئی۔ بعض اطلاعات کے مطابق پاکستان کے ایک سرحدی علاقے سے گرفتار کیا گیا تھا۔

پاکستان کے ہاتھوں افغان طالبان کمانڈروں کی گرفتاری کے عمل کو امریکی دباؤ کا نتیجہ قرار دیا گیا تاہم اعلیٰ امریکی حکام ڈومور کے مطالبے کے ساتھ اب کے بار پاکستانی کردار کی تعریف بھی کرتے پائے گئے۔ اس عرصے میں امریکی صدر اور وزیر خارجہ سمیت برطانوی حکمران ایک مسلسل تکرار کے ذریعے پاکستان کو خطرناک ملک اور جنگجوؤں کا ٹھکانہ ثابت کرنے پر تلے نظر آئے۔ امریکی صدر باراک اوبامہ نے 10 جنوری اور اُس کے بعد 12 فروری کو اپنے بیانات میں کہا کہ پاکستان کے قبائلی علاقے القاعدہ اور اس کے اتحادیوں

کی سرگرمیوں کا مرکز بنے ہوئے ہیں اور یہ کہ پاکستان کو ان عناصر کے خلاف سخت اور فیصلہ کن کارروائی کرنی ہو گی جو کہ امریکہ اور یورپ پر حملوں کی نئی صف بندی کر رہیں ہیں۔

پاکستان کی مقتدر قوتیں بدترین جانی اور مالی نقصان اٹھانے کے باوجود افغان طالبان اور بعض پاکستانی گروپوں کے معاملے پر متضاد پالیسیوں سے دوچار نظر آئیں۔ اس ابہام کا جواز یہ فراہم کیا جاتا رہا کہ پاکستانی خطے کے ایک اہم ملک کے طور پر افغانستان میں بڑھتی ہوئی بھارتی اور امریکی اثر رسوخ پر خاموش نہیں رہ سکتا۔ پاکستان سمجھتا رہا کہ اگر طالبان کو ختم کیا گیا تو اس کے لیے افغانستان میں اپنے حامیوں کا آپشن اور امکان ہی ختم ہو جائے گا۔ دوسری طرف امریکہ کی پالیسی کے بارے میں یہ تبدیلی محسوس کی جانے لگی کہ دنیا بھر کی اسلام پسند جہادی قوتوں کو پاکستان کے قبائلی علاقوں اور بعض شہروں میں اکٹھا کر کے نشانہ بنایا جانے کے علاوہ ان کی موجودگی کی آڑ میں پاکستان کو مسلسل دباؤ سے دوچار کرنے کا فارمولا اپنایا جائے۔ بنیادی طور پر افغانستان میں اپنے حامیوں کی خواہش ہی نے پاکستان کو اندرونی طور پر بدترین حالات سے دوچار کر دیا۔ آئی ایس پی آر نے 20 فروری کی اپنی ایک رپورٹ میں بتایا کہ گزشتہ چند برسوں نے دوران 8785 سیکورٹی اہلکاروں سمیت 21672 سویلین کو شہید کیا جا چکا ہے۔ صرف سال 2009ء کی شہادتوں کی تعداد دس ہزار (10000) بتائی گئی۔ یہ بھی کہا گیا کہ اس عرصہ کے دوران 17742 دہشت گرد مارے یا گرفتار کیے جا چکے ہیں۔ پاکستان انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز (PIPS) کی ایک رپورٹ میں کہا گیا کہ سال 2009ء کے دوران 87 خودکش حملوں سمیت لاتعداد کارروائیوں کے نتیجے میں 12632 افراد شہید ہوئے۔ رپورٹ میں نشاندہی کی گئی کہ اس عرصہ کے دوران جنوبی پنجاب سے تعلق رکھنے والی انتہاپسند تنظیمیں اپنی کارروائیوں کے باعث چھائی رہیں اور پچاس فیصد سے زائد کارروائیوں میں یہی لوگ ملوث پائے گئے۔ ان رپورٹس سے یہ بات ایک بار پھر درست ثابت ہوئی کہ افغانستان کے مقابلے میں پاکستان واقعتاً زیادہ تباہی کا شکار بنا رہا۔ سیکورٹی فورسز کے ہاتھوں افغانی طالبان کی گرفتاریوں سے وقتاً فوقتاً ثابت ہوتا گیا کہ پاکستان کا کوئی علاقہ یا شہر انتہاپسندوں سے محفوظ یا دور نہیں ہے۔ پشاور، کوئٹہ اور کراچی افغان طالبان کمانڈروں کی محفوظ پناہ گاہ ثابت ہوئے تو قبائلی علاقے القاعدہ اور دوسری غیر

ملکی تنظیموں کے مراکز کے طور پر شہرت پا گئے۔ مولوی عبدالسلام ابو وقاص، عبدالغنی برادر، ابوموسیٰ اور بعض دوسروں کی گرفتاری سے ثابت ہوا کہ کراچی میں بھی یہ لوگ بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ایسی ہی ایک کارروائی کے دوران 27 فروری کی شب کو کراچی کے علاقے سعید آباد میں ملا عمر کے قریبی ساتھی ملا طیب پوپلزئی اور حکیم اللہ محسود کے دست بدست حکیم الدین محسود کو گرفتار کیا گیا۔ ملاکنڈ ڈویژن کے آپریشن کے بعد بعض حلقوں کی جانب سے الزام لگائے جانے لگا کہ فورسز نے محض ان پیادوں کو نشانہ بنایا جو کہ حال میں فضل اللہ کے ساتھ ملے ہوئے تھے جبکہ ان کٹر جنگجوؤں کو نظر انداز کیا جانے لگا جو کہ اپنے جہادی پس منظر کے باعث اصل تباہی کے ذمہ دار تھے۔ اس الزام میں یہ بات بھی شامل تھی کہ فورسز مولانا صوفی محمد کے ساتھیوں کے ساتھ بھی غیر ضروری رعایت برتنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں حالانکہ یہ لوگ مستقبل میں کسی بھی وقت ریاست کے لیے ایک بار پھر کوئی بڑی مشکل کھڑی کر سکتے ہیں۔ تعمیرِ نو کے سلسلے میں غیر ضروری تاخیر بھی فوجی کارروائیوں کے بعد حکومت سے عوام کی بددلی اور دوری کا ایک سبب بنتا گیا۔ 26 فروری کو ڈی آئی جی ملاکنڈ محمد ادریس خان نے انکشاف کیا کہ انہوں نے عسکریت پسندوں کا ساتھ دینے اور حکومت کے خلاف کارروائیوں میں ملوث 33 اہلکاروں کو حراست میں لے لیا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ خبر ایک خطرناک رجحان کی عکاسی کر رہی تھی۔ اسی روز سرحد پولیس کے لیے امریکہ سے تین ہزار بلٹ پروف جیکٹس اسلام آباد پہنچا دیں گئیں۔ مجموعی طور پر سرحد پولیس خصوصاً پشاور پولیس کی کارکردگی بہت بہتر پائی گئی۔ پشاور پریس کلب، ارباب روڈ اور کچہری جیسے مقامات پر پولیس سپاہیوں نے اس کے باوجود جانوں کا نذرانہ پیش کر کے دوسروں کی جانیں بچائیں کہ خودکش حملہ آوروں نے خود کو اُڑانے سے قبل سرحد پولیس کے 550 اہلکار شہید کیے جا چکے ہیں ان میں اعلیٰ افسران کی شہادتوں کی شرح پندرہ فیصد رہی ہے۔ غیر مقامی انتہا پسند گروپوں کی پاکستان میں موجودگی عالمی برادری کے علاوہ بعض پاکستانی حلقوں کے لیے بھی تشویش کی وجہ بنی رہی۔ مختلف تنظیموں اور پارٹیوں پر مشتمل امن تحریک نامی تنظیم نے فروری کو اپنے ایک اعلامیے میں دعویٰ کیا کہ ان کی مصدقہ اطلاعات کے مطابق فاٹا میں گیارہ ہزار (11000) وسطی ایشیائی، چھ ہزار (6000) عرب، نو ہزار (9000) پنجابی اور چار ہزار

(4000) پشتون جنگجو موجود ہیں۔ اعلامیہ میں القاعدہ کو اس کے عالمی جہادی فیصلے کے تناظر میں انتہاپسندی اور دہشت گردی کا مرکزی منبع قرار دے کر کہا گیا کہ پاکستان کی انٹیلی جنس ایجنسیاں اور بعض مذہبی، سیاسی قوتیں اب بھی سٹریٹیجک ڈیتھ پالیسی (Strategic Depith Policy) کے تحت عرب، پنجابی اور پشتون طالبان کو امریکہ، بھارت اور متعدد دوسرے ممالک کے خلاف استعمال کر کے نہ صرف ان کا دفاع کر رہی ہیں بلکہ یہ قوتیں عملاً ٹاپ جنگجو کمانڈروں کو محفوظ رکھنے کی پالیسی پر بھی عمل پیرا ہیں۔ اعلامیے میں یہ بھی کہا گیا کہ جو لوگ افغانستان کی موجودہ مزاحمت کا روس کے خلاف جہادیوں کی مزاحمت سے موازنہ کر رہے ہیں ان کو یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ روس کے خلاف لڑنے والی آٹھ جہادی تنظیموں میں حزب اسلامی کے بغیر تمام آج نہ صرف یہ کہ امریکہ کے اتحادی ہیں بلکہ وہ افغانستان کے موجودہ ریاستی سیٹ اپ کا بھی حصہ ہیں۔

ان اہم واقعات، اسباب، معلومات اور طرزِ عمل کا اگر مجموعی تجزیہ کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان نہ صرف یہ کہ اب بھی شدید خطرے، دباؤ اور تنقید کی زد میں ہے بلکہ مستقبل قریب میں اس ریاست کو مزید بحرانوں اور خطروں سے بھی دوچار ہونا پڑے گا۔ اگر ایک طرف فورسز کے آپریشن اپنی تکمیل اور نتائج کے انتظار کے مرحلے میں ہیں تو دوسری طرف حملہ آور قوتوں کے آپریشن بھی وقفے وقفے سے جاری ہیں۔ لگ یہی رہا ہے کہ فریقین کو ایک دوسرے کے خلاف ابھی بہت کچھ کرنا ہے اور امن کے قیام کا خواب ابھی اپنی تعبیر سے کوسوں دُور ہے۔ اس تمام پس منظر کو سامنے رکھ کر مبصرین خدشہ ظاہر کرنے لگے ہیں کہ آئندہ چند ماہ کے دوران نئی صف بندی کے ذریعے ایک بڑی جنگ کی ابتداء کرنے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔

✿ ✿ ✿ ✿

اہم حوالہ جات

1-	ماہانہ تجزیات	اسلام آباد
2-	ماہنامہ نوٹ بک	کراچی
3-	روزنامہ وحدت	پشاور
4-	'طالبان'	احمد رشید
5-	'عربزان افغان جہاد'	عامر رانا
6-	'طالبانائزیشن'	عقیل یوسفزئی
7-	'طالبانائزیشن'	عامر میر
8-	'پنجابی طالبان'	مجاہد حسین
9-	'افغانستان'	سلیم صافی
10-	'دی پٹھان'	اولف کیرو
11-	'باچا خان اور خدائی خدمتگار'	خان عبدالولی خان
12-	کیپٹل ٹاک شو	حامد میر
13-	'جرگہ' شو	سلیم صافی
14-	ڈچ پریس ایجنسی	ندیم سرور
15-	لائیو وِد طلعت شو	فخر کاکاخیل
16-	دی نیوز	شیریں مزاری
17-	'محاذ' شو	شوکت خٹک
18-	امن اور اسلام'	تحسین اللہ خان